مینڈا سائیں
تہمینہ درّانی
مصطفےٰ کھر، یہ وہ خود سوانح ہے جو تم کبھی نہ لکھو گے!

کتاب اور مصنفہ کے بارے میں

تہمینہ درانی

افغان پٹھان نژاد ہیں۔ ابھی وہ اٹھارہ سال کی تھیں کہ ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے تین سال بعد سحر انگیز شخصیت کے مالک مصطفیٰ کھر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ 1974ء کا ذکر ہے جب کھر نے وزیر اعلیٰ پنجاب، کے عہدے سے تازہ تازہ استعفیٰ دیا تھا۔ کھر نے تہمینہ کا دل موہ لینے کی ٹھان لی۔ آخر کار تہمینہ نے اپنے شوہر سے اور کھر نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یوں تہمینہ کو 1975ء میں کھر کی ساتویں بیوی کہلانے کا شرف حاصل ہوا۔ دونوں کی عمروں میں بیس برس کا فرق تھا۔

1977ء میں ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹا تو کھر اور تہمینہ از خود جلاوطن ہو کر لندن جا بسے۔ نو سال وطن سے دور رہ کر گزارے۔ تہمینہ کے لیے یہ مدت بے وطنی، محرومی، عدم تحفظ اور جسمانی اذیت سے عبارت تھی۔ کھر سے نباہ کرنا آسان نہ تھا۔ تہمینہ اپنی مرضی سے کچھ کرے، یہ کھر کی نظر میں ناقابل معافی جرم تھا۔ علاوہ ازیں، وہ تہمینہ کی چھوٹی بہن عدیلہ پر بھی ڈورے ڈالتا رہا۔

تہمینہ کا خیال تھا کہ 1984ء کے آخر میں پاکستان لوٹ آنے کے بعد کھر کے ساتھ زندگی گزارنا شاید پُر صعوبت ثابت نہ ہو۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا۔ کھر کو ضیاء الحق کے خلاف فوجی بغاوت کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ جتنی دیر وہ جیل میں رہا تہمینہ پورے خلوص سے اس کی رہائی کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ 1988ء میں جب انتخابات سے ذرا پہلے کھر کو رہا کر دیا گیا تو تہمینہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اپنے شبہات کو بھول کر اس مغالطے میں مبتلا ہو گئی کہ کھر واقعی کوئی داستانی ہیرو ہے جو میدان میں اترتے ہی بازی جیت لے گا۔ لیکن تین مہینے کے اندر ہی پتہ چل گیا کہ کھر ذرا نہیں بدلا اور اب بھی اس کی چھوٹی بہن پر دل وجان

سے فدا ہے۔

جب خوش فہمیوں کے قلعے ٹوٹ پھوٹ گئے تو ناخوش و ناراض تہمینہ نے طلاق کا تقاضا کیا۔ کھر نے کہا کہ وہ طلاق دینے کو تیار ہے بشرطیکہ بچے اس کی تحویل میں رہیں اور تہمینہ اپنی املاک کے حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ تہمینہ نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔

1990ء میں تہمینہ نے بڑی جرأت مندی سے اپنے جاگیردار شوہر کے ساتھ گزارے ہوئے برسوں کی داستان قلم بند کرنی شروع کی۔

یہ انتہائی بے باک اور بالکل نجی نوعیت کی روداد ہے جس میں زندگی اور معاشرے کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب میں ہمارے جاگیردار رہنماؤں کی ریاکاری اور بہیمیت سے پردہ اٹھتا ہے اور کسی رو رعایت کے بغیر بتایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کس طرح بیشتر عورتوں کو زندگی بھر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ سیاست دانوں، سازشوں اور تاریخی واقعات کا ذکر بھی بھرپور انداز میں موجود ہے۔

حقیقت میں یہ پوری کتاب مصطفےٰ کھر کے بارے میں ہے۔ مصنفہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کھر کے پبلک امیج اور اصل شخصیت میں کتنا خوف ناک تضاد ہے۔ جیسا کہ تہمینہ نے خود اسی کتاب میں ایک جگہ کہا ہے: "مصطفےٰ کھر، یہ وہ خود سوانح ہے جو تم کبھی نہ لکھو گے۔"

سرورق تہمینہ کی بنائی ہوئی ایک تصویر "سایوں میں" سے لیا گیا ہے۔

مینڈا سائیں
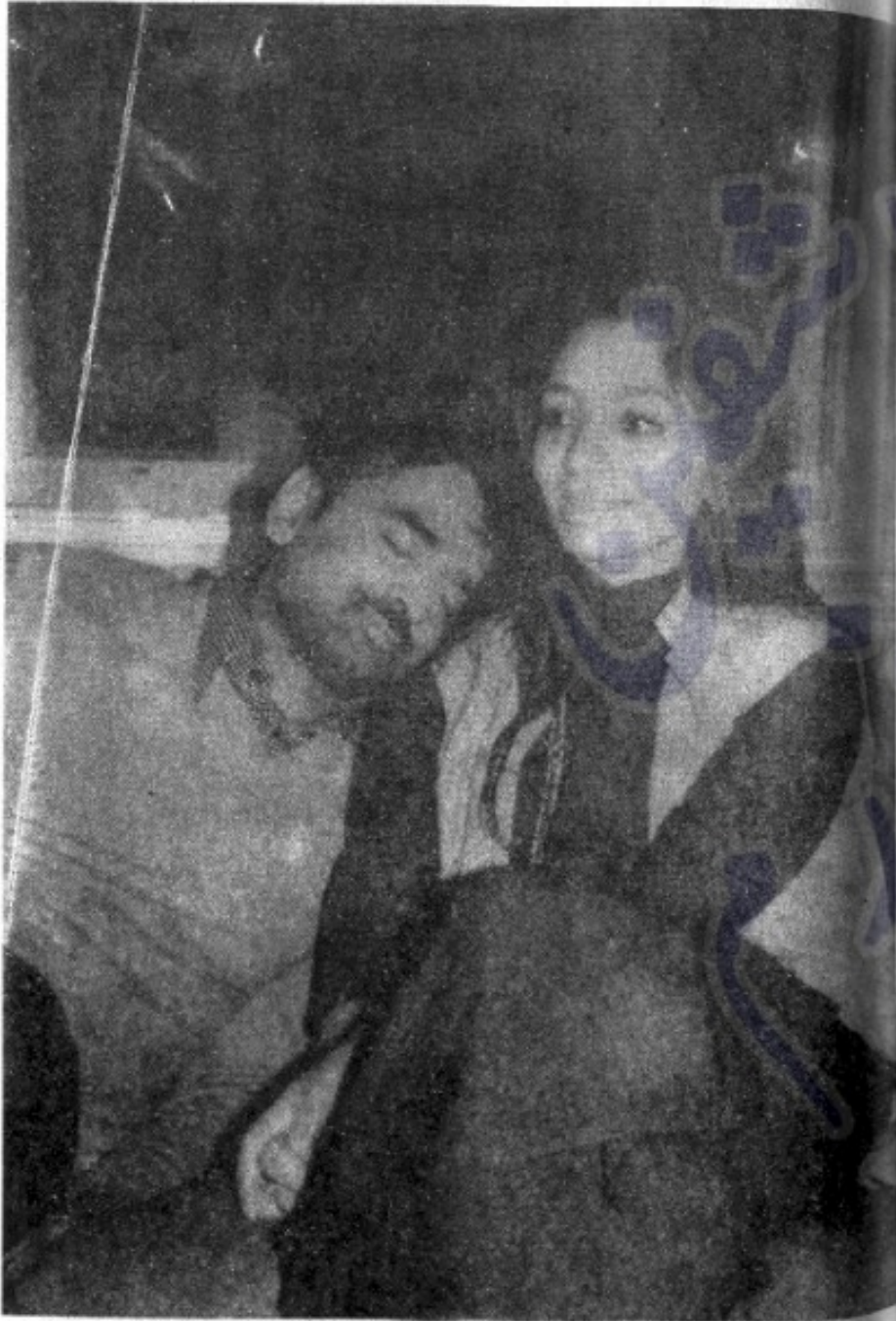
علی کی پیدائش سے پہلے، لندن میں
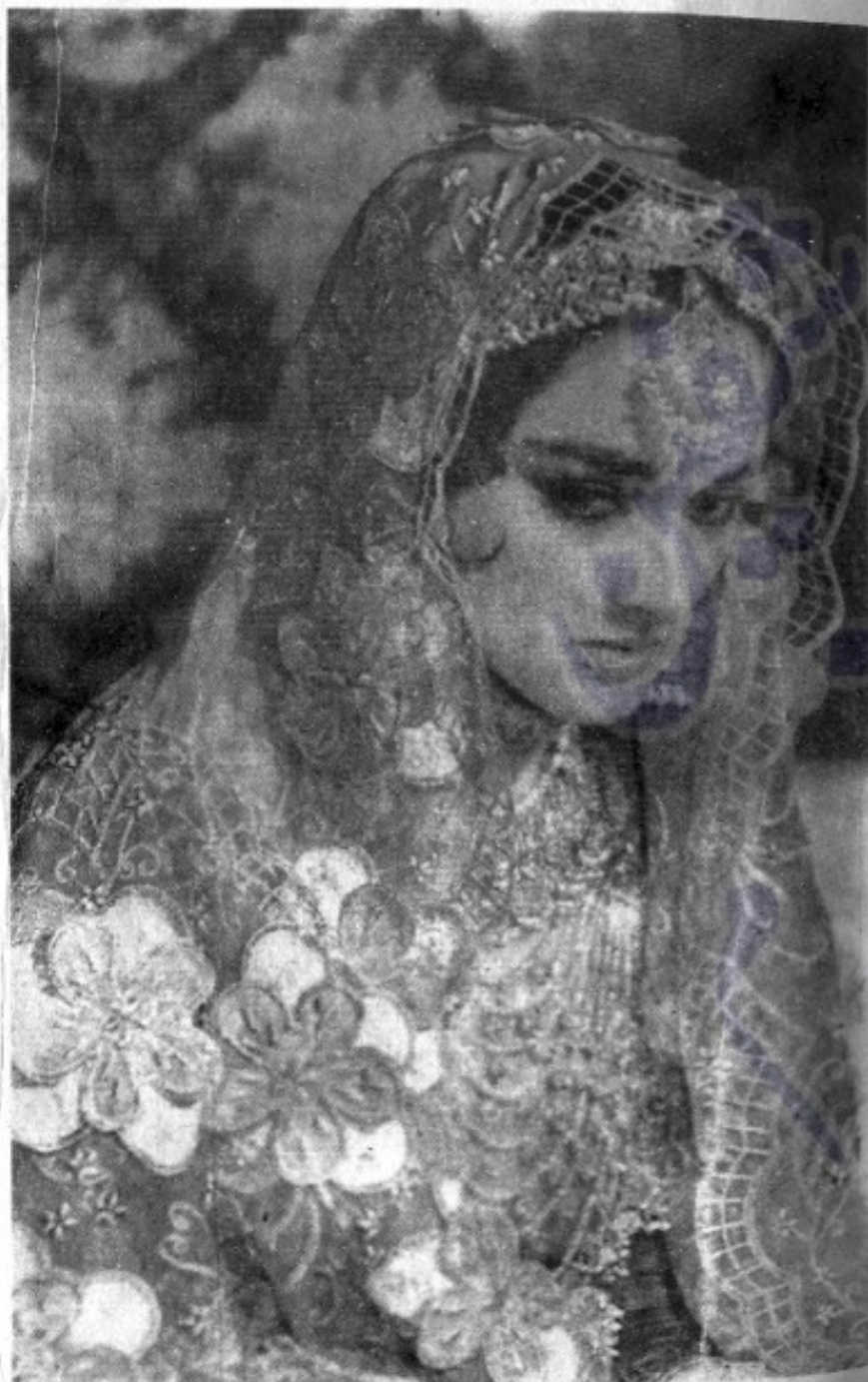
میری بہن عدیلہ، اسکی شادی رئیس مطلوب کے ساتھ 1982ء میں ہوئی
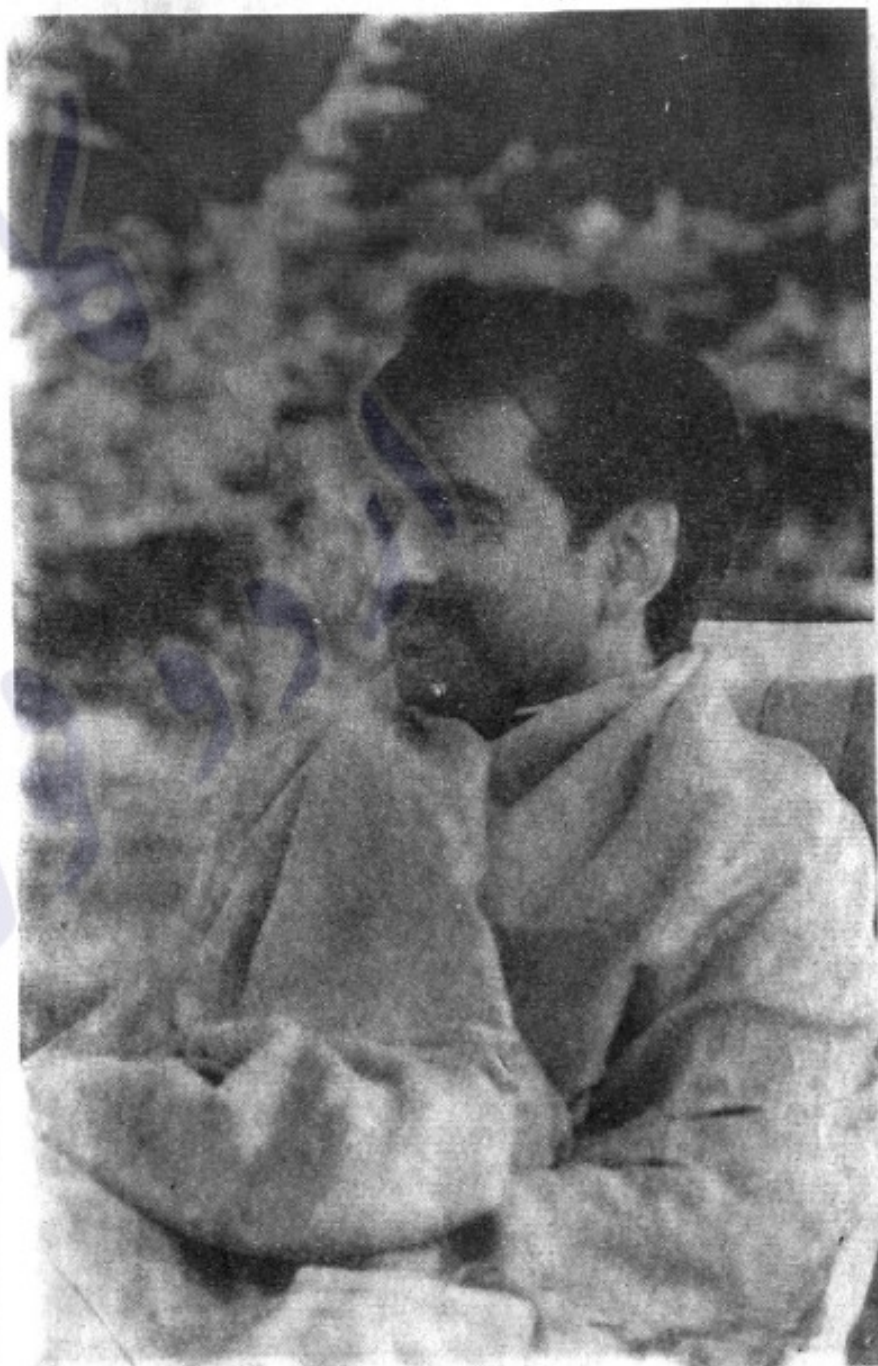
مصطفٰے کھر لندن میں 1983ء
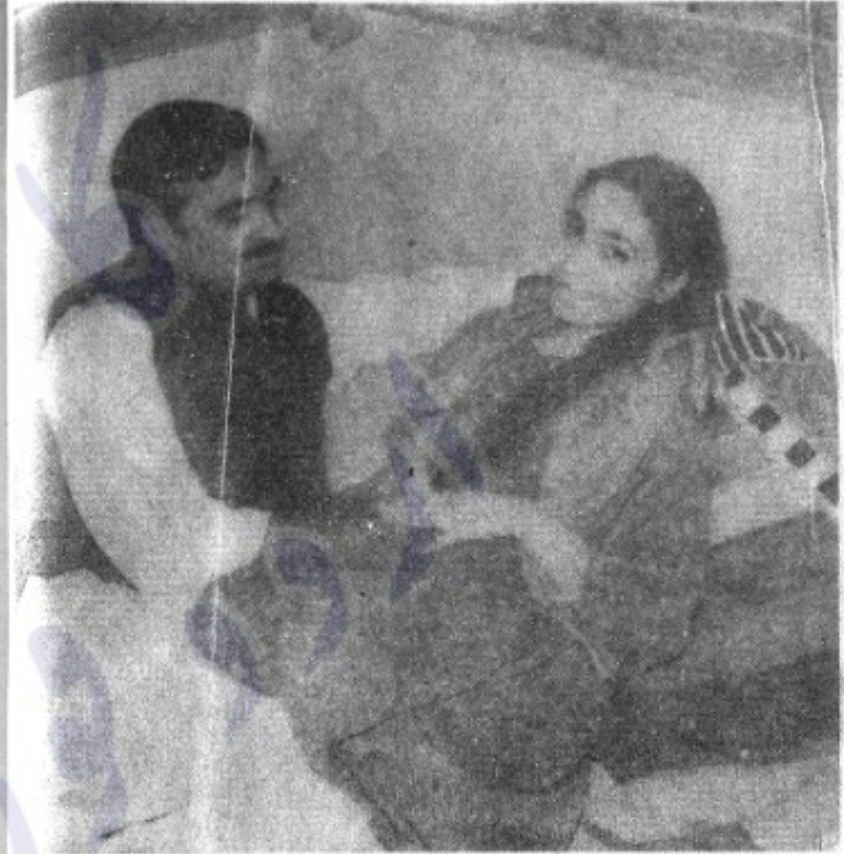
حمزہ کی پیدائش سے پہلے

مندرجات

بینڈاسائیں

تہمینہ درانی

VANGUARD

کاشف اردو فورم

حقوق اشاعت محفوظ

وین گارڈ بکس پرائویٹ لمیٹڈ
45 - شاہراہِ قائد اعظم لاہور

ناشر: وین گارڈ بکس پرائویٹ لمیٹڈ

طابع: آرٹ ٹریک پرنٹرز
10 A/42 لوئر مال لاہور- فون: 7245307

پیش لفظ

صدیوں سے عورتیں دستورِ زباں بندی پر عمل کرتی آئی ہیں- بظاہر صبر! ایسا وصف ہے جس کو اپنائے رکھنا صرف انھیں کے ذمے ہے- قانون ضمانت دیتا ہے کہ آزادیٔ اظہار سب کا حق ہے- اس کے باوجود روایات اور رسوم سازش کر کے عورتوں کو لب کشائی کا موقع نہیں دیتیں-

بہر کیف، رفتہ رفتہ عورتیں اس دم گھونٹنے والی خاموشی کا پردہ چاک کر رہی ہیں- معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس پاکبازانہ کردار کو مزید قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جو معاشرے نے ان کے سر مڑھ دیا ہے- چونکہ مردوں کی بہ نسبت وہ اپنا بچاؤ کم کر سکتی ہیں اور زیادہ حساس ہیں اس لیے ان پر لازم ہے کہ جو لکھنا ہے کھل کر لکھیں-

تہمینہ درانی کی طرف سے سچائی کا جو روپ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ شاید پڑھنے والے کو اول تا آخر قبول نہ ہو لیکن ہمارے سماجی ڈھانچے کے بعض بہیمانہ حقائق کی اس نے بڑی موثر انداز میں تصویر کھینچی ہے- ان حقائق کو جھٹلانا ناممکن ہوگا-

اس کتاب کو کلی طور پر صرف ایک عورت کی خود سوانح نہ سمجھا جائے- اس میں ان تکالیف اور احساسِ جرم کی گراں باریوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو جاگیردارانہ معاشرے میں لاکھوں عورتوں کے حصے میں آتی ہیں- جہاں یہ سچ ہے کہ بیشتر معاشروں میں عورتوں کا کردار ثانوی حیثیت رکھتا ہے وہاں یہ بھی یکساں طور پر درست ہے کہ جاگیردارانہ ظلم و ستم کے تحت ان کا نام کبھی عزت سے لیا ہی نہیں جاتا- اس لیے تہمینہ کو آواز بلند کرتے دیکھ کر دل کو سہارا ملتا ہے-

زیادہ بہتر انداز میں مَیں اس طرف اشارہ کرنا چاہوں گی کہ جب تہمینہ (موکل کی حیثیت میں) پہلی دفعہ مجھ سے ملی تھی تو اسے ان تمام دبدھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا- وہ ایک بہت بڑا فیصلہ کرنے چلی تھی اور اس کے جذبات میرے مشاہدے میں آنے والی ان سینکڑوں عورتوں کے جذبات سے مختلف نہ تھے جو اسی طرح کے حالات سے دوچار ہو چکی تھیں-

لیکن میں بتا سکتی تھی کہ وہ اس خود ساختہ زندان کے درودیوار توڑ کر نکل جانے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے۔ میں مخلصانہ طور پر امید کرتی ہوں کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی ہے۔

عاصمہ جہانگیر

انتساب

جب میں نے یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا تو میں کچھ زیادہ ہی آگاہ تھی کہ مجھے بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک ایسے مسلم معاشرے میں جس پر مردوں کا غلبہ ہو جس کی صاسیت کچل ڈالنے والی قدامت پسندی میں ڈوبی ہوئی ہو اپنی نجی زندگی سے پردہ اٹھانے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ لیکن میرے تیقنات اور ترجیحات نے زیادہ نجی قسم کے ملفوظات کے دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔

حکومت میں جاگیردارانہ طاقت کا زبانی کلامی اظہار اور نمائندگی ایسے مرد کرتے ہیں جنہوں نے خاص قسم کی تربیت اور ذہنیت پائی ہے۔ میرا سابق شوہر، غلام مصطفےٰ کھر، ان مردوں کی اس نسل کی علامت بنا ہوا ہے جس نے ملک کے مقدر کو اپنے چنگل میں دبوچ رکھا ہے۔ جاگیردارانہ اقدار کے نظام میں ایک ایسا نقص ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اسے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کوئی مناسب قدم اٹھانے سے پہلے اس نقص کی تشخیص ضروری ہے۔

یہ کتاب جس مواد پر مبنی ہے وہ صرف ایک کتب خانے میں دستیاب ہے۔ میں نے بار بار اس کتب خانے سے رجوع کیا ہے۔ میری مراد اپنے ذہن سے ہے۔ یہ روداد لے کر حاضر ہوئی ہوں تو پہلے مجھے، دل ہی دل میں، اپنی زندگی کا ایک ایک، فٹ نوٹ تک دوبارہ جینا پڑا۔ کتاب کی سچائی سے بالآخر ثابت ہو گا کہ میں اسے لکھنے میں حق بجانب تھی۔

میں اس کتاب کا انتساب کرتی ہوں:

اہل وطن کے نام جنہوں نے بار بار اپنے رہنماؤں پر بھروسہ کیا، ان کی حمایت کی۔۔۔۔

اور اس کے بدلے میں ان رہنماؤں نے ان بھوکے، ستم رسیدہ اور ناشاد و نامراد ہجوم در ہجوم عوام سے اپنے ذاتی مفادات کو آگے بڑھانے کا کام لیا۔

میں چاہتی ہوں کہ عوام جان لیں کہ زور خطابت کے پیچھے حقیقت کیا ہے۔ اس طرح وہ شاید ظاہری طمطراق کے پیچھے جھانک کر دیکھنا بھی سیکھ لیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ

کہیں بے خبری کے عالم میں ان کا واحد حق نہ لٹ جائے۔۔۔۔۔ ووٹ دینے کا حق۔

ملک غلام مصطفےٰ کھر کی سابق بیویوں کے نام، جنہوں نے چپ چاپ دکھ سہا اور رسوائی برداشت کی اور دیکھا کہ مصطفےٰ ہر بار صاف بچ نکلا۔ اس بار ان بیویوں میں سے ایک کہہ رہی ہے کہ اسے جواب اور حساب دینا پڑے گا۔

ملک غلام مصطفےٰ کھر کے نام۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ کتاب آئینے کا کام دے تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ وہ کس قماش کا مرد، شوہر، باپ، رہنما اور دوست ہے۔

یہ ایسی خود سوانح ہے جو وہ آپ کبھی نہ لکھے گا۔

اپنے پیارے بچوں کے نام، جنہیں ہمارے گھٹے ہوئے معاشرے میں کسی ایسے خاندان پروردہ ہونے والی سبھی ابتلاؤں کا سامنا کرنا ہو گا جس کا کوئی راز، راز نہ رہا ہو۔ یہ کتاب انہیں تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ اپنی طاقت اور جرأت کو مجتمع کر کے جاری رہنے والی روح خراش کشمکش سے دوچار ہوتے رہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ غلط کو مسترد اور صحیح پر صاد کرنا سیکھیں۔ اور اس نیک کام کا آغاز اپنے گھر سے کریں۔ میں امید کرتی ہوں اور دست بدعا ہوں کہ کاش ان کی اقدار کی اساس اسلامی اصولوں پر ہو اور انہیں مادر وطن سے اتنی محبت ہو دل میں مادر وطن کا اتنا احترام ہو کہ وہ سمجھوتے بازی کے ہر جواز کو رد کرنے کے قابل ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ میری بیٹیاں زبردستوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کے سامنے ڈٹ جانا سیکھ لیں گی اور میرے بیٹے کبھی کسی کمزور کو نہیں ستائیں گے۔

سب سے آخر میں، اپنی نانی اماں کے نام، جنہوں نے میری ساری زندگی اس طرح گزاری جیسے وہ انہیں کی زندگی ہو۔ اس کتاب کو ان سے بہتر طور پر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کی روح کو، وہ جہاں بھی ہو، پتہ چل جائے کہ میں سب کچھ جھیل گئی اور جان بچا لائی۔

کہ یہی ان کی خواہش تھی اور میرے حق میں انہوں نے یہی دعا کی تھی۔

مینڈا سائیں

اظہارِ تشکر

اس کتاب کو لکھنا آسان ثابت نہیں ہوا۔

چار افراد ایسے ہیں جن کے بغیر یہ کتاب طباعت کا مرحلہ طے نہ کر سکتی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس سلسلے میں کن خطرات کا سامنا ہے لیکن انھوں نے بڑی جرأت مندی سے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

ایک غیر معمولی مرد اور دو عورتوں نے میرا حوصلہ بڑھایا، میری مدد کی تاکہ میں اپنے ماضی کے روح خراش تجربوں کی یاد تازہ کر سکوں۔

پھر اس شخص کا کردار بھی کسی سے کم نہیں جس نے اسی طرح کی پابندیوں میں رہ کر مسودے کو ٹائپ کیا۔

میں ان کے نام بتانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔

میں ان سب کی مرہونِ منت ہوں۔

ت۔ د

مارچ 1991ء

باب - ۱

قائد

(1986ء - 1988ء)

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیزرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اتوار کے اتوار صبح ساڑھے چھ بجے کی پرواز سے لاہور سے اسلام آباد جاتے مجھے سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ لیکن آج کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں جوش سے سرشار تھی۔ میری چال سے اعتماد ٹپکتا تھا۔ آج اس جھنجھلاہٹ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا جو مجھے پہلے اس بنا پر محسوس ہوتی تھی کہ اب اس چیز کا ایکس رے مشین سے معائنہ کیا جا رہا ہے، اُس چیز پر مہر لگائی جا رہی ہے، جامہ تلاشی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی اور بورڈنگ کارڈوں کو بے دلی سے چاک کیا جا رہا ہے۔ اپنا مقصد حاصل کر لینے کے احساس نے میری جھنجھلاہٹ کو ہٹا کر پرے کر دیا تھا۔ میرے شوہر کو قیدخانے سے رہا کیا جانے والا تھا۔ زیادہ اہم بات یہ کہ میرا قائد آزاد ہونے والا تھا۔

ہوائی اڈے پر زمینی عملے نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ وہ صحیح معنی میں میری وجہ سے خوش تھا۔ طیارے پر تعینات عملے کے افراد مجھے مبارک باد دینے آئے اور جب میں آرام سے بیٹھ کر، سیٹ بیلٹ باندھنے کے بعد، جسم سیدھا تانے اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئی تو ایک مسافر نے میری طرف جھک کر کہا: "تہمینہ بی بی، آپ کے شوہر

یقیناً آپ پر فخر کرتے ہوں گے"۔ میں مروتاً مسکرا دی۔ مجھے احساس تھا کہ ہماری جدوجہد کی بس ابتدا ہی ہوئی ہے۔

میں کھڑکی سے باہر دُور فاصلوں پر نظر جمائے رہی۔ آسمان پر ایک جگہ ٹھہری ہوئی چھوٹی سی آوارہ بدلی پر جب سورج کی پہلی کرنوں کی پھوار پڑی تو یوں لگا جیسے وہ تمتما اٹھی ہو۔ میں خود بھی یہ محسوس کر رہی تھی کہ میرا جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اسلام آباد کا ہوائی اڈا مسرتوں میں نہایا ہوا تھا۔ جن چہروں پر میں، سالہاسال پر محیط جدوجہد کے دوران میں، پُرعزم متانت دیکھتی آئی تھی، وہ آج مسکراہٹوں سے سجے ہوئے تھے۔ وہ لوگ میری طرف بڑھے اور پاسِ ادب سے ایک خاص فاصلے پر آ کر رک گئے۔ ہم سب کی عادات و آداب پر اسلام کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ میں انہیں گلے لگانا چاہتی تھی۔ انہوں نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا تھا اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنے کی آرزومند تھی۔ لیکن وہ سب مرد تھے۔ اسلام ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ اپنے بھائی، باپ یا شوہر کے سوا کسی مرد سے لگاؤ کا اظہار کریں۔ اس سے پہلے کبھی الفاظ اتنے ناکافی اور لاحاصل معلوم نہ ہوئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو مجھے پتا چلا کہ انسانوں کو الفاظ کے جس ذخیرے پر عبور ہوتا ہے وہ کس قدر محدود ہے۔ میری کامیابی میں ان لوگوں کا کتنا زیادہ حصہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ روایت کی قدغنوں کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میری طرح ہی محسوس کر رہے ہوں گے۔

تقریباً کسی معجزے کی طرح ہجوم نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اب میں جانے پہچانے رستوں پر کاروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ ہم سُست رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کاروں کے ہارن بجائے جانے کا شور اور بلند ہونے والے نعرے وقفے وقفے سے ہمارے سفر میں خلل انداز تھے۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ ہم راولپنڈی مرکزی جیل کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔ فوجی آمر ضیا دنیا سے رخصت ہو چکا تھا لیکن ہوائی حادثے میں فوت ہونے سے پہلے اس نے جیل ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بھٹو کو پھانسی دے کر اس نے ایک شہید پیدا کر دیا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جیل بھی زیارت گاہ بن جائے۔

جب ہم آرمی ہیڈکوارٹرز کے سامنے سے گزرے اور میری نظر اس ٹینک پر پڑی جو اس کے دروازے کے باہر کھڑا رہتا ہے تو میں دل ہی دل میں مسکرائی۔ اس ٹینک نے مجھے خوفزدہ کیے رکھا تھا۔ وہ ہمارے ملک میں فوجی راج کی علامت تھا۔ آج وہ عجیب

انداز میں بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ عوام کی طاقت بندوق کی نادرشاہی پر غالب آ گئی تھی۔ مجھے اس بات سے بڑی بے رحمانہ لذت محسوس ہوئی کہ عوامی طاقت کے روبرو فوج کتنی غیر موثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے اپنا رشتہ ایسی طاقت سے جوڑ لیا تھا جو بہت آگے کی بات تھی۔

کاروں کا قافلہ مڑ کر اڈیالا روڈ جا پہنچا۔ وہی لمبی، بظاہر ختم نہ ہونے والی سڑک جو اڈیالا جیل کی طرف جاتی تھی۔ چلنا کہاں، ہم تو رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری رفتار کا تعین وہ لوگ کر رہے تھے جو ہزاروں کی تعداد میں پیادہ پا ہمراہ تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ جاڑوں کا موسم تھا کیونکہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اگلا گھنٹہ کار ہی میں گزارنا پڑے گا۔ کسی اور کو دیر سویر کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ ساری ہارن بازی اور دھکم پیل جمہوریت کی رت کا حصہ تھی۔ ایک طرح کی بڑبڑی مچی ہوئی تھی۔ میری کار میں جھانکنے والوں کی ناکیں ونڈ شیلڈ سے لگ کر چپٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ فتح کی علامت کے طور پر بار بار (V) کا نشان بنایا جا رہا تھا۔ لوگ جوش میں آ کر کار کے بونیٹ کو پیٹ رہے تھے۔ گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پامال اور پچھڑے، جنہیں صدیوں سے روندا جا رہا تھا، بالآخر سر اٹھا رہے ہوں۔

لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ کار کا شیشہ نیچے کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ ہجوم کا اظہارِ عقیدت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ میں سلام کرنے کے روایتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لاتی رہی۔ ہجوم نے ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیا۔ یہی وہ عوام الناس تھے جن کا ذکر میرے شوہر اور میں کرتے رہتے تھے۔ انہیں کی تقدیر کو نئی شکل دینا ہمارے ذمے تھا۔ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں تھی جب عوام الناس میرے لیے ایک مجرد اصطلاح تھے۔ ڈرائنگ روم میں ہونے والی سیاسی بحثوں میں ان کا ذکر آتا تھا۔ اب وہ حقیقت میں بدل گئے تھے۔ انھوں نے میرا تمام زاویۂ نظر بدل ڈالا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ بالآخر ہمارے تعلقات کچھ لو کچھ دو کی سطح پر استوار ہو گئے ہیں۔ یہ پہلے کا سا معاملہ نہ تھا جب وہ دینے والے تھے اور میں لینے والی۔ میں انہیں میں شامل ہو گئی تھی۔ عوام الناس موضوعِ گفتگو نہ رہے تھے اب ان کی اپنی حیثیت تھی۔ وہ معنی رکھتے تھے۔ ان کا ہم پر انحصار نہ تھا۔ ہم ان پر تکیہ کرتے تھے۔

امید کا یہ کارواں آخرکار منزلِ مقصود پر جا پہنچا۔ انسانوں کے اس جم غفیر کے سامنے جو ہر طرف سے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اڈیالا جیل نہایت ہی غیر محفوظ نظر آنے لگا، جیسے ٹھوکر لگتے ہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ جیل کی مہیب، بلند و بالا دیواریں، جنہیں دیکھ کر میرے دل میں ہمیشہ برے برے خیالات آیا کرتے تھے، اب ڈراؤنی معلوم نہ ہو رہی تھیں۔ جس

لے کا ہمیں انتظار تھا وہ آ پہنچا تھا۔ مصطفےٰ کھر کو جو پندرہ سال سے میرا شوہر تھا، ڈھائی برس قیدِ تنہائی میں گزارنے کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

نعرے اور بھی جوشیلے ہوتے گئے۔ ہجوم پر جنون طاری تھا۔ انھیں اپنا نجات دہندہ، کچلے ہوئے لوگوں کا زبردست حامی، پنجاب کا دلیر شیر، مصطفےٰ کھر نظر آ گیا تھا۔

ان ہزاروں افراد کے لیے، جو وہاں اسے آزاد فضا میں قدم رکھتے دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے، مصطفےٰ کی ذات امید کی علامت تھی۔ وہ ہم سب کا قائد تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ایک ایسے اخلاقی طور پر دیوالیہ معاشرے کو للکارا تھا جس میں ناانصافی، بدعنوانی، کمزور کا استحصال، ذلت آمیز غربت اور افلاس معمول بن چکا تھا۔ ہاں، اس کے خمیر میں عناصر کچھ اس طرح گوندھے گئے تھے کہ فطرت خود اعلان کر کے رہے گی کہ یہی صاحبِ وقت ہے۔ اس نے اپنے عوام کی خاطر دکھ جھیلا تھا۔ سالہاسال اس نے جلاوطنی کی شامِ غربت میں روشنی کو گل ہوتے دیکھا تھا۔ اسے زندان میں ڈالا گیا تھا۔ لیکن اس کا سر خم نہ ہوا تھا۔ وہ لڑتا جاتا تھا۔ اس کے پاس ہمارے تمام عوارض کا تریاق تھا۔ وہ سیاسی مسیحا تھا۔ ہم اس کے پیغام کے منتظر تھے۔ ہمارے لوگ، سیاسی طور پر حکومت جیسے اداروں کے وفادار نہیں۔ وہ ایک ذاتِ واحد کے وفادار تھے۔ کھر کی ذات سے وفا کرنے والے۔ لیکن اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی سیاق و سباق بھی ہونا چاہیے۔

میرا ذہن ایک بند گلی سے دوچار ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اب شدت سے جیل کے دوسرے قیدیوں کا خیال آیا۔ ہر بار جب میں اس جیل میں آتی تو مجھے لگتا جیسے میرا ست نکل گیا ہو۔ جذباتی طور پر جیسے میں لٹ جایا کرتی۔ مجھ میں قیدیوں کے لیے ایک عجیب سا ہمدردی کا احساس ابھر آیا تھا۔ ان کی آنکھیں مجھے خوابوں میں ستاتی رہتی تھیں۔ میں اس امید کو بھول نہیں سکتی تھی جو انھوں نے میرے شوہر سے وابستہ کر رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی جنگیں اس کی معرفت لڑی تھیں۔ آج جب ان کا قائد جیل سے باہر قدم رکھ رہا تھا تو وہ اچانک بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ میں نے ان ملے جلے جذبات کو لگام دینی چاہی۔ آخر ہم سبھی ایک بہت بڑے قید خانے میں بند تھے۔ مصطفےٰ کو ہمیں بھی رہائی دلانی تھی۔ قید خانہ تو قوم کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ مصطفےٰ نے قید و بند کے دوران میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو کسی جمے جمائے نظام کو جھنجھوڑ ڈالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ مجھے جیل میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدعنوانی کے بارے میں بتاتا: "یہاں ایک بلیک مارکیٹ چل رہا ہے۔ قیمت دے کر ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ جیل کی انتظامیہ مافیا کے مانند ہے۔ سپرنٹنڈنٹ دادا ہے۔ جو کچھ یہاں ہوتا رہتا ہے سب میرے علم میں ہے۔ میں اس برائی کو جڑ سے

اکھاڑ پھینکوں گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اپنی کوٹھری میں تنہا بیٹھے بیٹھے اس نے بدعنوانی کے اس پیچ در پیچ جال کو بھانپ لیا تھا جو جیل خانے میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات تو مصطفےٰ کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ وہ جزئیات جان لینے کی ایک پراسرار سمجھ کا مالک تھا۔ وہ نہ دیکھتے ہوئے بھی سب کچھ دیکھتا رہتا، چشمِ تصور میں ہر چیز کی تصویر بناتا جاتا۔ اس نے ہر قیدی کا اتا پتا معلوم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ان کے حالات سدھارنے کے لیے کاروائی شروع کی۔ وہ اس کے خاندان کے افراد کی طرح تھے۔ وہ ان کا جاگیردار مائی باپ تھا جو انھیں انصاف بھی دلا رہا تھا اور پورے اعتماد کے ساتھ ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے پیش پیش بھی تھا۔

ہر بار جب میں اس سے ملنے جاتی تو وہ گزرے ہوئے ہفتے کے دوران میں پیش آنے والے واقعات سنا کر مجھے بہلاتا۔ ان میں سے ہر چھوٹے سے چھوٹا سانحہ بھی میری روح پر نقش ہے۔ "یہاں کا سپرنٹنڈنٹ، مفتی، سب قیدیوں سے بھتا وصول کرتا ہے جو بنیادی طور پر جگا ٹیکس ہے۔ یہ رقوم اسے ہفتہ وار یا ماہوار ادا کی جاتی ہیں۔ جو قیدی یہ زبردستی کا ٹیکس نہیں دینا چاہتا یا نہیں دے سکتا اسے سزا ملتی ہے۔ اسے یا تو بے دردی سے مارا پیٹا جاتا ہے یا بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔" عذاب دینے کے تمام طریقے اس کے علم میں تھے۔ بعض اتنے بھیانک ہیں کہ ان کا ذکر نہیں ہو سکتا۔ "بہت سے قیدیوں کو کھانے پینے سے محروم کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مفتی کو رقم ادا کرنے کے قابل نہیں۔ پورے پورے خاندان یہ منہ مانگی رقم ادا کرنے پر مجبور ہیں اور قرضے کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایسا رنگ اتر آتا جو کھڑکی کی سلاخوں سے نظر آنے والے خوں رنگ افق سے مختلف نہ ہوتا۔ "تہمینہ، یہ مفتی جو ہے، یہ سالا دوسروں کا خون چوستا رہتا ہے۔ یہ انسانوں کے دکھ درد سے اپنی جیب گرم کرتا ہے۔ لوگوں کو تکلیف پہنچا کر پھل پھول رہا ہے۔ دنیا کے ان مصیبت کے ماروں سے ہر مہینے پچاس ہزار سے اسی ہزار روپے تک اینٹھ لیتا ہے۔ اس رقم کا کچھ حصہ مالِ غنیمت کی طرح ان ماتحتوں میں بانٹ دیا جاتا ہے جو اس کے نمائندے ہیں۔ یہ ایسا قید خانہ نہیں جس کی اصلاح ہو سکے۔ یہ خرکار کیمپ ہے جہاں روز روز کی ناانصافیاں مجرموں کو جنم دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ جب تک اس غیر انسانی نظام کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دی جائے گی میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

مجھے اس سے کم غصہ نہیں آتا میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی، بال بچوں والی قیدی

عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ انہیں مارا پیٹا جاتا تھا۔ انصاف میں نفرت آمیز تاخیر پہ تاخیر ہوتی رہتی تھی۔ بے گناہوں کو جھوٹے الزامات لگا کر قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ من گھڑت شہادتوں کے مارے ہوئے تھے۔ اگر دنیا میں کہیں پہ دوزخ تھی تو وہ یہیں تھی۔ اس بے بسی پر میں سہی جاتی تھی۔ میں بے قرار تھی کہ مصطفٰے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ "ہمیں اقتدار میں آنے دو۔ میں تمہیں جیلوں کا وزیر بنا دوں گا۔" اس نے مذاق میں کہا "تمہیں اپنا قول نبھانا ہوگا۔" میں نے کہا۔ میں اس وقت بھی ذہن میں اصلاح کے منصوبوں کو شکل دے رہی تھی۔

ایک روز ہماری ملاقات میں ایک چیخ سے خلل پڑا۔ چیخ سن کر یوں لگا جیسے کس کے جسم سے اس کی روح کو نوچ کھسوٹ کر کھینچا جا رہا ہو۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مصطفٰے کی آنکھیں غصے سے سلگ اٹھیں۔ اس نے خاصی دیر انتظار کیا۔ پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور ڈگ بھرتا ہوا مقفل دروازے تک گیا۔ اس نے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا اور حکم دیا "کھولو" سہمے ہوئے پہرے دار نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ مصطفٰے نے اس آدمی کو کسی کیڑے کی طرح ایک طرف دھکیلا اور غضب آلود شیر کی مانند ادھر لپکا جدھر سے چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔ بیچارہ پہرے دار دبی آواز میں کچھ کہتا اور ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلتا رہا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہی تھی جس پر ایسا لگتا تھا کہ بھوت سوار ہے۔

ہم ایک بڑے احاطے میں جا نکلے جہاں قیدی دو دو کی ٹولیوں میں اکڑوں بیٹھے تھے۔ وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے دکھائے جانے والے ایک دل خراش منظر کے خاموش تماشائی تھے۔ قیدیوں کو سبق سکھایا جا رہا تھا تاکہ آئندہ انہیں حکم عدولی کی جرات نہ ہو۔ ان کا ایک ساتھی زمین پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر پھیلے ہوئے تھے۔ پولیس والے اسے لاتیں مار رہے تھے اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ اب بھی تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا جس کا اظہار خوف ناک چیخوں کی صورت میں ہو رہا تھا۔ پہرے داروں نے اس کی ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ کیسی روح فرسا اذیت سے گزر رہا ہوگا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی پتلیاں اتنی اوپر چڑھ چکی تھیں کہ نظر نہ آتی تھیں۔ اس کے بعد ایک دہشت ناک، موت جیسی، خاموشی چھا گئی۔

اب مصطفٰے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں دھمکی تھی۔ اس نے عذاب دینے والے کو کالر سے دبوچ لیا۔ میں نے ایک زور دار تھپڑ کی آواز سنی۔

پھر ایک اور تھپڑ پڑا۔ ڈپٹی کے اوسان خطا ہو گئے لیکن اس میں ہمت نہ تھی کہ پلٹ کر کچھ کہتا یا کرتا۔ مصطفٰے کھرا لاکھ قیدی سہی، ایسا آدمی تھا جس کا لحاظ کرنے پر ڈپٹی مجبور تھا۔ مصطفٰے نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا: "اگر میں نے دوبارہ کوئی چیخ سنی تو میں مار مار کر تمہارا کچومر نکال دوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اگر قیدیوں میں حوصلہ ہوتا تو وہ واہ واہ کر اٹھتے۔ ان کی نگاہوں سے تحسین کی کیفیت چھلک رہی تھی۔ مصطفٰے نے یہ دکھا دیا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ وہ ان کا نگہبان ہے۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مصطفٰے کے پاس کوٹھری میں آیا۔ تین پولیس والے اس کے ہمراہ تھے۔ وہ ابھی تک حواس باختہ تھا۔ "سر (مصطفٰے کو ہمیشہ سر ہی کہا جاتا تھا)، آپ کو اتنے سارے قیدیوں کے سامنے مجھے تھپڑ نہیں مارنے چاہئیں تھے۔ اب وہ کبھی میری عزت نہیں کریں گے۔" "تم ان کی عزت کے مستحق ہی کب ہو۔ تم خوف اور تشدد کے بل بوتے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں ملازمت سے نکلوا دوں گا۔ تمہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ حرامزادے، ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔ میں تم سے گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ وقت آنے پر تم سے نمٹ لوں گا۔" یہ حاکمیت بھرا لہجہ تھا جس میں قہاری بھی تھی اور یہ اشارہ بھی کہ جاؤ، دفع ہو۔ مصطفٰے نے، جو کبھی پنجاب کا گورنر رہ چکا تھا۔ اپنے ماضی کا لب ولہجہ پھر سے اپنا لیا تھا۔ اس بدبخت افسر نے زیر لب بڑبڑا کر معافی مانگی اور شرمندگی سے وہاں سے چلا گیا۔

مصطفٰے انگ بولی کا قائل تھا یعنی یہ نظریہ کہ خود جسم بھی، زبان کا سہارا لیے بغیر، اپنی حرکات وسکنات سے بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اعتماد سے بھرپور ظاہری وضع قطع اپنا لی جائے تو سامنے آنے والے بیشتر لوگوں کا حوصلہ اسی وقت پاش پاش ہو جائے گا۔ مشق کے ذریعے وہ اس فن میں طاق ہو چکا تھا۔ محض اپنے اٹھنے بیٹھنے دیکھنے بھالنے کے انداز سے لوگوں کو مسخر کرنے کا یہ طریقہ جاگیرادارنہ خوبو کا ایک اہم عنصر تھا۔

میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ میرے چیمپین نے ابھی ابھی میرے سامنے اپنی بے جگری کی مثال پیش کی تھی۔ میں نے اس بارے میں سوال کیا: "آپ نے ابھی جو کچھ کیا اسے کر گزرنے کے فیصلے تک کیسے پہنچے؟ آپ تو ان کے قیدی ہیں مگر انہیں نیچا دکھا دیا۔"

"نپولین بونا پارٹ نے ایک بار اپنے قید خانے کا دروازہ ٹھوکر مار کر کھولا اور اپنے گرفتار کرنے والوں کے سامنے، جو ہکا بکا کھڑے تھے، اعلان کیا کہ وہ نپولین ہے۔

اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ اس کی شہرت اس سے دو قدم آگے تھی۔ یاد رکھو سیاست کی بنیاد یقین پر ہے۔ جو میں نے کیا وہ درست تھا۔ اخلاقی لحاظ سے مجھے بالادستی حاصل تھی۔ اگر میرے اعتماد میں لمحے بھر کے لیے بھی فرق آ جاتا تو ڈپٹی مجھ پر وار کر جاتا۔ ہم ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو دوسروں کو اعتماد میں لے کر چکما دیتے ہیں۔ یہ لوگ چہرے پر متانت طاری کر کے اور خلوص اور کھرے پن کا تاثر دے کر جال میں پھنسنے والوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم لوگوں کو یہ پتا چل جانے دیں کہ ہماری زرہ بکتر میں رخنے کہاں کہاں ہیں تو ہمارا کام چلنے سے رہا۔"

مصطفے کا ڈپٹی سے ٹکر لینے کا عمل لوک حافظے کا حصہ بن گیا۔ اب وہ نگران تھا۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے قیدی اس کی طرف دیکھتے تھے۔ اس نے وفاداری اور اتحاد پر زور دے کر قید خانے پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا۔ سپرنٹنڈنٹ کی نفرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر وہ مصطفے کی روز افزوں مقبولیت کے سامنے بالکل لاچار تھا۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ قیدی اس کی کسی بات پر مشتعل ہو کر جیل میں بلوا کر دیں۔ مصطفے کا ایک لفظ سلگتی آگ پر تیل ڈالنے کا کام کر سکتا تھا۔

اڈیالا جیل میں مصطفے کے نظر بند ساتھیوں میں فلسطین کے وہ حریت پسند بھی تھے جنھوں نے کراچی میں پین ایم کا ایک جیٹ اغوا کیا تھا۔ ان کے رہنما علی نے اسے بتایا کہ وہ کس زبردست اذیت میں مبتلا ہیں۔ کسی بدیسی ملک میں قید ہونا بجائے خود ان سدا کے بے وطن نوجوانوں کے لیے المیہ تھا۔ مستزاد یہ کہ ان کے کام و دہن کو قید خانے کی خوراک کی مصیبت سہنی پڑتی تھی۔ جس میں غذائیت کم اور مرچیں زیادہ تھیں۔ مصطفے نے ان کی بے ڈھب مصیبت کو محسوس کیا۔ وہ اپنے پاس سے انھیں کھانا بھجوانے لگا۔ یہ ایک معنی خیز سیاسی کنایہ تھا وہ شاید ان کے طریق کار سے اتفاق نہ کر سکتا لیکن ان کے مقصد وحید کو بڑی شدومد سے اپنا مقصد وحید سمجھتا تھا۔ فلسطین اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ اسرائیلی قبضے کے خلاف ان کا کبھی نہ رکنے والا جہاد اسے جوش دلاتا رہتا۔ یاسر عرفات ان چند گنے چنے قائدین میں سے تھا۔ جو اس کی روح میں ولولہ پیدا کرتے تھے۔

مصطفے کوئی عام قیدی نہ تھا۔ اسے قید خانے میں سات کمرے دیے گئے تھے۔ اس کی اپنی کوٹھری ایرکنڈیشنڈ تھی۔ ایک اور کوٹھری میں اس کے لیے فریج اور ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا۔ اسے ٹیلی وژن دیکھنے کی اجازت تھی اور پڑھنے کے مواد تک لامحدود رسائی حاصل تھی۔ وہ برآمدوں میں یوگا کی مشقیں کرتا اور اس نے احاطے کو ایک ننھے منے پولٹری فارم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس بات پر اسے خاص طور پر ناز تھا کہ ناشتے

کے لیے انڈے اس کے اپنے چھوٹے سے فارم سے آتے ہیں۔ مرغیاں اور چوزے اپنے فطری ماحول میں پل رہے تھے۔ پرندوں، خصوصاً تیتروں سے اس کا لگاؤ جاگیردارانہ ماضی کی باقیات سے تھا چند قیدی اسے مشقتیوں کے طور پھر دیے گئے تھے۔ وہی اس کے پرندوں کی دیکھ بھال کرتے اور گھر کو صاف ستھرا رکھتے۔ مصطفے اپنی اس محدود سی سلطنت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہ کام کی نگرانی کرتا اور اکثر دل بہلانے کے لیے کھانا خود پکاتا۔ طباخی میں ماہر ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرنے کی اسے خوب سوجھتی تھی لیکن خود دالوں اور سبزیوں پر مشتمل نہایت سادہ غذا کھا کر بہت خوش رہتا۔

اس سے جو خصوصی برتاؤ روا رکھا گیا تھا اس کے حوالے سے اکثر میرے ذہن میں خلفشار پیدا ہوتا۔ میں اس بارے میں سوچتی رہتی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ ایک کھرے سیاسی قائد کو حقیقتی قیدوبند کی زحمت اٹھانی چاہیے۔ اپنی تطہیر کے لیے دکھ جھیلنا چاہیے۔ لیکن میں اپنے خیالات کو دین داری اور نیکی سکھانے والے ان اسباق سے پیدا ہونے والی بچی کھچی خلش سمجھتی جن سے مجھے کونونٹ سکول میں واسطہ پڑا تھا۔ مصطفے کوئی مجرم نہ تھا۔ آج کے سیاسی قیدی کے بارے میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کل کو وہ قائد بن کر ابھرے گا۔ اہلِ اقتدار کو یہ جرات ہو ہی نہیں سکتی کہ اسے شکنجے میں کس سکیں۔ اس کے عروج کا وقت آنے ہی آئے۔ اہلِ اقتدار تو صرف اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں ان سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیا جائے گا۔ کچھ دیر کے لیے جیل کی ہوا کھانا تو سیاست دان کے لیے اہلیت کی ایک لازمی سند کا درجہ رکھتا تھا۔ یہی کافی تھا کہ مصطفے کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وہ رائے دہندگان میں اپنا حلقۂ اثر قائم کر رہا تھا۔ وہ تنہا رہ کر مستقبل کی چالیں اور گھاتیں ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ نہ چھوڑا جو اس کے ساتھ قید کو صعوبت اٹھا رہے تھے۔ وہ ایک علامت بن چکا تھا۔

جو تضاد مجھے دکھائی دیا تھا اسے میں نے کھڑے کھڑے مسترد کر دیا۔

ہر سر آفرین قائد کی طرح مصطفے اس قول پر یقین رکھتا تھا کہ "لکھا تو یہ ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں" وہ اپنے قواعد وضوابط خود وضع کرتا تھا۔ اپنے لیے گنجائش آپ نکالتا تھا۔ وہ کسی کی حاکمیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ قانون کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے لیے قانون کے پیچ ڈھیلے کرتا رہتا۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں پیغام رسانی کا ایک بہت ہی مفصل جال بچھانے کا "بندوبست" کیا۔ خصوصی پیغام مجھ تک فون کے ذریعے پہنچائے جاتے۔ خط دستی

موصول ہوتے۔ اگر اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ من مانی کرتا۔ اسے گرفتار کرنے والے اس کی خواہش کی تعمیل پر مجبور تھے۔ میں جب بھی اس سے ملنے جاتی وہ ہاتھ کے اشارے سے پہرے دار سے کہہ دیتا کہ وہ ہمارے پاس سے چلا جائے۔ جیل کے قوانین کی رُو سے اسے کسی سے علیحدگی میں ملنے کی اجازت نہ تھی۔ مصطفےٰ نے ان قوانین کو ٹھکرا دیا۔ وہ شیر کی طرح تھا جس کا یہ اصول ہوتا ہے کہ اُس کے علاقے میں صرف اُس کا حکم چلے گا۔ وہ کسی قسم کی گستاخی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا تمام رویہ کسی ایسے آقائے نامدار کا سا تھا۔ جسے وقتی طور پر معزول کر دیا گیا ہو۔ اس کا ماضی ہر کسی کو یاد تھا۔ اس کے مستقبل کو کوئی نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ ماضی و مستقبل کی ان تابانیوں کے روبرو اس کے ٹمٹماتے حال کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

یہی کچھ اس نے فیصل آباد جیل اور ملتان کے نشتر ہسپتال میں کیا تھا جسے کچھ دیر کے لیے ضمنی جیل قرار دے دیا گیا تھا۔ فیصل آباد میں اسے جلاوطنی سے لوٹنے کے فوراً بعد رکھا گیا تھا۔ پندرہ روز کے اندر ہر طرف مصطفےٰ کا حکم چلنے لگا۔ وہ محفلوں کا بندوبست کرتا، جس سے جی چاہے ملتا، اس کی خلوت میں مخل ہونے کی کسی کو مجال نہ تھی۔

مصطفےٰ میرا مرشد تھا۔ اس نے مجھے لیکچر دیے، سیاست کا فن سکھایا، سیاسی چالوں گھاتوں کی تشریح کی اور میرے ذہن پر اپنے سیاسی عقائد اور ترجیحات کا پکا رنگ چڑھا دیا۔ یہ اپنا ایک جانشین تیار کرنے کا عمل تھا۔ اسے ضرورت تھی کہ جیل سے باہر بھی کوئی ہوبہو اس جیسا ہو۔ مجھے یہ کردار ادا کرنے کے لیے سنوارا سدھایا جا رہا تھا۔ مصطفےٰ کی ہنر مندی کے سامنے ساچی اینڈ ساچی جیسی تعلقات عامہ کے گُر سکھانے والی مشہور برطانوی فرم کا تعلیم دینے کا سارا اہتمام گرد تھا۔ ہمیں جو کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ ان کے پیچھے اس کا دماغ اور میرا یہ یقین کارفرما تھا کہ وہ صحیح مقصد کے لیے کوشاں ہے۔ میں مصطفےٰ کا نفس ثانیہ بن چکی تھی۔

اپنے جس وژن کو اس نے دوسروں سے بچا بچا کر رکھا تھا وہ مجھ پر ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس نے سالہاسال خاموشی سے، صبر سے کام لے کر، جو سوچ بچار کی تھی اب اسے عمل کے ایک ٹھوس پلان کی شکل دینے میں مصروف تھا۔ اس کا نقطۂ آغاز عوام تھے۔ اس نے بتایا کہ خود غرض سیاست دانوں نے ماضی میں کس طرح عام آدمیوں کی امنگوں اور توقعات کو بیچ کھایا تھا۔ اس نے استحصال کی بات کی اور اس ناپاک گٹھ جوڑ کا ذکر کیا جس کے پیچھے سول اور فوجی افسروں، دیہی جاگیرداروں اور شہری سرمایہ داروں کے مفادات کام کر رہے تھے۔ وہ ان لوگوں کی مضبوطیوں سے واقف تھا۔ اور یہ ٹھیک بتا سکتا

تھا کہ کہاں چوٹ کھانے سے وہ ڈھیر ہو سکتے ہیں۔ اس نے زور دیا کہ دیہی عوام کی سطح پر تنظیمی کام کیا جائے اور ایک ایسی سیاسی حکمت عملی کا تصور پیش کیا جس میں اقتدار نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتا ہو۔ "ہم اقتدار کے اس واژگوں اہرام کو الٹا دیں گے"۔ اس نے اسلام کے ابتدائی دور سے مثالیں میرے سامنے رکھیں اور اولیں اصولوں کی طرف لوٹنے کی وکالت کی۔ مارکسزم کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس نے مارکسزم کے نقائص بھی گنائے اور ہمہ گیر اپیل کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اس نے مجھے اس بات کا قائل کر لیا کہ فوج کے ادارے کو کاٹ چھانٹ کر کم کیا جانا چاہیے۔ "ہمیں اپنے محدود وسائل اس عفریت سے بچانے ہیں۔ ہمارے عوام کو خوراک، مکان، لباس، طبی سہولتوں، پینے کے قابل پانی اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ فوج ہماری قومی دولت ہڑپ کر گئی ہے۔ اگر میں اقتدار میں آیا تو فوجیوں کو سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر لگا دوں گا۔ ہمہ وقت موجود فوج افرادی قوت کا زیاں ہے۔ علاوہ ازیں، وہ آئینی حکمرانی کے لیے ہر وقت خطرہ بنی رہتی ہے"۔

جہاں تک مطالعے کی عادت کا تعلق ہے اس کا انتخاب بہت وسیع اور گوناگوں ہوتا تھا۔ کبھی مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" پڑھی جا رہی ہے تو کبھی ماؤ کے طویل مارچ کی روداد۔ وہ حضرت عمر کے حسنِ انتظام کا بڑا مداح تھا اور ہٹلر کی بعض اصلاحات کو قبول کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتا تھا۔ "ہر وہ پروگرام قبول ہے جس سے دکھ درد میں کمی آئے اور جو ترقی کی طرف گامزن رہے"۔

مصطفےٰ محسوس کرتا تھا کہ ہمیں خود کو عالمی طاقتوں کے بلاکوں سے ذرا دُور رکھنا ہو گا۔ اس نے سوویت یونین سے برادرانہ رشتے قائم کرنے کی والہانہ وکالت کی اور افغانستان پر روسی یلغار کے بارے میں پاکستانی موقف کو ٹھکراتے ہوئے پاکستان میں افغان مہاجرین کی آباد کاری کی مخالفت کرتا رہا۔ "مختصر مدت کے فوائد کی خاطر ضیا نے ہمارے مستقبل کو قربان کر دیا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ یوں خواہ مخواہ ملوث ہونے سے کیسے ہولناک نتائج کی رو چوری چھپے ملک میں سرایت کر جائے گی۔ روسی ہمارا کردار کبھی نہ بھلائیں گے۔ بندوق پر مبنی کلچر اور منشیات کا بیوپار اس تصادم کے فطری فوری ثمرات ہیں۔ جنرل کوتاہ بیں ہیں۔ امریکیوں کی ڈالر ڈپلومیسی نے ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔" وہ قائل ہو چکا تھا کہ پاکستان کو ایک مختصر مدت کے لیے دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر جینا چاہیے۔ یہ قوم کو آزادی کے شعور سے روشناس کرانے کے لیے ضروری تھا: "چین کو دیکھو۔ بھارت کو دیکھو۔ وہ اپنی مقامی ٹیکنالوجی کو ترقی دے رہے ہیں۔ ہاتھ میں کشکول لے کر دربدر نہیں پھرتے۔ عظیم قومی

غیرت کے مالک ہیں۔ ہم نے اپنے لیے اسان رستہ چن لیا ہے۔ ہر چیز باہر سے منگائی جاتی ہے۔ ہم اپنے افکار تک درآمد کرتے ہیں۔"

مصطفٰے ہمیشہ پُر جوش انداز میں پورے یقین کے ساتھ بات کرتا۔ اس کی گفتگو پر گمان ہوتا جیسے وہ اقتباسات سنا رہا ہو۔ اس کے دلائل صائب ہوتے۔ انھیں پیش کرنے سے پہلے وہ ان کے تمام پہلوؤں پر اول تا آخر غور کر چکا ہوتا تھا۔ اس میں مسیحائی کی کوئی صفت پائی جاتی تھی، جسے اس کی زنجیروں نے چار چاند لگا دیے تھے۔ مجھ پر اسے رہا کرانے کا جنون سوار ہوگیا۔ اس جیسے ذہن کا مالک اور یوں قید خانے میں پڑا رہے! یہ تو قبول نہیں۔ وہ ایسا شخص تھا جسے تجربات نے تراش خراش کر تاریخ کے اس لمحے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس موقع پر وہ ایک فیصلہ کن اور بحران شکن کردار ادا کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کے خلاف صف آرا قوتیں بہت طاقتور تھیں۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا کہ اس کی ذات سے ان کے اپنے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ تو وہ اس کا کام تمام کر دیں گی۔ لگتا تھا کہ تمام سوالوں کے جواب اسے معلوم ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ہم جس مشکل صورت حال میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے کیسے نکلا جا سکتا ہے اس کے لیے یہ بھی اہم تھا کہ میں اس پر اور اس کے مقصد وحید پر یقین لے آؤں۔ اس نے مجھے اپنا وفادار حلیف بنانے کے لیے سخت محنت کی۔ میری حیثیت اگر ڈمی کی تھی تو وہ میری آواز بننا چاہتا تھا۔ آواز اس کی ہوتی اور سننے والوں کو لگتا کہ میں بول رہی ہوں۔ بس میری تربیت مکمل ہونے کی دیر تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے حریفوں کے خلاف میدان میں لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی باتیں جذب کیں، اس کی تعلیمات کو جزو ذہن بنا لیا، ان پر عمل کیا لیکن راہ عمل پر چلتے چلتے میں بدلتی جا رہی تھی۔ میں آزادانہ طور پر جوابی رویہ اپنانے کے قابل ہو چلی تھی۔ میرے جوابی رویوں میں، جو کسی قسم کی سکھائی پڑھائی یا تربیت کا نتیجہ نہ تھے، اور خود مصطفٰے کے جوابی رویوں میں بہت کم فرق رہ گیا تھا۔

مصطفٰے نے سیاست کے گر اپنے پیرو مرشد ذوالفقار علی بھٹو سے سیکھے تھے۔ وہ سیاسی اعتبار سے بھٹو کا حقیقی وارث تھا۔ بھٹو نے اپنے پیچھے توازن سے محروم ورثہ چھوڑا تھا۔ بھٹو کی شخصیت میں بعض خامیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے ہی منشور کی آپ خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس کے اقدام سے ہر بار ثابت یہی ہوتا کہ وہ مخلص نہیں۔ عوام دوست رہنما کی حیثیت سے اس کے پاس بڑے کام کے نعرے تھے اور ان نعروں کی مدد سے وہ لوگوں میں نئی روح پھونک سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف ارادے کی پختگی سے محروم تھا۔ وہ ان انتہائی سخت اصلاحات کو کبھی

نافذ ہی نہ کر سکا جن کی ملک کو اشد ضرورت تھی۔ بھٹو کے رخصت ہو جانے کے بعد مصطفٰے کو، کوئی چارہ دہم، کی طرح یقین تھا۔ کہ "پارٹی میری ہے" مصطفٰے اپنے عقائد میں مخلص تھا۔ وہ اصولوں پر سودے بازی نہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کے منشور کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ منشور محض ووٹ بٹورنے کا ڈھکوسلا نہیں۔ اس خیال تھا کہ پارٹی کے کارکنوں پر اب تک اس منشور کا سحر طاری ہے اور اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ مصطفٰے کی سحر آفرینی میری ذات کے حوالے سے سیاسی معمولات میں ڈھلتی گئی۔ اگر وہ بھٹو سے زیادہ مخلص تھا تو میں اس سے دگنی مخلص تھی۔ میرے پاس اس کے جوش و خروش پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

میری اور اس کی سوچ ایک ہو چلی تھی۔ میں نے اس کے جملے برتنے اور چالیں چلنا شروع کر دی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی پارٹی کے کارکن میری طرف کھچے آ رہے ہیں۔ ان کی کاروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، ان کے حوصلے کو ہمیشہ بہت بلند رکھنا میرے لیے ممکن ہوگیا۔ میں عوامی جلسوں میں خود بخود مصطفٰے کے انداز میں تقریر کرنے لگی اور میں نے دیکھا کہ سننے والوں پر میری تقریروں کا وہی اثر ہوا جو مصطفٰے کی تقریر کا ہوتا۔ میرا انداز خطابت ہوبہو ان جیسا تھا۔ نہ اس میں کھوکھلا پن تھا اور نہ اس پر کسی خوب اچھی طرح تیار کی ہوئی تقریر کا گمان ہوتا تھا۔ مصطفٰے قید خانے کی دیواروں کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اپنی عقل و دانش کو سمگل کر کے جیل سے باہر پہنچا دیا۔ سمگلنگ کی اس کاروائی میں میں اپنی خوشی سے اس کا کارندہ بنی۔ بغاوت کے جراثیم پھیل رہے تھے۔ قرنطینہ کی پابندیوں کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اس نے مجھے اپنا جیسا بنا لیا تھا۔

رفتہ رفتہ میں اپنے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہو گئی۔ میں کسی کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی نہ رہی۔ جب میں خود اپنے طبقے پر تنقید کرتی تو ذرا گڑبڑا جاتی۔ جو لوگ طبقاتی نفرت کی بہ نسبت طبقاتی حسد کے مارے ہوتے ہیں وہ امیر لوگوں پر زیادہ چبھتے ہوئے فقرے کس سکتے ہیں۔ مصطفٰے سمجھتا تھا کہ بے روک ٹوک دولت اکٹھی کرتے جانے کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ وہ رابن ہڈ والے طریقے کے حق میں بھی نہ تھا (کہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دی جائے) وہ ایسے نظام کا خواہاں تھا جو دولت کی مساوی تقسیم کی ضمانت دے اور جس میں سب کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ قوم پر سوار ان پیران تسمہ پا کے پاسپورٹ الٹی میٹم دے کر ضبط کر لینے چاہئیں۔ بھٹو نے ان سے بہت نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس نے ان سے صرف اتنا کہا کہ

باہر کے ملکوں میں رکھا ہوا زر مبادلہ ملک میں واپس نے آئیں۔ یہ کہہ تو دیا لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اس پر کسی نے عمل کیا بھی یہ نہیں۔ ان کو گرفتار کر کے اس وقت تک جیل میں رکھنا چاہیے جب تک یہ اپنی ناجائز طور پر کمائی ہوئی دولت واپس نہ لے آئیں۔" وہ ٹریڈ یونینوں اور دوسری اتنی ہی موثر طاقتوں کے حق میں تھا جو سرمایاداروں کو لگام دے سکیں۔ "پرولتاری طبقے کی دیکھ بھال صنعت کار کی ذمے داری ہے۔ صنعت کار کو چاہیے کہ غریبوں کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرے۔ ملازمت کا تحفظ، بہبود کا بندوبست، طبی سہولتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ کام پر جانے والی ماؤں کے لیے ایسے مرکز ہونے چاہییں بڑے بڑے صنعتی اداروں پر فرض ہے کہ وہ سکول، کالج، ہسپتال اور یتیم خانے بنا کر ثقافت کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ ہر وقت اپنی ہی جیب گرم کرتے رہنے کے بجائے انھیں وہ قرض چکانا چاہیے جو معاشرے کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے"۔ میں نے محسوس کیا کہ جس طرح کے آدمی کو میں منظرِ عام پر آتا دیکھنے کی خواہاں تھی وہ بالآخر سامنے آ گیا ہے۔ مصطفےٰ کی صورت میں ایک بے غرض سیاست دان میرے روبرو تھا جو مجھے اپنے ذہن میں جھانکنے کی دعوت دے کر اصل سچائی دکھا رہا تھا۔

جب میں جاگیردارانہ نظام پر کوئی نکتہ چینی کرتی تو میری تنقید زیادہ کھری معلوم ہوتی۔ مصطفےٰ خود جاگیردار تھا۔ اس کے باوجود وہ سمجھتا تھا کہ اس دقیانوسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ اسے معلوم تھا کہ "ایسے ماحول میں جو بڑی حد تک جاگیردارانہ ہو جمہوریت پروان نہیں چڑھ سکتی۔" اس نے ان نشستوں کی سختی سے مذمت کی جہاں سے انتخاب لڑ کر جاگیردار آسانی سے جیت جاتے تھے۔ اور جو اس بات کی ضمانت تھیں کہ انھیں پارلیمنٹ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وڈیرا دہشت پھیلا کر راج کرتا تھا۔ "وڈیرے کے حق میں ووٹ نہ ڈالنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔ میرے پس منظر کے پیش نظر، جاگیرداروں کے خلاف میری تقریروں کو وزن رکھنا ہی چاہیے تھا۔ اور یہی ہوا بھی۔

اب میں بڑی روانی سے چلنے والی سیاسی مشین بن چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے قیدی فلسطینیوں کو ایک بار خط لکھا جس میں کہا کہ مجھے ان کے مقصدِ وحید پر پورا یقین ہے۔ خط کے آخر میں یہ دعا تھی۔ "میں چاہتی ہوں کہ کاش میرے بچے بھی آپ جیسے بہادر ہو سکیں۔"

میری کایا پلٹ مکمل ہو گئی۔ میں اس کے ہر اہم مقصد کی حمایت کرنے پر اتر آئی اور بڑی جذباتی شدت کے ساتھ اسے رہا کرانے کی کوششوں میں جٹ گئی۔ مصطفےٰ

جانتا تھا کہ میں دل کش ہوں۔ لیکن میں اسی کی خاطر لڑ رہی تھی۔ اس بنا پر [illegible] یے معاشرے میں آنا جانا اٹھنا بیٹھنا ناگزیر تھا جس میں مردوں کو غلبہ حاصل تھا۔ وہ [illegible] باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ شروع شروع میں وہ میری آزادی کے حوالے سے غیر مطمئن [illegible] رہا لیکن اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک ایسی سیاسی ہستی بن چکی [illegible] جو ہمیشہ اس کی وفادار رہے گی۔ جب تک میں اس کی سیاسی زندگی میں شریک اور [illegible] کے مقصد کی راستی کی قائل رہوں گی، اس وقت تک راہ راست سے ہرگز نہ بھٹکوں [illegible]۔ میں مصطفےٰ سے صرف اسی صورت میں محبت کر سکتی تھی کہ مجھے اس پر مکمل [illegible]ن ہو۔ وہ بھی جانتا تھا کہ جب تک میرا یقین سلامت ہے میری محبت ہر قسم [illegible] بیات پر غالب آ سکتی ہے۔

مصطفےٰ بڑی زبردست حسِ مزاح کا مالک [illegible] برے بڑے اوٹ پٹانگ موقعوں پر بھی وہ مجھے ہنسانے میں کامیاب ہو جا[illegible] لطیفوں سے مجھ پر چوٹ کر کے اسے بڑا مزہ آتا لیکن میرا مذاق اڑانے میں کسی طرح کی کینہ پروری کو دخل نہ تھا۔ میں اسے چھیڑ چھاڑ کے خاصے مواقع فراہم کرتی رہتی۔ وہ مجھے میرے لباس یا حلیے یا ان "بے اثر" لوگوں کے حوالے سے چھیڑتا جن سے، اس کے قید میں ہونے کے باعث، مجھے ملنا پڑتا تھا۔ میرے بالوں اور ان کی نوبہ نو بناوٹوں کو دیکھ کر (کہ بال بنانے کا مجھے شوق تھا) اسے ہمیشہ حیرت ہوتی۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا کہ "تم ایسی ماڈل معلوم ہوتی ہو جو کسی میگزین کے فیشن والے صفحات سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی ہو"۔ خیر اس میں ہرج ہی کیا تھا۔ تاہم قید خانے کے حوالے سے میرا حلیہ قدرے بے تکا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بہت سنجیدہ زندگی گزار رہی ہو۔ اپنے روزمرہ میں تھوڑی سی رنگینی شامل کرنے کے لیے تم یہ عجیب وغریب حرکتیں کرتی رہتی ہو۔" دل لگی کی خاطر اور اسے متحیر کرنے کے لیے میں نے رنگ برنگی دھاریاں ڈال کر بال رنگنے شروع کر دیے۔ ان تانبے کے رنگ کی اور زرد اور خاکستری دھاریوں کو دیکھ کر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا رہا کہ "تم دوبارہ انھیں لمبے لمبے گھنی گیسوؤں کی طرف لوٹ جاؤ جنھوں نے پندرہ سال پہلے مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا"۔

مصطفےٰ بڑے ہی لطیف پیرائے میں مجھے ایک ایسے ملک میں سرِعام زندگی کے لیے تیار کر رہا تھا جہاں ظاہری حلیہ، خصوصاً عورت کا، معنی رکھتا ہے۔ ایک بار جب میں گجرات میں کسی سیاسی جلسے میں شرکت کر کے آئی تو مصطفےٰ نے مجھے میرے لباس پر طعنہ دیا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور بولا: "پتہ ہے تم آج کیسی لگ رہی ہو؟ جیسے

مارگریٹ تھیچر نے لال پراندا پہن رکھا ہو۔ تمہارا جلسہ کہاں پہ تھا؟ برمنگھم یا ساؤتھال میں یا گجرات میں؟" میں مسکرا کر رہ گئی کھسیانی سی ہو کے۔

ایک اور مرتبہ اس نے مجھے جیل کے احاطے میں دوپٹے کے بغیر چلے آنے پر ڈانٹا۔ "یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ بیگم صاحبہ جیل میں چلی آ رہی ہیں، ارد گرد اتنے بہت سے مرد موجود ہیں اور سر پر دوپٹا لینا بھی یاد نہیں۔" میں نے کہا "بھول گئی۔" "یہ کوئی بھولنے والی بات ہے؟ عام طور پر تو لوگ ایسی باتیں نہیں بھولتے۔ تم نے ایک بہت ہی بنیادی بات بھلا دی۔ دوپٹا تمہاری شرم یا حیا کی علامت ہے۔" میں جھینپ گئی۔ مصطفےٰ نے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ آزادی کا مطلب من مانی کرنا نہیں۔

جیل میں قیام کے دوران مصطفےٰ مجھے مسلسل خط لکھتا رہا جو ہمیشہ کسی نہ کسی کے ہاتھ مجھے بھجوائے جاتے۔ یہ خط سیاسی طور پر سبق آموز تھے۔ وہ اسی خط و کتابت کے ذریعے مجھے تعلیم دیا کرتا۔ اس نے مجھے سکھایا کہ گفت و شنید کے دوران میں اپنے حقیقی جذبات کبھی ظاہر نہ کرنے چاہئیں۔ "چہرے کو احساس سے بالکل عاری رکھو تاکہ مدمقابل تمہارے ردعمل کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جائے۔" اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اہم جلسوں میں اپنی بات پر قائم تو رہنا چاہیے لیکن شائستگی کے ساتھ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "آپ تو سب کچھ پوچھو لیکن اپنی طرف سے بالکل کچھ نہ بتاؤ" اس نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ اخباری کانفرنسوں کے دوران پُرفریب سوالوں سے جھٹ پٹ نمٹنے کی کیا ترکیب ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ غیر ضروری تنازعات کھڑے کرنے میں کیا خطرات پوشیدہ ہیں۔

اس کے خط رومانی باتوں سے بھی بھرے ہوتے تھے۔ وہ میرے اندر چھپی نسوانیت کو چھونا چاہتا تھا اور اپنے والہانہ عشق کا برملا اظہار کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں اس کے لیے کتنی اہم ہوں، اسے میری کتنی ضرورت ہے، مجھ پر کتنا ناز ہے۔ "تم نہ ہو تو میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا" اس نے مجھے ملکہ نورجہاں سے تشبیہ دی اور کہا کہ میری عدم موجودگی میں اس کی دنیا سونی سونی نظر آتی ہے۔ "جب تم میرے پہلو میں ہوتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ تم ہمیشہ میری وفادار رہوگی تو مجھے مرنے کا ذرا رنج نہ ہو گا چاہے آج ہی مر جاؤں۔"

ایسے شخص کی طرف سے، جسے دنیا سے الگ تھلگ رکھا جا رہا ہو، ان خطوں کا ملنا طبیعت کو جوش سے بھر دیتا تھا۔ یہ خطوط اس کی ذہنی کیفیات کے غماز تھے۔ اپنی سیاسی سوچ میں یکسو مزاج اور متوازن تھا اور جب مجھے، بطور بیوی، مخاطب کرتا تو بلا کا

رومان پسند نظر آتا۔ ایک ایسے آدمی کے ان کلمات نے، جس کا مستقبل تک داؤ پر لگا ہوا تھا، مجھے حوصلہ بخشا کہ ہاتھ پیر مارتی آگے بڑھتی جاؤں۔ رومان پسند انقلابی میں ہمیشہ ہی ایسی کشش پائی جاتی ہے جس سے بچنا محال ہے۔ مصطفےٰ کے خطوں نے مجھے اس سے قریب تر کر دیا۔ میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ وہ مصائب کو پرے جھٹک کر اپنے اندر چھپے ہوئے شاعر کا اظہار کرنے پر قادر ہے۔

قید خانے میں ہم جب بھی ملتے تو مستقبل کے بارے میں بات چیت کرتے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس زبردستی کی جدائی نے ہمیں اپنی ترجیحات کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مستقبل وہ نہیں تھا جو پہلے کبھی نظر آتا تھا۔ ہم نے یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ بس اقتدار حاصل کرنا ہی ہمارا مقصد ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اقتدار حاصل ہو جانے کی صورت میں ہم پر خود اپنے طبقے سے لاتعلق ہونا لازم ہو جاتا۔ ہم نے قسم کھائی کہ سادہ زندگی گزاریں گے، خدا سے ڈریں گے اور عوام کی خدمت کریں گے۔ "ہم اپنے موجودہ چھوٹے مکان ہی میں رہیں گے"۔ مصطفےٰ نے کہا۔ "جو کچھ مجھ پر بیت چکا ہے اس کے بعد اپنی محل نما رہائش کا رخ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ہم سوزوکی رکھیں گے، پجیرو نہیں۔ ہمیں مثال قائم کرنی ہے۔ لوگوں کو بتانا ہے کہ مثالی کردار کیسے ہوتے ہیں۔" ہم اپنے خوابوں میں سادگی کا رنگ بھرتے رہے۔

میں جب بھی مصطفےٰ سے ملنے گئی وہ ہمیشہ خوب بنا سنورا نظر آیا۔ میں نے ایک بار بھی اسے میلے یا سلوٹوں پڑے کپڑوں میں نہیں دیکھا نہ اس کی شیو بڑھی دیکھی۔ اس کا لباس سادہ مگر بالکل بے داغ ہوتا۔ وہ ہمیشہ پرسکون دکھائی دیا۔ پریشان یا مضطرب کبھی معلوم نہ ہوا۔ اپنے سکون کو وہ یوگا اور مراقبے کا نتیجہ بتاتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حلیے کی ظاہری صفائی ستھرائی میں اس درجہ احتیاط صرف میری خاطر تھی۔ اسے پتہ تھا کہ میں کتنی نفاست پسند ہوں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے دکھ پہنچے۔ وہ مجھے توانا رکھنا اور میرے حوصلے کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی اس کے نزدیک اہم تھا۔ میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ ذرا ذرا سی بات میں میرا خیال رکھا جا رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی کو میری بھی ضرورت ہے۔ وہ جان بوجھ کر خود کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کر رہا تھا۔ تاکہ اپنے لیے موزوں ترین مقام تلاش کر سکے۔ اسے امراء کے مدرسوں میں پڑھنے والے اشراف، گلبرگ کی گھمنڈی بیگمات اور لاہور کے لال بجھکڑ دانشوروں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے رشتے عوام سے تھے۔ باقی سب لوگ معاشرے کے سر پہ بالوں میں خشکی کے مانند تھے۔ اس کی نظر میں عام آدمی مثالی شخصیت تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ خود بھی ہر ایسے جھونپڑے میں رہ چکا ہے جس کی چھت ٹپکتی ہو اور جس کے

گرد افلاس نے گھیرا ڈال رکھا ہو۔ وہ غلطی پر نہ تھا۔ مقدر، اپنے پراسرار انداز میں، یہ دکھانے والا تھا۔ کہ عوام کے دل میں اس کی کتنی قدرو منزلت تھی۔

ہم نو برس جلاوطن رہے تھے۔ اس عرصے میں بہت لوگوں نے ہماری کمی محسوس کی لیکن جس شدت سے مصطفےٰ کو اس کی ماں جی نے یاد رکھا اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ کھر خانوادے کے کسی فرد کا اپنی زمینوں سے دور رہنا انھونی سی بات تھی۔ اور یہ تو بالکل ہی سمجھ نہ آسکا تھا کہ ان میں سے کسی کو زبردستی دور رکھا جا سکتا ہے۔ جلاوطنی کے اس چکر میں مصطفےٰ کی ماں جی اپنے دو بیٹوں سے محروم ہو گئی تھیں۔ وہ ان کی یاد میں کڑھتی رہتی تھیں۔ مصطفےٰ ان کا چہیتا تھا۔ وہی ان کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا اور صحت کا خیال رکھتا تھا۔ فرائیڈ کے اس جملے سے بیٹے پر ماں کے اثر کی ماہیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: "جو مرد بلا شرکت غیرے اپنی ماں کا منظور نظر رہ چکا ہو وہ عمر بھر خود کو فاتح محسوس کرتا ہے۔ اور یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ کامیاب ہو کر رہے گا۔ اور یہی اعتماد اکثر اس کی کامیابی کا سبب بنتا ہے۔" ماں جی کی نظر میں مصطفےٰ بہت ہی قابلِ تحسین تھا اور انھوں نے اپنی تمام امنگیں امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

اچانک ان کی آنکھ کے تارے کو زبردستی کہیں اور پہنچا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے کوشش کی کہ وہ لندن چلی آئیں لیکن حکومت نے انھیں پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اہلِ اقتدار کو پتہ تھا کہ مصطفےٰ کو ان سے بہت پیار ہے اور اس پیار سے فائدہ اٹھا کر اسے کبھی نہ کبھی بہلا پھسلا کر پاکستان لایا جا سکتا ہے۔ مصطفےٰ پر جیسے پہاڑ گر پڑا۔ وہ اکثر آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھا اپنے اس المیے پر غور کرتا رہتا۔

ادھر بڑی بی غم کے مارے گھلی جا رہی تھیں۔ اتنے میں خبر آئی کہ ان کا بیٹا واپس آ رہا ہے۔ ان کا حوصلہ بلند ہونے لگا۔ جلد ہی ان کا "غلام مصطفےٰ" ان کے پاس آ جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ طیارے سے اترتے ہی مصطفےٰ کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اسے اپنی ماں جی سے ملنے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔

ایک روز مجھے پیغام ملا کہ ماں جی بیمار ہیں اور مجھے گاؤں جا کر ان کی خیر خبر لینی چاہیے۔ میں اپنی کار میں کوٹ ادو پہنچی۔ ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان پر مکمل غشی طاری تھی۔ وہ تقریباً مرگ آسا سکون کی حالت میں چارپائی پر پڑی تھیں۔ ان کے بھانجے بھتیجے ارد گرد بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ عجیب ڈراؤنا منظر تھا۔ وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کے مرنے کے منتظر تھے۔ نہ وہاں کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ انھیں ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی ایک طرف بیسویں صدی کا آخری زمانہ دوسری طرف جہالت اور تقدیر پرستی کا یہ عالم!

میرا پارا فوراً چڑھ گیا۔ میں نے اصرار کیا کہ میری ساس کا مناسب علاج کیا جائے مصطفےٰ کے بھائی، غلام غازی کھر، نے مجھے ٹوکا: "کچھ حاصل نہ ہو گا۔ یہ مرنے والی ہیں یہ میری ماں ہیں۔ فیصلہ میں کروں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔" "مجھے آپ کے خیالات کی کوئی پروا نہیں۔ میرے لیے یہ مصطفےٰ کی ماں جی ہیں۔ میں یہاں مصطفےٰ کی نمائندگی کرنے آئی ہوں۔ مصطفےٰ ان کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ چونکہ وہ موجود نہیں اس لیے اس کی غیر حاضری میں یہ فیصلہ میں کروں گی کہ کیا کیا جانا چاہیے۔ میں زور دے کر کہتی ہوں کہ کسی ڈاکٹر کو بلایا جائے اور انھیں ہسپتال پہنچایا جائے۔ اپنی طرف سے ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کیے بغیر ہم انھیں مرنے نہ دیں گے۔"

سب بھائی وہاں موجود تھے۔ غازی کو تاؤ تو بہت آیا لیکن میرے لہجے سے کچھ ایسا ضرور ظاہر ہوا ہو گا کہ میں دھن کی پکی ہوں۔ خاندان والے ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ ہو گئے۔ میری ساس کو آکسیجن دی گئی۔ ان کا بلڈ پریشر تھوڑا سا گھٹ گیا اور گو انھیں ہوش نہیں آیا لیکن ان کی بے چینی میں بظاہر کمی آ گئی۔ انھیں ملتان کے نشتر میڈیکل ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مصطفےٰ بھی پیرول پر پولیس کی تحویل میں ملتان آ پہنچا۔ ہسپتال میں ایک ضمنی جیل قائم کر دی گئی۔ ایک پورے کا پورا وارڈ مصطفےٰ کے حوالے کر دیا گیا۔ ہسپتال میں بھی ہمارے پاس ایک کمرا تھا۔ جہاں بیٹھ کر ہم راتوں کو جاگتے تھے اور جہاں ہم سب کے لیے کھانے پینے کا انتظام تھا۔ مصطفےٰ کے پورے خاندان نے ملتان میں ڈیرے ڈال دیے۔ سب لوگ ہسپتال کے کمرے میں جمع رہتے۔ اتنے بڑے خاندان کو کھلانے پلانے کے لیے لمبا چوڑا بندوبست کرنا پڑا پارٹی کے کارکن ہمیں کھانا بھجواتے رہے۔ مجھے یاد ہے میں نے مصطفےٰ سے اس بارے میں جھگڑا کیا کہ ایک پورا وارڈ اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ "جو واقعی بیمار ہیں ان کا کیا ہو گا؟ وہ کہاں جائیں گے؟" اس مرتبہ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اسے اپنی ماں جی کے علاج معالجے کے سوا کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

وہ بیہوش ماں جی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہتا اور کوشش کرتا کہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے کسی طرح انھیں اس جھٹپٹے کی دنیا سے واپس لے آئے جس میں وہ کھو چکی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ان کی طرف سے جواب ملے گا۔ وہ بولتا رہتا۔ انھیں بتاتا رہتا کہ وہ واپس آ گیا ہے اور اب انھیں کبھی چھوڑ کر نہ جائے گا۔ وہ ان کی منت سماجت کرتا رہا کہ آنکھیں کھول کر اپنے اس بیٹے کو دیکھ تو لیں جس کے غم میں انھوں نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مایوسی کے باوجود ڈٹے رہنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ہمت نہ ہاری۔

جب بھی مصطفیٰ اپنا نام لیتا اور انہیں بتاتا کہ وہ ان کے سرہانے موجود ہے تو بڑی بی جواب میں کراہ دیتیں۔ اکثر ان کے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگتے۔ انہیں مصطفیٰ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ تھا۔ ان کے جسم کے بس میں تو اب کچھ نہ رہا تھا۔ لیکن ذہن نے کسی نہ کسی طرح، اظہار کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ میری ساس کو کبھی ہوش نہ آیا۔ وہ اپنے لاڈلے "غلام مصطفیٰ" کو دیکھے بغیر فوت ہو گئیں۔ مصطفیٰ ان حالات کو کبھی نہ بھلا سکا جن میں ان کی موت واقع ہوئی تھی۔

اسے جنازے میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ جب وہ ہسپتال جیل سے باہر آیا تو لوگ ہر طرف سے دوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سیٹرنگ ویل پر اپنی جگہ سنبھال کر وہ ایسا چھوٹا سا بچہ معلوم ہونے لگا جسے اپنا من بھاتا کھلونا مل گیا ہو۔ گو ہمارے پیچھے پولیس کے سپاہیوں سے بھری کئی جیپیں تھیں لیکن کار چلانے کا یہ موقع آزادی کے جھونکے کی مانند تھا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ بیٹھوں اور اپنے بھائی غلام غازی کو پیچھے بٹھایا۔ یہ ایک ترقی پسندانہ ادا تھی۔ وہ عوام کو اشارتاً بتا رہا تھا کہ میں اور وہ اب برابر ہیں۔ میرا مقام اس کے پہلو میں ہے۔ کھر خاندان کی خواتین اپنی اوقات سے خوب واقف تھیں۔ جب وہ گاؤں جاتیں تو انہیں پردے کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی۔ مصطفیٰ ایک قدیم روایت سے انحراف کر رہا تھا۔ سارا کھیل اپنے پر اعتماد کا تھا۔ اس کے بھائی غلام غازی نے بڑی خفت محسوس کی کہ اسے پیچھے بٹھا دیا گیا ہے۔ وہ میری بالادستی پر آزردہ ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا بھائی اتنا "ماڈرن" کب سے ہو گیا ہے۔

چلتے چلتے مظفر گڑھ آ گیا۔ مصطفیٰ گیارہ سال بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ جب ہم سناواں پہنچے تو سب سے پہلے میری نظر دھول پر پڑی جو بادلوں کی طرح لہراتی، بل کھاتی اٹھ رہی تھی۔ دھول اس طرح شام کو جھٹپٹا ہونے پر اٹھتی ہے جب مویشی چراگاہوں سے گھر پلٹتے ہیں۔ اسی رعایت سے شام کی یہ ساعت "گودھول" کہلاتی ہے۔ لیکن اس وقت گرد کے اس پردے کے پیچھے، ان ارواح کی طرح جو قیامت کے روز یکجا ہوں گی، انسانوں کا ایک سمندر تھا۔ وہ لوگ لٹے پٹے اور بے یارومددگار نظر آ رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نم نہ ہو۔ اور اس کے باوجود آنسوؤں کی اس چلمن کی اوٹ میں امید کا سایہ بھی تھا۔ یہ اُمید کہ نجات کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔ کہنے کو تو وہ مصطفیٰ کی والدہ کے جنازے میں شریک ہونے آئے تھے لیکن ہم سب کو علم تھا کہ یہ اس کے اپنے عوام ہیں۔ یہ سارے لوگ اسے اپنے علاقے میں واپس آنے پر خوش آمدید کہنے جمع ہوئے تھے۔

پھٹے حالوں، چیتھڑے لگائے، ننگے پاؤں، وہ آتے گئے۔ زندگی کی رونقوں سے دور رہنے پر مجبور وہ لوگ، اپنے اپنے دکھ درد کے پیوند سجائے، آئے۔ اپنے قائد کی جھلک دیکھنے کے لیے ریل پیل کرتے آگے لپکے۔ وہ کھلم کھلا رو رہے تھے، سینہ کوبی میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے سینے چاک کر ڈالے اور اپنے خوں فشاں دل دنیا کے سامنے رکھ دیے۔ ان کی آہیں بلند ہو کر آسمان کو لپکنے لگیں۔ اس روز انہوں نے آنسوؤں کی زبان سے اپنے ووٹ ڈالے۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح منتظر تھے۔ مصطفیٰ کو بڑا دکھ ہوا کہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لوگ اسی طرح ایک ظالمانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اسی آمر کے فوجی بوٹ تلے پس رہے تھے۔ ان پر آج بھی مصطفیٰ کے وعدے کا سحر طاری تھا۔ والدہ کی موت اسے اپنے گھر تک لے آئی تھی لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ یہاں آ کر عوام پر اس کا ایمان تازہ ہو گیا تھا۔

زمین مصطفیٰ کی والدہ کے جسدِ خاکی کو آغوش میں لینے کے لیے وا ہوئی۔ مجمع مصطفیٰ کو آغوش میں لینے کے لیے سمٹ آیا۔

مولوی آخری رسوم ادا کر چکا تو مصطفیٰ نے اپنے عوام سے خطاب کیا۔ واپس آنے کے بعد مجمع عام کے سامنے یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ ماحول پر غضب کا جذباتی تناؤ طاری تھا۔ ہر طرف مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جنازے اکثر سیاسی سرگرمیوں میں شدت پیدا کرنے کا کام دے جاتے ہیں۔ مصطفیٰ بڑا زیرک تھا۔ وہ بھلا ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ اس میں تازہ جوش پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے ہی لوگوں کے درمیان تھا۔ اس کے سامنے ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ "میں نے گیارہ طویل برس اس دن کا انتظار کیا۔ میری یہی آرزو تھی کہ میں آپ لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ قسمت نے میرے ساتھ عجب ہاتھ کیا ہے۔ میں اللہ سے دعا مانگتا رہا کہ مجھے آپ کے لیے کچھ کرنے کا موقع ملے۔ میں یہاں پہنچا بھی تو کس طرح؟ اپنی والدہ کی موت کا ماتم کرنے کے لیے۔ آپ لوگ پھر میرے غم میں شریک ہونے آئے ہیں اور میں پھر آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میں آج بھی آمر کا قیدی ہوں۔ میں ابھی آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس بے کراں پیار کو دیکھ کر جو آپ کو مجھ سے ہے مجھ پر عاجزی طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اس محبت کا حقدار بننے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ کے حالات بدلنے کے لیے میں نے کیا کیا؟ جن لوگوں کے پاس اقتدار ہے انہوں نے مجھے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے آپ لوگوں سے دور رکھنے کی سازش کی۔ جب میں اس صوبے کا گورنر تھا تو آپ کے لیے صرف اتنا کر سکا کہ میں نے گورنر ہاؤس کے دروازے مظفر گڑھ کے عوام کے لیے کھول دیے۔ آپ اس بات کو آج تک نہیں

بھولے۔ آپ سے ووٹ لے کر میں نے آپ کی تھوڑی سی خدمت کی تھی۔ اس وجہ سے آپ لوگ میرے اس لگاؤ پر بھروسہ کرتے ہیں جو مجھے آپ سے ہے۔ آپ نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے آپ لوگوں کو اپنے خیالوں میں، اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہے۔ میں نے اپنے وطن، اپنی مٹی اور مظفر گڑھ کے عوام کے لیے آنسو بہائے ہیں۔ آج میں اپنی والدہ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر عہد کرتا ہوں۔ میں واپس آؤں گا۔ میں آپ لوگوں کے پاس واپس آنے کے لیے جدوجہد کروں گا اور ہم سب مل کر اس بدعنوان اور استحصالی نظام کا تختہ الٹ دیں گے۔ ہم ایسا نظام تعمیر کریں گے جو آپ کی دلی امنگوں کے زیادہ مطابق ہوگا۔ آپ کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ مصطفےٰ کھر کو آپ نے بنایا ہے۔ مظفر گڑھ کی مٹی سے وفاداری کی، نمک حلالی کی مہک آتی ہے۔ میں اس مٹی کا فرزند ہوں۔ میں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔"

ہر طرف اودھم اور ہاہاکار مچ گیا۔ لوگوں کے بے قابو ہو کر سسکیاں لینے کے شور سے فضا دہل اٹھی۔ لوگ اپنے قائد کو چھونے کے لیے گتھم گتھا دوڑ پڑے۔ بہت سے ٹھوکر کھا کر گرے اور کچلے گئے۔ کتنے ہی ہاتھ التجائیہ انداز میں بلند ہوئے۔ مصطفےٰ ثابت قدمی سے وہاں کھڑا ان کی محبت کا جواب دیتا رہا۔ اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ انھیں صبر کی تلقین کی اور واپس آنے کی قسم کھائی۔ غیر موجودگی سے اس میں دراڑیں نہیں پڑی تھیں۔ عوام کو اب بھی یقین تھا کہ وہ مسیحائی طاقتوں کا مالک ہے۔ اب وہ قید خانے لوٹ کر اپنا وقت آنے کا انتظار کر سکتا تھا۔ عوام بھی اس کے منتظر رہیں گے۔ وہ کسی کراماتی آندھی کی طرح آئے گا اور انھیں اور ان کی امنگوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔

اس غل مچاتے ہجوم میں کہیں فوج کا کوئی مخبر بھی ہوگا کہ وہ ہر جگہ ہی موجود ہوتا ہے۔ اس دن کے واقعات کے بارے میں اس کی رپورٹ فوجیوں کو بری کھٹکی ہوگی۔ تین دن بعد مصطفےٰ کو اپنی والدہ کے قلوں پر آنے کی اجازت نہ مل سکی۔ مصطفےٰ نے جس طرح والدہ کی موت سے فائدہ اٹھا کر اپنا رنگ جمایا تھا اس پر اس کے بھائی بہت پریشان تھے۔ "میں سیاست داں ہوں۔ تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ تم سیاست کو میری ذات سے الگ تھلگ نہیں کر سکتے۔ چاہے میں کچھ بھی کروں، چاہے کہیں بھی جاؤں لوگوں کا رویہ میرے حق میں ویسا ہی رہے گا جیسا آج تھا۔"

جب ہم کار میں ملتان لوٹے تو میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کو قرار آ گیا ہے۔ عوام کی تلون مزاجی کے بارے میں اگر اس کے دل میں کچھ خدشات تھے تو وہ رفع دفع ہو چکے تھے۔ اس واقع کی یاد قید خانے میں اس کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے کافی

تھی۔ جب بھی اسے ذہنی طور پر کوئی پریشانی لاحق ہوگی تو عوام کے ہر طرف سے اس کے گرد جمع ہونے کے مناظر اسے سہارا دیتے رہیں گے۔ قید خانے کی دیواریں اس خوشی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں گی۔

مصطفےٰ اب زیادہ دھیمے اور سلجھے ہوئے مزاج کا آدمی بن چکا تھا۔ جن حالات سے اس کا واسطہ پڑا تھا ان کی وجہ سے اس کے تکبر میں کمی آ گئی تھی۔ اب وہ اپنی غلطیاں اور سیاسی حماقتیں گناتے ہوئے ذرا نہ ہچکچاتا۔ وہ خدا کے قہر سے ڈرتا تھا۔ اس کا سچ مچ یہ خیال تھا کہ جن آزمائشوں اور صعوبتوں سے اسے گزرنا پڑا تھا وہ سب اس کے تکبر کا نتیجہ تھیں۔ "پتہ ہے جب میں گورنر تھا تو میں نے ایک جلسۂ عام میں محمد خان ڈاکو کے بارے میں کہا تھا: 'میں اس پر اپنی گرفت اتنی سخت کر دوں گا کہ اسے پنجاب میں کہیں تنکے بھر ٹھکانا نہ مل سکے گا۔ خدا نے مجھے غرور کی سزا دی۔ پہلے مجھے دیس نکالا ملا اور واپس آیا تو اس دڑبے میں بند کر دیا گیا"۔

اسے پتہ تھا کہ وہ سخت گیر اور بے درد مشہور ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اب اس کے بارے میں اور طرح سوچیں۔ وہ لوگوں پر حکم چلانے کا خواہاں نہ رہا تھا، ان کی خدمت کرنے کا متمنی ہو گیا تھا۔ اس کے مزاج میں یہ تبدیلی میرے مشاہدے میں آئی۔ لگتا تھا کہ قید خانے میں جو عرصہ بسر کرنا پڑا اس کی وجہ سے اس نے اپنے ماضی کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی ذات سے ورثے میں ملی ان تمام خواہشوں کو دور کر دینا چاہتا تھا جن سے اس کا جاگیردارانہ کردار تعمیر ہوا تھا۔

خدا کی طرف سے اسے طاقت کے اس سرچشمے کی ایک جھلک اور دیکھنے کا موقع ملا، اس سرچشمے کی جو اس کے حکم کا منتظر تھا۔ اس کا بھائی غلام غازی کھر اچانک فوت ہو گیا۔ ابھی میں جنازے میں شرکت کے لیے اسے پیرول پر چھڑانے کی جان توڑ کوشش کر رہی تھی کہ مصطفےٰ کو بتایا گیا کہ جنرل ضیاء اسے غلام غازی کی آخری رسوم میں شریک ہونے کی اجازت دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ جنازہ اٹھنے کا وقت چوں کہ سر پر آ گیا تھا اس لیے جنرل نے از راہ کرم مصطفےٰ کو آرمی چیف کا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ مصطفےٰ کے نزدیک یہ گویا کوئی بڑی بات ہی نہ تھی۔ اسے پتہ چلا کہ میں ابھی لاہور میں ہوں۔ اسے ہوائی اڈے لے جایا گیا جہاں اس نے بڑے اطمینان سے اپنے نگران کو ہدایت دی کہ طیارے کا رخ لاہور کی طرف موڑ دیا جائے۔ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ملتان جانا چاہتا تھا۔ "میں تہمینہ کے بغیر جنازے پر نہیں جا سکتا۔ اسے لینے کے لیے لاہور جانا ہی پڑے گا۔" حکام نے اس کا مطالبہ مان لیا۔

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ بطور قیدی مصطفےٰ کو جو خصوصی مرتبہ حاصل تھا وہ میرے لیے

ہمیشہ حیرت کا باعث رہا۔ وہ اس وقت پرانے دنوں کا مصطفےٰ لگا، وہی ذاتی طیارہ، وہی تمام سہولتیں، طیارے پر سوار ہوتے وقت مجھے عجیب انداز میں محسوس ہوا کہ جو کچھ کبھی دیکھا تھا شاید اسی کو دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔

مصطفےٰ اس موت سے واضح طور پر دہل کر رہ گیا۔ غلام غازی مقبول سیاست داں اور قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ مصطفےٰ اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ اس وجہ سے پریشان تھا کہ موت نے اب اس کی نسل کے افراد پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ "میں نے اللہ کے حضور میں بڑی التجا کی ہے کہ مجھے تونسہ شریف میں اپنے پیر صاحب کے مزار کی زیارت کا موقع نصیب ہو جائے۔ جانے مجھے وہاں سے بلاوا کب آئے گا؟"

ملتان پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ جنازہ تو جا بھی چکا۔ غلام غازی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے تونسہ شریف میں دفنایا جائے! مصطفےٰ سجدے میں گر گیا۔ جس معجزے کے لیے اس نے دعائیں مانگی تھیں وہ ظہور میں آ چکا تھا۔

ہم کار میں تونسہ شریف پہنچے۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس سے پہلے کسی بے پردہ عورت نے اس مقدس شہر میں قدم رکھا ہو۔ مصطفےٰ نے روایت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ بس اتنی رعایت برتی کہ مجھ سے کار ہی میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں کار سے نہ اتری۔

سائرن بجنے کی آوازیں سن کر ہجوم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ لوگ سیلاب کی طرح امڈے چلے آئے۔ لگتا تھا ہماری کار ان کے ریلے کی تاب نہ لا سکے گی۔ مصطفےٰ ہجوم میں غائب ہو گیا۔ میں نے جنازے کو ایک سسکیاں بھرتے، جذباتی طور پر بے چین، موج در موج ہجوم کے دوش پر جاتے دیکھا۔ ایک طرف ایک اور گھر کو دفنایا جا رہا تھا۔ دوسری جانب ان کا قائد، قید میں ہوتے ہوئے بھی، ان کے درمیان تھا۔ یہ سرشاری اور غم کا عجیب ملاپ تھا۔

موت اور وصال، میں نے سوچا، صوفیاء ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر ولی اللہ کی موت پر جشن منایا جانا چاہیے کیوں کہ وہ اس کی روح کے ذاتِ سرمدی سے واصل ہونے کا لمحہ ہوتا ہے۔ صوفی پیر کی وفات پر برپا ہونے والا جشن "عرس" کہلاتا ہے جس کے لفظی معنی شادی ہیں۔ کار میں بیٹھے بیٹھے، اپنے شوہر کے گرد جمع جنونی ہجوم کو دیکھتے وقت، میری سمجھ میں آیا کہ صوفیاء کے عشق میں اتنی شدت کیوں ہوتی ہے۔ آگہی کے اس لمحے کا بدیہی پس منظر تونسہ شریف ہی کو ہونا چاہیے تھا۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا۔

ہم اسی دن لوٹ آئے۔ مصطفےٰ کے اس خیال کو بہت زیادہ تقویت پہنچی کہ تقدیر

واضح طور پر اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ مافوق الفطرت قوتیں اب اس کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ ان کسانوں کی طرف سے ملنے والی محبت کی وجہ سے، جو اس کے عمل دخل کے بغیر کسی تبدیلی کی امید کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اس کے دل میں دوبارہ یہ احساس جاگا کہ قدرت اس پر مہربان ہے۔

بعض دوسری طرح کے میل ملاپ کی تجدید بھی اتنی ہی متاثر کن تھی۔ میرے ذمے چار بچوں کی نگہداشت تھی۔ ابھی وہ کمسن تھے اور انھیں یہ سمجھانا مشکل تھا کہ ان کے والد کو کیوں قید کیا گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے ہم جماعتوں کے طعنوں کا کس طرح جواب دیں۔ میں نے انھیں بتانے کی مقدور بھر کوشش کی کہ ایک مجرم میں اور ایسے شخص میں فرق ہوتا ہے جسے اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر جیل میں ڈالا گیا ہو۔ میں نے نیکی و بدی کی کائناتی کشمکش کی تصویر ان کے سامنے کھینچی جیسے ان کا باپ خیر مجسم بنا ہوا شیطانی ظلمت سے برسرپیکار ہو۔ میری بیٹیوں کو اس مسئلے کی سیاسی جہت کی واضح طور پر زیادہ سمجھ بوجھ تھی لیکن ان کے لیے اپنی سہیلیوں کو، جو غیر سیاسی، بورژوا اور جاگیردارانہ پس منظر سے تعلق رکھتی تھیں، یہ سمجھانا دقت سے خالی نہ تھا کہ ان کے باپ کو صرف مارشل لا کی مخالفت کرنے پر قید رکھا جا رہا ہے۔ میرا بیٹا علی، جو آٹھ سال کا تھا، کئی بار اپنے ساتھیوں سے ہاتھا پائی کر چکا تھا۔ وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ اس کا باپ اچھا آدمی ہے، بدمعاش نہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ ان کے لیے دل چسپیوں سے بھرا تھا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ بچے ہر طرح کے حالات اور کیفیات سے مطابقت پیدا کرنے کی پُراسرار صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی کرنے سے قاصر ہوں کہ جو چرکے انھیں لگنے تھے آنے والے دنوں میں ان سے کتنے مندمل ہو سکیں گے۔

ننھا حمزہ ہمیشہ بوکھلایا رہتا۔ جب مصطفےٰ کو جیل ہوئی تو وہ صرف آٹھ ماہ کا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اس کا باپ "بڑا آدمی" ہے جو کسی ناقابلِ فہم وجہ سے گھر نہیں آ سکتا۔ میری یہی آرزو رہی کہ کسی طرح اس کا ذہنی انتشار دور کر سکوں۔ مصطفےٰ ہر وقت بچوں کے بارے میں فکرمند رہتا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس رہا کریں۔ اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ خاندان ایک ساتھ رہے۔ میں بڑی باقاعدگی سے، جس میں کبھی فرق نہ آیا، بچوں کو اس سے ملانے لے جایا کرتی تھی۔

میں بچوں کے خیال سے اس کی کمی زیادہ محسوس کرتی تھی۔ انھیں باپ کی ضرورت تھی جس کے حوالے سے وہ اپنی شناخت مکمل کریں۔ جسے پیار کر سکیں۔ میں نے ان کے دل میں یہ بات کبھی نہیں بیٹھنے دی کہ ان کا باپ کسی اعتبار سے بے بس

ہے۔ یہ بات نفسیاتی طور پر بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ انہیں اس کی سب پر چھا جانے والی موجودگی یاد تھی۔ اس کی شخصیت اور حیثیت میں کسی طرح کی کمزوری یا کمی سے عہدہ برا ہونا ان کے لیے ہمیشہ کے واسطے مشکل ہو جاتا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے واقعات سنا کر اس کی شخصیت کی عظمت کو اجاگر کیا۔ میں نے اپنے کردار کو گھٹا کر پیش کیا کیوں کہ میں خود کو ایسی ہستی کے روپ میں سامنے لانا نہیں چاہتی تھی جو ان کے باپ کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ انہیں کبھی اپنا باپ تحفظ کا محتاج نظر نہ آنا چاہیے تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں محض اس کی جدوجہد کو آگے بڑھا رہی ہوں اور جب وہ جیل سے باہر آ جائے گا تو ہم سب کو تحفظ دے گا۔ ان کے باپ نے آمر کے سامنے ڈٹ جانے میں جس دلیری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ بچوں کو قابلِ تحسین معلوم ہونے لگی تھی۔ ننھا حمزہ ان بڑی بڑی دیواروں کے بارے میں ہر کسی کو بتاتا جو اس کے باپ کے محل کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اور جن پر پولیس والوں کا پہرہ تھا۔ اس کی نظر میں آڈیالا جیل مصطفےٰ کا گھر تھا اور اس کا باپ شہزادہ جو پولیس کی حفاظت میں رہتا تھا۔

مصطفےٰ دور بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گھر کے ناخدا کا کردار کرتا رہتا۔ اسے ہمیشہ یہ تجسس رہتا کہ ہم کیا کھاتے پیتے ہیں اور آیا وہ کوالٹی کے لحاظ سے اچھا ہوتا ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں لاہور سے انڈے، چوزے اور پکانے کا تیل خریدنا چھوڑ دوں تو مجھے خاص حیرت ہوئی۔ کہنے لگا کہ وہ میری ضرورت کی تمام چیزیں جیل سے بھجوا دیا کرے گا۔ اس کے چھوٹے سے پولٹری فارم کی بدولت ہمارے گھر میں تازہ چوزوں اور انڈوں کا اچھا بھلا ذخیرہ ہمہ وقت موجود رہتا۔ میں اس بارے میں اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ پکانے کا تیل وہ کہاں سے حاصل کرتا تھا۔

میرے دیکھنے میں آیا کہ اس کا سیاسی طریق کار بھی ایسا بے تکا تھا کہ اس کے بارے میں پہلے سے کچھ کہنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا پروگرام قلم بند کر دے تاکہ ہم اسے پمفلٹوں کی شکل میں چھپوا کر ہر طرف پھیلا دیں۔ انہیں پڑھتے ہی معاشرے کے محروم طبقوں کے دل و دماغ میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ وہ قید خانوں پر دھاوا بول دیں گے۔ میں اس موضوع پر مصطفےٰ کو مسلسل دق کرتی رہتی لیکن اس پر میری چھیڑ چھاڑ کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کا تذبذب میری سمجھ سے باہر تھا۔ جب وہ مجھ سے گفتگو کرتا تو اپنا مفہوم ادا کرنے پر اتنا قادر نظر آتا اور اس کا وژن اتنا شفاف اور روح گرما دینے والا ہوتا لیکن جب میں کہتی کہ یہ باتیں لکھ کیوں نہیں ڈالتے تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتا۔

میں جب سیاست کے حوالے سے رائے عامہ کو اپنے حق میں منظم کرنے کے لیے روپے پیسے کا ذکر کرتی تو وہ کہتا کہ مراعات یافتہ اقلیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دلیل دیتی کہ اس اقلیت نے حال ہی میں پی این اے تحریک کو روپیہ فراہم کیا تھا۔ اور تحریک بھٹو کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسے میری بات سے اتفاق نہ تھا۔ وہ کہتا کہ بھٹو کا تختہ عوام کی لاتعلقی نے الٹا تھا۔ بھٹو کی حرکتیں ایسی تھیں۔ کہ اس کے اپنے حمایتی اس سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس نے اپنے اور عوامی طاقت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر لی تھی۔ رضائے عوام روپے پیسے سے نہیں خریدی جا سکتی۔ عوام پر صرف خیالات کا اثر ہو سکتا ہے۔ "ہمارے عوام ان پڑھ ہیں۔ انہیں پمفلٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں ایسا رہنما چاہیے جو ان کے مطالبات کو الفاظ کا جامہ عطا کر سکے۔ جو ان کی ضرورتوں کا ادراک کر سکے۔ ہمیں ان میں گھل مل کر ان کے ساتھ اس زبان میں بات کرنی ہوگی جو وہ سمجھتے ہوں جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اگر وہ حرف بہ حرف لکھ ڈالوں تو اہل اقتدار میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے وہی میرے لکھے پر چونکیں گے اور اس کا نوٹس لیں گے۔ میں انہیں پہلے سے خبردار کیوں کروں؟ میں کالموں اور انہوں کے حساب سے ان پر حملہ آور ہونا نہیں چاہتا۔ میں میدانِ عمل میں اتر کر ان سے ٹکراؤں گا۔"

میں ان طاقتوں کا اندازہ لگا سکتی تھی جن کا اس کے خلاف صف آرا ہونا یقینی تھا۔ وہ روس دوست، فوج دشمن، جاگیردار دشمن، صنعت کار دشمن اور افسر شاہی کی بدعنوانیوں کے خلاف تھا۔ اقتدار پر فائز طاقتوں کو سوشلسٹ مصلح کبھی قبول نہ ہو سکتا تھا۔ غالباً کسی قسم کے پروگرام کی تشکیل کرنا اور اسے عوام میں پھیلانا ابھی قبل از وقت تھا۔ تبدیلی لانے کا بلیو پرنٹ مصطفےٰ کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ کبھی کبھار اس کی بس جھلک دکھا دیتا تھا پروگرام کی تفصیلات ظاہر کرنے کا وقت تب آئے گا جب سیاسی مہم آرائی شروع ہوگی اور وہ ان فوجیوں کی کمان سنبھال لے گا جو اس کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ اس کی فوج کو صدیوں کے ظلم و ستم نے جنم دیا تھا۔ وہ اس کے گرد اکٹھے ہو کر انقلاب دشمن طاقتوں سے جنگ کریں گے۔ اس کی مبہم اور بے ربط سیاسی سوچ بکار محض پُر فریب ڈھول تھی جسے وہ رجعت پسند طاقتوں کی آنکھوں میں جھونکنا چاہتا تھا تاکہ وہ مطمئن ہو کر بیٹھی رہیں اور جب مصطفےٰ اچانک حملہ آور ہو تو ان کے چھکے چھوٹ جائیں۔

مصطفےٰ نے ایک بار اور، جیل سے پیرول پر رہا ہو کر ہمیں بوکھلا دیا۔ عبدالرحمن کی شادی ہونے والی تھی جو اس کی پہلی بیوی کی اولاد تھا۔ شادی سے ایک دن پہلے اسلام

آباد پر موت کی بارش ہونے لگی۔ اوجھڑی کیمپ میں گولا بارود کے ذخائر کو آگ لگ گئی جہاں میزائلوں، بموں اور ہتھیاروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس نیم خفیہ ذخیرے سے افغان مجاہدین کو چوری چھپے ہتھیار فراہم کرنے کے عارضی مرکز کا کام لیا جا رہا تھا۔ کیمپ میں دھماکے سے میزائل چالو ہو گئے اور اڑ اڑ کر ہر طرف برسنے لگے۔ سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ کوئی شخص محفوظ نہ رہا۔ دارالحکومت میں کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ انتہائی بھیانک قسم کی اندھا دھند خونریزی تھی۔ لوگ میزائلوں اور بموں کے پرخچوں سے جان بچانے کے لیے ہر طرف بھاگے جا رہے تھے۔ دھماکے کئی دن جاری رہے اور دھماکوں کی طرح اس بارے میں افواہیں بھی پھیلتی رہیں کہ یہ المیہ کیوں اور کیسے رونما ہوا۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں اوجھڑی کیمپ کا سانحہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور حکومت کے خاتمے کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ دھچکا اسے ایسا لگا جس کے بعد وہ سنبھل ہی نہ پایا۔ اس تباہی کے بعد ضیاء نے جو قدم بھی اٹھایا اس کا نتیجہ غلط نکلا۔

مصطفےٰ نے اس صورت حال کو بھانپ لیا۔ وہ بیٹے کی شادی میں شرکت کے بہانے چوبیس گھنٹے کے لیے پیرول پر قید خانے سے باہر آیا۔ ہم اسے لینے لاہور کے ہوائی اڈے پر گئے جہاں لگتا تھا کہ حفاظتی عملے کا ہر فرد حاضر ہے۔ ہم کاروں کے جلوس میں اس طرح گھر آئے کہ سائرن بج رہے تھے۔ اور مسلح پولیس والے ٹرکوں میں ساتھ ساتھ تھے مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب مصطفےٰ گورنر تھا اور یہی حفاظتی عملہ شہر میں اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عملے کے افراد اب صرف اس لیے ساتھ لگے ہوئے تھے کہ وہ فرار نہ ہونے پائے۔

میں نے گھر پر اخباری کانفرنس کا انتظام کیا۔ وہ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے اخباروں کے مدیروں سے ملا۔ اس روز جو لوگ اس سے ملنے آئے ان میں مجید نظامی کے علاوہ صحافیوں کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے دو مدیر، عارف نظامی اور شکیل الرحمن بھی شامل تھے۔ مصطفےٰ نے اسی روز نوابزادہ نصراللہ خان، معراج خالد، راؤ رشید اور شاعر حبیب جالب سے بھی ملاقات کی۔

شام کی مصروفیات شادی کی رسومات کے لیے وقف تھیں۔ مصطفےٰ نے یہ کہہ کر ہمارے ہوش اڑا دیے کہ اوجھڑی کیمپ کے المیے کے پیش نظر شادی کا ملتوی کیا جانا ضروری ہے۔ اس کی نجی زندگی کو اس کی سیاست سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سب عجب شش و پنج میں پڑ گئے۔ دلہن والوں نے بڑے زبردست انتظامات کر رکھے تھے۔ شامیانے لگ چکے تھے۔ دلہن شاہانہ جوڑا زیب تن کر چکی تھی۔ نازک رنگین

قمقمے جل رہے تھے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

عبدالرحمن کی پریشانی قابل فہم تھی۔ باپ کے اس فیصلے پر وہ بہت گڑ بڑایا۔ مصطفےٰ اور میں لڑکی والوں کے گھر گئے۔ اس نے انہیں سمجھایا کہ شادی کن وجوہ پر ملتوی کی جا رہی ہے۔ ان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ہم نے زیوروں سے لدی پھندی، فرمائی شرمائی دلہن سے بات کی۔ مصطفےٰ نے اسے سمجھایا کہ ایسے موقع پر جب قوم ایک المیے سے دوچار ہے خوشیاں منانا ٹھیک نہیں بدنامی کا یہ داغ اس پر لگ گیا تو کبھی اتر نہ سکے گا۔ اور نہ وہ اپنے پیروکاروں کے سامنے شادی کا کوئی معقول جواز پیش نہ کر سکے گا۔ مصطفےٰ نے لڑکی کو بتایا کہ وہ کسی عام سے خاندان میں بیاہی نہیں جا رہی۔ "میں سیاست داں ہوں، لوگوں کی طرف سے مجھ پر ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر یہ شادی ایسے نامبارک دن ہوئی تو میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔

اپنا مدعا بیان کر کے وہ رخصت ہوا۔ اب وہ کوئی بڑی غلطی کرنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد سے غلطیوں پر غلطیاں کرنے کا سارا ٹھیکا ضیا نے لے لیا۔ مصطفےٰ کے عالی ظرفانہ فیصلے پر اخباروں اور رسالوں میں بڑی واہ واہ ہوئی۔ اس نے سیاست کو اپنی ذات سے زیادہ اہم جانا تھا۔

اور آخر کار لوگ اب اس سیاست دان کا استقبال کرنے ہجوم در ہجوم قید خانے کے دروازے کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ زمانے کی دھند چھائی بھی اور چھٹ بھی گئی۔ اور آزادی کی دنیا میں اس کی آمد کا ڈنکا بجانے کے لیے ہمارے ارد گرد لوگ ناچتے رہے، گاتے رہے۔ میں نے کار کی کھڑکی میں اپنے عکس پر نظر ڈالی۔ یہ کون ہے جس نے سفید پوشاک پہن رکھی ہے؟ کیا یہ واقعی میں ہوں؟ میں اپنی ذات میں موجود تمام تضادات سے دست و گریبان ہونے کے بعد ان میں سے بہت سوں کو ٹھکانے لگا چکی تھی۔

مجھ پر کہ میں برس ہا برس سے ایک نئی دنیا سے دوچار چلی آ رہی تھی اس طرح کا اثر پڑنا ہی تھا۔ میں نے اس تمام ٹیپ ٹاپ کو تج دیا جو معزز اور باعزت نظر آنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مجھے بدل ڈالنے میں مصطفےٰ کا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنے قول و فعل کی مدد سے مجھے سنجیدہ شخصیت بنا دیا جسے اپنے مشن کا شعور ہو۔ میں نے اپنے قیمتی ملبوسات، جو معروف ڈیزائن کاروں کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔ صندوقوں میں بند کر دیے اور اپنی خودنمائی اور آراہٹ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ارمانی اور ورسیس اور کیلون نو اور اسی لیے میا کو جیسے فیشن ڈیزائنرز کا تعلق بمبورے، خوبصورت لوگوں سے تھا۔ میں

اب اور ہی طبقے کی فرد تھی، اس طبقے کی جو سوچ بچار کا عادی ہے اور اپنے فیصلے شعوری طور پر کرتا ہے، جو اس کا قائل نہیں کہ امیری غریبی اتفاق کا نتیجہ ہے (یعنی امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تو امیر ہو گئے، غریب گھرانے میں جنم لیا تو غریب ہی رہے)۔ جو اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے میرا تعلق ان لوگوں سے تھا جو کچھ بن سکتے تھے اور نہ بن پائے"۔ میں پہلے ہر وقت یہی چاہتی رہتی تھی کہ یہ بھی مل جائے، وہ بھی ہاتھ آ جائے اب مجھے اپنی اس سرشت پر شرم آنے لگی۔ میرے وارڈ روب میں موجود ڈھیر ساری چیزیں میری ضروریات سے کہیں زیادہ تھیں۔ اور بھی شرم ناک یہ کہ میرے پاس جوتوں کے بے شمار جوڑے تھے، اتنے کہ انھیں دیکھ کر مارکوس میاں بیوی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک دن مجھ میں کوئی چیز چٹ سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میرے نفیس وضع کے، لباس کے ہم رنگ دستی بیگ اب خالی رہا کریں گے۔ اب میں لباس کے حوالے سے بننے ٹھننے کی زحمت اٹھانے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ رنگ اب بھی میرا دل لبھاتے تھے لیکن صرف اسی وقت جب وہ میرے بدن پر نہ سجے ہوں۔ میں نے مصطفےٰ سے مل کر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اسے قطعاً کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے مجھ سے اسی بات کی توقع تھی۔ وہی مجھے اس راستے پر لے آیا تھا۔ اس نے فخر سے میرے فیصلے پر صاد کیا۔ میں نے طے کر لیا کہ آئندہ سے صرف سفید سوتی رنگ کے کپڑے پہنا کروں گی۔

مصطفےٰ کے ردعمل پر مجھے تعجب نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ چاہتا تھا کہ میں اپنا روپ بدل لوں لیکن جانتا تھا کہ اگر مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا تو میں بغاوت کر دوں گی۔ تبدیلی خود میرے اندر آنی چاہیے تھی۔ ایسا ہی ہوا۔ مجھے ذرا بھی دکھ نہ پہنچا بلکہ ایسا لگا جیسے مجھ پر سے کوئی بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اس معاملے کا کوئی علامتی پہلو نہ تھا۔ بلکہ یہ اپنے آپ کو خود دریافت کرنے کے طویل اور تکلیف دہ عمل کا نقطۂ انجام تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں جڑاؤ زیورات اور جواہرات پہننا چھوڑ دوں گی۔ میں نے پلٹ کر اس ماحول کی طرف دیکھا جس میں میری جڑیں پیوستہ تھیں۔ میں نے اپنے لیے چاندی پسند کی کیونکہ غریب سے غریب عورت بھی چاندی کی بنی چیزیں پہنتی ہے۔ میں نے جواہرات اور سونے کو ٹھکرا دیا کیوں کہ وہ ایک ایسے ماضی کی یادگار تھے جس سے میں قطع تعلق کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔ میری شبیہ آہستہ آہستہ غائب ہو گئی۔ لوگوں کو خوشیاں مناتے سنا جا سکتا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں بھنگڑا ڈال رہی تھیں۔ ڈھول کی تھاپ زیادہ سے زیادہ جنون خیز ہوتی گئی۔ مصطفےٰ ان کے سامنے آ پہنچا تھا۔

فضا پر امید کا سایہ تھا۔ جیسے اچھا وقت آنے کو ہو۔ پاکستان بھر سے اس کے دوست اور ساتھی آ کر اکٹھے ہوئے تھے۔ آمر کے قہر و غضب نے ان کی وفاداریوں کا امتحان لیا تھا۔ آج ان کے اور مصطفےٰ کے عزم کی جیت کا دن تھا۔ ان میں سے بہت سوں نے جیل کی ہوا کھائی تھی انھیں عذاب دیا گیا تھا اور کوڑے مارے گئے تھے۔ آزمائش کی تاریک ترین گھڑیوں میں انھوں نے اسی لمحے کا خواب دیکھا تھا۔ آج ان کا خواب حقیقت بن چکا تھا۔

ہم اڈیالا جیل سے پجیرو میں روانہ ہوئے جو رسوخ اور امارت کی نئی علامت تھی۔ جب مصطفےٰ ہاتھ ہلا ہلا کر ہجوم کی داد و تحسین کا جواب دے رہا تھا تو میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ ہم دونوں اس تاریخی لمحے میں برابر شریک تھے۔ ہجوم ڈھول کے آہنگ پر ناچتا رہا۔ آخر کار ہم آزاد تھے۔ چاروں بچے میرے ساتھ تھے۔ پریوں کی کہانی نے اچانک حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ہجوم کس طرح ان کے باپ کے ہر ہر اشارے کا جواب دے رہا ہے۔ ہجوم کی طرف سے اس طرح کی دیوانہ وار شیفتگی صرف کسی پوپ کنسرٹ ہی میں دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ بچوں کی نظر میں مصطفےٰ "سٹار" بن چکا تھا۔

مجمع ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ وقفے وقفے سے رک کر لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑتا تھا۔ بوڑھے بوڑھے لوگ ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے آتے۔ اس کے ہاتھ چومتے، چہرے کو چھوتے اور روتے رہتے۔ ان کے چہروں پر جھریاں نہ تھیں۔ لگتا تھا غم نے بہنے کے لیے نہریں بنائی ہیں انھیں مصطفےٰ سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ اسے معلوم ہے وہ کس لیے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ آنسو ہی کافی تھے۔ ان کی کہانی آنسوؤں کی زبانی بیان ہوتی رہی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہ سڑک تھی جس پر میں نے بارہا سفر کیا تھا۔ اور میرا اس قدر باقاعدگی سے آنا جانا اتنا بے رنگ اور بیزار کن ہوا کرتا تھا۔ وہی سڑک آج نئی امید کا استعارہ معلوم ہو رہی تھی۔

ہم اسلام آباد میں مسٹر صدیق بٹ کے گھر کی طرف جا رہے تھے جو مصطفےٰ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جتنی دیر مصطفےٰ اڈیالا میں قید رہا تھا۔ ان کے گھر کو میں نے اپنے اڈے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ان کے خاندان کی طرف سے مجھے ڈھیروں محبت ملی تھی۔ اس دن کے واقعات سے واضح طور پر بے حال ہو کر مصطفےٰ نے مجھ سے کہا: "تہمینہ، تمھیں پتہ ہی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہ دیتیں تو آج میں یہاں نہ ہوتا"۔

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ یہی بات مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔

اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا اور صحیح وجہ سے کیا۔ مصطفےٰ نے جو کیا ٹھیک کیا لیکن غلط وجہ سے کیا۔

باب - ۲

کھر بمقابلہ کھر

(1985ء - 1986ء)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میں مصطفےٰ سے دوسرے بار علیحدہ ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے منانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کے دیکھ لیا۔ اس نے اپنی چرب زبانی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جن لوگوں نے سارے معاملے کو بہت قریب سے دیکھا تھا اس نے انہیں باور کرا دیا کہ حقیقت کچھ اور تھی۔ ہم سب کو جو فریبِ نظر میں مبتلا تھے نظر کچھ اور آ رہی تھی۔ سچ وہی تھا جو مصطفےٰ کی زبان پر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ مصطفےٰ اسی قسم کی چالیں چلے گا اور میں نے بساط بھر دل کڑا کر کے خود کو اس کے سامنے ڈٹے رہنے کے لیے تیار کر لیا۔

وہ میرے دوستوں اور میرے اہل خاندان کو اپنا ہم نوا بنانے میں مصروف رہا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ خود کو بدلے گا، پچھلی زیادتیوں کی تلافی کرے گا۔ اس نے انہیں یقین دلا کر چھوڑا کہ میرا رویہ غیر حقیقت پسندانہ ہے، میں اڑیل پنے پر اتر آئی ہوں اور رائی کا پہاڑ بنا رہی ہوں۔

رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آنے لگا کہ شادی کو جو مرکزی نکتہ دوام بخشتا ہے وہ لازمی طور پر یہ نہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے سوا کبھی کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ شادی کی پائداری باہمی اعتماد اور باہمی عزت پر منحصر ہے۔ مجھے مصطفےٰ

پر جو بھروسا تھا اسے مصطفےٰ نے خود ہی ٹھیس پہنچا کر ختم کر دیا تھا۔ اب وہ میرے لیے قابلِ احترام ہستی نہ رہا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا اور اس بنا پر میرے دل میں اس کی عزت اور بھی تھوڑی ہو گئی۔

مصطفےٰ نے دل موہ لینی والی خوش خلقی سے کام لے کر میری امی کے ناز اٹھانے شروع کر دیے۔ اسے ان کی حمایت درکار تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ مجھے سہارا دینا چھوڑ دیں تو میں اس کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ وہ بڑی استادی سے ان کے ذہن میں میرے خلاف زہر گھولتا رہا۔ ان سے کہتا کہ وہ جو کچھ ان کے علم میں لا رہا ہے اسے اپنے تک ہی رکھیں۔ مجھے منا لینے کا جو تھوڑا بہت امکان ابھی موجود تھا وہ اسے بھی اپنی حرکتوں سے زک پہنچا رہا تھا۔ مجھے نظرانداز کرنا اس کی غلطی تھی۔ اگر وہ اپنی تمام توجہ براہ راست میرے ذہن پر مرکوز کیے رکھتا تو شاید بہت پہلے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

جو کچھ وہ میری امی کے بارے میں مجھ سے کہتا رہتا تھا میں کبھی اسے امی کے گوش گزار کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ انھیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ خاندان میں انھیں جو بالادستی حاصل تھی اس کے بارے میں اس کی رائے حد درجہ مکروہ تھی۔ جب کبھی میں مصطفےٰ کے سامنے ڈٹ جاتی تو وہ کہتا کہ "گھر میں ثمینہ گردی کے اس دور دورے کو ختم ہونا چاہیے" (ثمینہ میری امی کا نام ہے)۔ وہ بالکل نہ چاہتا تھا کہ میں اپنی امی جیسی بن جاؤں اور جب بھی ہم میں تو تو میں میں ہوتی وہ میری امی کو گالیاں دینے لگتا۔ وہ بڑے یقین سے کہتا کہ ہمارے خاندان کو تباہ و برباد کرنے کی تمام تر ذمے داری انھیں پر عائد ہوتی ہے۔

اس کے باوجود ان سے بات کرتے وقت وہ ان کا پورا احترام ملحوظ رکھتا اور انھیں یہ احساس دلاتا کہ وہ بہت اہم ہیں۔ ان کی انا کو تسکین پہنچاتا، انھیں ماں جی کہتا اور بتاتا کہ ان کے سوا وہ دنیا میں کسی عورت کی عزت نہیں کرتا اور یہ کہ "آپ ہی ہیں جو تہمینہ کے معاملے میں میری مدد کر سکتی ہیں"۔

جب ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو اس نے غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جتوئی صاحب مصطفےٰ کے سب سے پرانے اور سب سے قریبی دوست تھے۔ انھیں یہ سکھا پڑھا کر بھیجا گیا کہ ہمارے تعلقات کی تجدید کی شرائط طے کریں۔ میرے والد نے صورتحال کا اندازہ لگاتے ہوئے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ شادی ناکام ہو چکی ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ طلاق کی شرائط پر گفت و شنید کی جائے"۔

جتوئی صاحب نے جا کر مصطفےٰ کو مطلع کر دیا کہ مصالحت ممکن نہیں اور اب اسے طلاق کے معاملات طے کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

مصطفےٰ سمجھ گیا کہ شادی ختم ہو گئی۔ لیکن شکست قبول کرنا اس کی سرشت میں نہیں۔ اسے لگا کہ اس کی مردانہ انا خاک میں ملنے کو ہے۔ اس کے اندر جو جاگیردار چھپا بیٹھا تھا وہ ایک شیطانی منصوبہ گانٹھتا ہوا باہر نکل آیا۔

کچھ عرصہ یہ منصوبہ طاق پر دھرا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری طرف سے کچھ اور اشارے ایسے مل جائیں جن سے ظاہر ہو کہ کوئی امید باقی نہیں رہی تو پھر وہ عملی قدم اٹھائے۔ میں نے اسے ایک ایسا ہی اشارہ فراہم کر دیا۔

میرے گھنے بال اتنے لمبے تھے کہ گھٹنوں تک آتے تھے۔ مصطفےٰ ان پر دیوانہ وار فدا تھا۔ وہ جاڑوں میں مجھے آگ کی طرف پیٹھ کر کے کبھی نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس طرح میرے بالوں پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ وہ قطعاً نہ چاہتا تھا کہ انھیں ذرا سا بھی کٹوایا جائے اور اس نے متعدد بار مجھ سے وعدہ لیا کہ میں نہ تو انھیں کبھی کٹواؤں گی نہ گندھواؤں گی۔ میرے بالوں پر وہ دل و جان سے گرویدہ تھا۔

ایک صبح آنکھ کھلتے ہی میرے دل میں یہ عجیب خواہش بیدار ہوئی کہ مجھے اپنے بالوں سے، جن پر وہ فریفتہ تھا، چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ میں نے ایک ہیئرڈریسر کے پاس جا کر کہا کہ ان کی ایسی تیسی کر دو۔ بیچارے ہیئرڈریسر نے مجھے باز رکھنے کی بہتیری کوشش کی۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اپنا سر جھٹکتا رہا۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ مجھے اپنے بالوں سے پیار تھا۔ چودہ سال کی ہونے کے بعد میں نے انھیں ایک بار بھی نہیں کٹوایا تھا۔ لیکن جب ان پر قینچی چلنی شروع ہوئی تو مجھے لگا کہ مصطفےٰ کا بھاری دباؤ دور ہٹتا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بال نہیں کٹ رہے بلکہ بدروح اتارنے کا کوئی عمل جاری ہے۔ اب میں اس کی خبیث روح کے حصار سے باہر نکل آئی تھی۔

جب مصطفےٰ تک یہ خبر پہنچی کہ میں نے بال کٹوا دیے ہیں اور وہ گھٹنوں تک آنے کے بجائے صرف کندھوں تک رہ گئے ہیں تو وہ میری اس حرکت کی معنویت سمجھ گیا۔ میرا یہ فعل یقیناً ہماری شادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔ میرے بالوں کے بغیر مصطفےٰ پر کسی ناتواں سیمسن کا گمان ہوتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ میں اس کی گرفت سے نکلی جا رہی ہوں۔ اسے کچھ کرنا پڑے گا اور وہ بھی ڈرامائی انداز میں۔ اسے مجھ پر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔ اس نے دوبارہ ڈرائنگ بورڈ کا رخ کیا اور مجھے منانے کی اپنی

زبردست سکیم کی نوک پلک کو آخری بار سنوارا۔

میرے بچے ان دنوں میرے ساتھ میری والدہ کے ہاں رہتے تھے۔ میں نے انہیں عدالت کی سرپرستی میں دے رکھا تھا۔ یہ کارروائی مصطفےٰ کے کردار کے پیش نظر ناگزیر ہو گئی تھی۔ میں بچوں کی حد تک اب اس پر اعتبار نہ کر سکتی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ بچوں کو باپ سے ملتے تو رہنا چاہیے لیکن اس طرح کہ انہیں قانونی تحفظ حاصل رہے۔ اسے اتنی اجازت ملی تھی کہ وہ ہر اتوار انہیں گھمانے پھرانے لے جا سکتا ہے۔ بچوں اور باپ کی ملاقات کے اوقات متعین کر دیے گئے تھے۔ وہ تینوں بڑے بچوں کو صبح لے جا سکتا تھا اور انہیں اسی شام گھر پہنچانا ضروری تھا۔

عید سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ مصطفےٰ اور بچوں نے لورپول میں ایک تفریحی پارک جانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ بچوں پر بڑا جوش طاری تھا۔ مصطفےٰ آیا۔ اس نے بچوں اور میری والدہ کے ملازموں کو عیدی دی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے بھی عیدی بھجوائی۔ اس بات نے میرے دل پر اثر کیا۔ حالات نے جو کروٹ لی تھی اس کا مجھے غم تھا۔ میں اس کے ساتھ ہمدردی کر سکتی تھی۔ میں نے ذہن ہی ذہن میں اس کی تصویر بنائی کہ وہ ایک لٹاپٹا آدمی ہے جو جلاوطنی میں تن تنہا ناسامد حالات سے نبرد آزما ہے۔ اس نے بچوں کو کار میں لادا اور تفریحی پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے توقع تھی کہ بچے اسی شام ساڑھے چھ بجے تک گھر آ جائیں گے۔ کوئی ساڑھے سات کے قریب مجھ پر پہلی دفعہ گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ بچے ابھی تک گھر نہ لوٹے تھے۔ میں نے مصطفےٰ کے ایک دوست کو فون کیا تو مجھے بتایا گیا کہ مصطفےٰ اور بچے دیہات کی طرف نکل گئے ہیں۔ وہ صرف اڑتی اڑتی سی بعض تفصیلات بتا سکا اور میرے قدرے بڑبڑائے ہوئے اعصاب کو تسلی نہ دے پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کوئی بری خبر آنے کو ہے۔

کوئی آٹھ بجے فون بجا۔ میں اچھل کر فون کی طرف لپکی۔ مصطفےٰ بول رہا تھا۔ کہنے لگا کہ واپس آتے ہوئے کار ہائی وے پر خراب ہو گئی تھی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کار ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا، میل بھر پیدل چل کر ایک فون بوتھ تک پہنچا تھا اور مجھے اس لیے فون کر رہا تھا کہ میں زیادہ نہ گھبراؤں۔

میرا پہلا ردعمل یہ تھا: "بچے کہاں ہیں؟" "میں ابھی ہائی وے سے آ رہا ہوں۔ انہیں سڑک کنارے بنی ایک ان میں چھوڑ آیا ہوں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بس ذرا تھکے ہوئے اور نندائے ہیں۔ اس وقت وہ ڈنر کھا رہے ہیں۔" "تم نے تو ابھی کہا تھا کہ میل بھر چل کے آئے ہو۔ کہاں سے میل بھر چل کے آئے ہو؟" "کار سے، تہمینہ۔

لیکن کیوں؟ کیا ان میں ٹیلی فون نہیں ہے؟" "یہ بالکل ناقابل یقین بات تھی۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی من گھڑت لگتی تھی۔ "نہیں۔ وہاں پہ فون نہیں ہے"۔ "یہ میں کیسے مان لوں۔ یہ انگلستان ہے، پاکستان کا کوئی دور افتادہ اجڑا پجڑا علاقہ نہیں"۔ "وہاں پہ ٹیلی فون نہیں ہے" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں بچوں میں سے کسی سے بات کر سکتی ہوں؟" "نہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ انھوں نے آج خوب مزے کیے۔ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ مجھے میل بھر واپس جانا اور پھر انہیں لے کر یہاں آنا پڑے گا۔ اب اتنی مصیبت کون اٹھائے۔ چین سے بیٹھو۔ بچے بالکل ٹھیک ہیں۔ سنو اب واپس جا کے دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں تقریباً گھنٹے بھر میں فون کروں گا"۔

فون بند ہو گیا۔ میں بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ اسے کیا سوجھی ہے؟ وہ یہ آنکھ مچولی کیوں کھیل رہا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو؟ میں نے جان بوجھ کر کوئی برا خیال دل میں نہ آنے دیا۔

ساڑھے نو بجے رات۔ فون کی جھنکار نے میرے دکھتے ہوئے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مصطفےٰ دوبارہ بات کر رہا تھا۔ لہجہ بالکل پرسکون، دل جمعی سے بھرپور۔ "بچے گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں پیدل چل کر واپس تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ پریشان مت ہو۔ انہیں اتنی دور ساتھ پیدل لے کر آنا مشکل تھا"۔ "تم ٹھیک کہاں ہو، مصطفےٰ؟ میں کار بھجوائے دیتی ہوں۔" اس نے بتایا کہ وہ ایم پندرہ یا ایسی ہی کسی سڑک پر ہے اور کہا کہ کار بھیجنے کی زحمت نہ کروں۔ وہ کار ٹھیک کرا کے جلد ہی گھر پہنچ جائے گا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ صورتحال مجھ پر عیاں ہو چلی تھی۔

میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے ایک دوست کو فون کیا کہ آیا ایم پندرہ کے راستے میں تفریحی پارک آتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے برعکس، یہ سڑک بالکل ہی مختلف سمت میں جاتی ہے۔ میں نے سوچا، مصطفےٰ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ بچے اس کے پاس ہیں۔ مجھ پر اب مکمل سراسیمگی غالب آ چکی تھی۔ ڈرا دینے والے خیالات موج در موج میرے ذہن پر وار کر رہے تھے۔ میں بیٹھ گئی۔ خوب گہرا سانس لو۔ سوچو، تہمینہ، سوچو۔

ساڑھے گیارہ بجے رات۔ مصطفےٰ کی طرف سے کوئی فون نہیں۔ ہمارے درمیان اب تک جو بات چیت ہوئی تھی میں نے اس پر اچھی طرح غور کیا۔ کوئی عجیب چکر چلایا جا رہا تھا۔ حالات پر مصطفےٰ کو ضرورت سے زیادہ کنٹرول حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے لہجے سے اطمینان سا جھلکتا تھا۔

اس نے پھر فون کیا۔ اس بار میں نے امی سے اس کی بات کرائی۔ وہ انتہائی پُراعتماد تھا اور اس کی باتیں قائل کر دینے والی تھیں۔ اس نے میرے خدشات کو اعصاب زدگی کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس نے امی کو بتایا کہ بچے بالکل خیریت سے ہیں۔ کار خراب ہونے کی پوری وجہ بڑی تفصیل سے انہیں سمجھائی۔ موقع محل کے لحاظ سے کہانی اس نے خوب گھڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح گھڑی تھی۔ وہ یہ سارا کھیل اس لیے کر رہا تھا کہ اسے کچھ مہلت مل جائے۔ وہ کرنا کیا چاہتا ہے؟

اس نے اپنی کہانی کو زیادہ قابلِ یقین بنانے کے لیے اس میں کئی پھندنے لگانے شروع کیے۔ "میں نے گھر پر ملازم سے کہہ دیا ہے کہ ہمارے لیے پائے تیار رکھے۔ میں نے اسے فون پر ہمارے انتظار کرنے کے لیے کہا ہے۔ میرا پورا ارادہ ہے کہ ڈنر کے وقت تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگر کار بگڑ گئی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

مصطفےٰ کے فون بند کرتے ہی میں نے اس کے اپارٹمنٹ فون کیا۔ کسی نے فون اٹھایا تو سہی مگر جواب نہیں دیا۔ میں نے بار بار فون کیا۔ ہر بار فون اٹھایا جاتا مگر جواب نہ ملتا۔ آخر ملازم، جس کا نام فرید تھا فون پر بولا۔ میں نے پوچھا۔ "آج تم نے پائے پکائے ہیں؟" "نہیں، بیگم صاحب۔"

میں نے ریسیور نیچے رکھ کر ذہن پر زور دیا۔ وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ وہ ہے کہاں؟ میرے بچے کہاں ہیں؟ میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اتنی مجھے خبر تھی کہ مصطفےٰ دھوکے اور فریب کا جال بننے میں مصروف ہے۔ اگلے دو گھنٹوں کے دوران کوئی فون نہ آیا۔

دو بجے رات۔ میں نے دوبارہ اپارٹمنٹ فون کیا۔ ملازم اتنا سہما ہوا تھا کہ بات ہی نہ کر سکا۔ مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں کوئی ایسی زوردار بات کہوں جسے سنتے ہی وہ میرا پیغام فوراً اپنے صاحب کو پہنچا دے۔ "فرید، میں تمہاری طرف پولیس بھیج رہی ہوں۔ پولیس والے تمہیں الٹا لٹکا کر اتنا ٹھوکیں گے کہ تم بک دو گے، چکر کیا ہے؟ اپنے صاحب کو بتا دو کہ مجھ سے پانچ منٹ میں بات کرے ورنہ میں پولیس کو ہر اس جگہ بھجوا دوں گی جہاں میرے بچوں کے موجود ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ سمجھ میں آیا؟" بیچارے نے کہا کہ وہ صاحب کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے فون بند کر دیا۔ تقریباً فوراً ہی گھنٹی بجی۔ مصطفےٰ بول رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ فرید نے اس تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصطفےٰ اپنے ہی فلیٹ میں فرید کے پاس بیٹھا یہ ساری کہانیاں اس لیے گھڑ رہا تھا کہ ہم اس کا سراغ نہ لگا

سکیں؟ مصطفےٰ سے کچھ بعید نہ تھا۔

میں نے اس اثنا میں اپنے وکیل اور پولیس کو مطلع کر دیا اور پاکستان اپنے والد کو فون کیا۔ پورے خاندان کو چوکنا کر دیا گیا۔ ہماری عید عاشورے میں بدلتی جا رہی تھی۔

مصطفےٰ کے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے کہا کہ میں اپنے گھٹیا تخیل کو لگام دوں اور مشورہ دیا کہ مجھے سو جانا چاہیے۔

پانچ بجے صبح۔ کافی کی ان گنت پیالیاں، ختم نہ ہونے والی قیاس آرائیاں۔ میری امی اور بہنیں منو اور روبینہ میرے پاس موجود تھیں۔ ہم سوچتے رہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ لندن میں پی آئی اے کے سٹیشن منیجر کو جگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ میرے بچے کہیں کسی پرواز سے پاکستان نہ جا چکے ہوں۔ میرے والد ائیر لائن کے چیئرمین رہ چکے تھے۔ ہم ان کے عہدے کا رعب ڈال سکتے تھے۔ ہمیں اچانک خیال آیا کہ مصطفےٰ نے بچوں کو شاید پاکستان روانہ کر دیا ہو۔

سٹیشن منیجر نے ریکارڈ چیک کر کے ہمیں بتایا کہ تین بچے مختلف ناموں سے ہیتھرو سے اسلام آباد جانے والے اس طیارے پر سوار ہوئے تھے جو پیرس رکتا تھا۔ بچوں کے ہمراہ ایک خاتون تھی اور مصطفےٰ کا بھائی، مسٹر غلام عربی کھر تھا۔ خاتون دائی عائشہ تھی، میرے بچوں کی آیا۔

مصطفےٰ صرف مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بچے جا چکے تھے۔ اس نے انہیں اغوا کر لیا تھا۔ جس ملک نے اسے سیاسی پناہ دی تھی اس ملک کے قوانین کی اس نے خلاف ورزی کی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کا فعل تھا جس نے جان پر کھیل جانے کی ٹھان لی ہو۔ اس نے مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف سے آخری بڑا جوا کھیلا تھا۔ وہ اپنا کیریر، شہرت، آزادی، غرض کہ سب کچھ داؤ پر لگا چکا تھا۔

میں نے اپنے والد کو فون کیا۔ انہوں نے امی گریشن کنٹرول سے چیک کرنا چاہا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ مسافر کبھی کے جا چکے تھے۔

صبح چھ بجے۔ عید کا دن۔ مصطفےٰ کا فون آیا۔ اس نے میری امی سے بات کی۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کے باوجود بات کرتے وقت اس کے لہجے سے خباثت جھلکتی تھی۔
"میں اپنے بچے لے گیا ہوں۔ میں نے انہیں پاکستان بھجوا دیا ہے۔ اب انہیں کسی طرح واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ تہمینہ میرے پاس لوٹ آئے۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ میں جانتا ہوں وہ کبھی میرے پاس واپس نہیں آئے گی۔ اسے واپس لانے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔"

پھر اس نے مجھ سے بات کی۔ اس کا ضبط جواب دے گیا اور وہ رونے لگا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ وہ اذیت میں مبتلا ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ اس قدر خودغرضانہ تھا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے بچے چھین لیے ہیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے پاس لوٹ آؤ"۔

اس شخص کے ساتھ گفتگو جو میرے بچے اٹھا کر لے گیا تھا، بہت ہی ٹھٹھرا دینے والا تجربہ تھا۔ اس نے میرے بچوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ تاوان میں مجھ سے محبت مانگی جا رہی تھی۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مصطفےٰ کی اس حرکت سے میرے پاس اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے امکانات کم رہ گئے ہیں۔ میرے سامنے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ یا تو اس کے پاس لوٹ جاؤں یا اپنے تینوں بچوں کی صرف یاد کے سہارے جینا سیکھ لوں۔ معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ میرے سامنے عمل کے دونوں راستے سنگین اور دہشت ناک تھے۔ مجھے پتا چلا کہ بچے تو اسی صبح رخصت ہو گئے تھے اور مصطفےٰ نے پیرس سے واپس آ کر سارے فون ہمارے ہالینڈ پارک اپارٹمنٹ سے کیے تھے۔ اسے صرف یہ انتظار تھا کہ رات گزر جائے اور مجھے خبر ہونے اور میری طرف سے کوئی جوابی قدم اٹھائے جانے سے پہلے پی آئی اے کا طیارہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہو۔

مصطفےٰ کو پتہ تھا کہ اس حرکت کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ اس نے احتیاط سے ذرا بھی کام نہ لیا۔ وہ ایک بار پھر یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور یہ کہ قانونی باریکیوں کے لیے اس کے پاس صرف حقارت ہی حقارت ہے۔ اسے پتہ تھا کہ میں نے وکیلوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور پولیس کو خبردار کر چکی ہوں۔ فون پر مجھ سے بات کر کے وہ انگلینڈ چھوڑ گیا جہاں اس نے عدالت کے زیرِحفاظت بچوں کو اغوا کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ بذریعہ طیارہ پیرس جا کر روپوش ہو گیا۔ پیپلز پارٹی کے جس نیٹ ورک کو اس نے سالہا سال کی محنت سے تشکیل دیا تھا وہی اب اس کی نگہداشت اور حفاظت کا ذمے دار تھا۔

وہ ہمیں برابر فون کرتا رہا۔ فون کرنے کے لیے ہمیشہ مختلف بوتھ استعمال کرتا۔ اس نے میری امی سے، مجھ سے، ملازموں سے، غرض کہ ہر کسی سے جو اس کی بات سننے پر آمادہ ہو گفتگو کرنی چاہی۔ ہمارے گھر میں اب اس کی حیثیت اچھوت سے زیادہ نہ تھی۔

میں نے اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ مجھے قانون کی تائید حاصل تھی۔ مصطفےٰ

قانون کو کچھ زیادہ ہی بار لات مار چکا تھا۔ اسے سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے انٹرپول کو یورپ میں موجود تمام پارٹی ورکروں کے ٹیلی فون نمبروں کی فہرست فراہم کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے انہیں کے پاس پناہ لے رکھی ہو گی۔ پولیس نے پیرس، برو سلز اور جینیوا میں چھاپے مارے۔ پولیس پوچھ گچھ کی غرض سے جتوئی صاحب کی ڈنر پارٹی میں بھی مخل ہوئی۔ جتوئی صاحب کو مصطفےٰ کی حرکت کا علم اس وقت ہوا جب وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پورے یورپ میں مصطفےٰ کو سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔

"شکاری" خود "شکار" بن گیا تھا۔ مصطفےٰ کہیں ایک جگہ نہ ٹھہرتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ تلاش میں نکلے جاسوسوں سے ایک قدم آگے رہتا تھا۔ اس کی ہر طرح کمبختی آئی ہوئی تھی۔ انگلینڈ جائے تو وہاں جیل ہو سکتی تھی۔ پاکستان جائے تو پھانسی چڑھنے کا اندیشہ تھا۔ یورپ محفوظ نہ رہا تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم بچا تھا۔ مجھے منانا اس کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا تھا تاکہ اسے جاسوسوں سے بھی نجات مل جائے اور میں بھی اس کے پاس لوٹ آؤں۔ میری ہی طرح اس کے لیے بھی راہ عمل بہت محدود اور دشوار ہو کر رہ گئی تھی۔

میں بچوں کی خیروعافیت کے بارے میں سخت فکرمند تھی۔ وہ ایک اجنبی ماحول میں جا پہنچے تھے اور والدین ان کے ساتھ نہ تھے۔ مجھے یہ فکر لاحق رہنے لگی کہ انہیں خوراک کیسی ملتی ہو گی، تعلیم کا کیا بندوبست ہو گا، گرمی کتنی لگتی ہو گی، حفظانِ صحت کا کتنا خیال رکھا گیا ہو گا۔ ان کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ میں بیٹھی ان کے بارے میں سوچتی اور پریشان ہوتی رہتی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کراچی یا لاہور میں نہیں۔ میڈیا کے وارے نیارے ہو گئے۔ میرے بچوں کی تصویریں روز اخباروں میں چھپنے لگیں۔ انہیں کسی شہری مرکز میں رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مصطفےٰ کے گاؤں میں ہیں جہاں انہیں لامحدود عرصے تک رکھا جا سکتا تھا۔

میرے والد نے بچوں کی واپسی کے لیے پاکستان میں اقتدارِ اعلیٰ پر فائز شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ جنرل ضیاء سے ملے۔ انہوں نے پیر پگارا، جنرل فضل حق اور جنرل عارف سے بات کی۔ انہوں نے وزیراعظم، مسٹر جونیجو سمیت ان تمام شخصیات سے ملاقات کی جو اس سلسلے میں مدد کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ اغوا ہونے والے بچوں میں دو لڑکیاں تھیں۔ جاگیردار کسی ایسی کارروائی کی حمایت کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے جس کے ذریعے کسی ساتھی جاگیردار کو اپنی بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ کسی عورت کے اغوا سے تشدد کے ایسے پیچ در پیچ سلسلے کا آغاز ممکن تھا جو نسل در نسل جاری رہ سکتا تھا۔

مصطفےٰ کھر فوجی حکومت کا سیاسی حریف تھا۔ جنرل ضیاء ہماری مدد کرنے سے اس لیے گریزاں تھا کہ اس کے خیال میں اس طرح کی کارروائی سے مصطفےٰ سیاسی فائدہ اٹھائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ وہ بے گناہ ہے اور حکومت اسے ستا رہی ہے۔ اہل اقتدار کو اس مقدمے کے حقائق کے بارے میں بھی یقین سے کچھ پتہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ ایسے معاملے میں، جو ان کی نظر میں محض گھریلو لڑائی جھگڑا تھا، فریق نہ بننا چاہتے تھے۔ مصطفےٰ نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹیاں مغرب میں پلیں بڑھیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اسلامی روایت کے مطابق ہو۔ اسے پتہ تھا کہ اتنا کہنے کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ وہ دنیا کے طبقے کے اس بہت بڑے حصے کی جذباتیت سے کھیل کر اپنا الو سیدھا کر رہا تھا جو سمجھتا ہے کہ مغرب بدکاری اور اخلاقی انحطاط کا گڑھ ہے۔ اس طرح اس نے اہل اقتدار کو دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں عوام کے اس طبقے کو ناراض کرنے کا حوصلہ کہاں تھا جس کے طفیل وہ حکومت کر رہے تھے۔

اتنے میں مصطفےٰ نے پھر مجھے فون کیا۔ اس نے بڑے سکون بھرے لہجے میں مجھ سے کہا کہ مسئلے کا حل بہت سادہ ہے۔ مجھے بس اتنا کرنا ہے کہ اس کے پاس چلی آؤں اور ہم پہلے کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے۔ بحران کو حل کرنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ خاندان کی پرانی حیثیت بحال کر دی جائے۔ میں اس شخص کی ڈھٹائی پر دنگ رہ گئی۔ مجھے اس کی جوڑ توڑ کی ان باتوں سے نفرت تھی۔ یہ سارا ڈراما، جو صرف اس لیے کھیلا جا رہا تھا کہ مجھے اس کے پاس لوٹنے پر مجبور کر دیا جائے، نہایت خودغرضانہ تھا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں کس قسم کے احساسات رکھتا ہو گا۔

اخبارات مصطفےٰ کے بیانات سے بھرے پڑے تھے جن میں اس نے خود کو قدامت پسند کے روپ میں پیش کیا تھا۔ یہ بھی اپنے اصل مقاصد چھپانے کے لیے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اس سے لڑتی رہوں گی:

اس نے دوبارہ یورپ کی کسی جگہ سے فون بوکس سے فون کیا۔ میں بولی: "اگر تم مسٹر کھر ہو تو میں بھی مسز کھر ہوں۔ اگر تم نے بھٹو سے چال بازی سیکھی ہے تو میں نے تم سے۔ تم مجھے بلیک میل کرو گے تو میں تمہیں بلیک میل کروں گی۔ میں صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔ تمہیں بچ کر نہ جانے دوں گی"۔ میں نے مصطفےٰ کے خلاف اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا۔ میں نے پولیس سے کہا کہ اسے گرفتار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ میرے بچوں میں سے دو برطانوی شہری تھے۔ ہم نے پاکستان میں برطانوی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بچوں کو ڈھونڈ کر انگلینڈ ہمارے پاس بھجوانے میں ہاتھ بٹائیں۔

مجھ پر جنون سوار تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے نفرت محسوس کی۔ شدید ترین نفرت جس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ تھی۔ میری امی پہلے چاہتی تھیں کہ میں مصطفےٰ کے پاس واپس چلی جاؤں لیکن اب انہیں بھی اس کی ناہنجاریوں کا یقین آ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے مصطفےٰ سے نفرت کرنے کی انوکھی ہی وجوہ تلاش کر لی تھیں۔ انہیں اس مکروہ جرم سے اتنی پریشانی نہیں تھی، زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ مصطفےٰ بچوں کو ان کے گھر سے بھگا کر لے گیا تھا۔ یہ بات ناقابل معافی تھی۔ کسی شریف آدمی سے اس طرح کی حرکت متوقع نہیں۔ اس نے ان کے بھروسے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ ان کے ذہن میں شائستگی کے جتنے تصورات تھے یہ حرکت ان سب کی نفی تھی۔ انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور میری ہر کارروائی کی حمایت کی۔ وہ اسے سیاسی طور پر خاک میں ملا دینا چاہتی تھیں۔

ہماری یہ جنگ روزانہ چوبیس گھنٹے جاری رہنے والی جنگ تھی۔ میری بہن مِنّو بھی میرے پاس آ گئی تھی۔ میرے پاس آ جانے سے اس کی شادی کشیدگی کا شکار ہو گئی لیکن اس نے اپنی تمام ترجیحات میرے لیے وقف کر دیں۔ جب یہ ہنگامہ جاری تھا تو میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یہ ہوش ہی نہ تھی کہ میں فاقہ کر رہی ہوں لیکن جب پانچ دن گزر گئے تو سب لوگوں پر انکشاف ہوا کہ میں نے تو اس عرصے میں کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ جب میں نے کھانے کی کوشش کی تو قے ہو گئی۔ مجھے ویلنگٹن ہسپتال لے جایا گیا جہاں میرا اشتہا بستگی (ANOREXIA) کے شعبے میں علاج ہوا۔ میں ہفتے بھر ہسپتال میں رہی۔

مصطفےٰ براعظم یورپ میں ڈانواں ڈول پھرتا رہا۔ انٹرپول اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس نے ہم سے میل رکھا لیکن اس کی بات چیت زیادہ تر ہمارے ملازموں سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے ہر اس شخص سے رابطہ قائم کیا جو مجھ پر اثرانداز ہو کر مجھے اس کے پاس لوٹ جانے پر راغب کر سکتا ہو۔

اس موقع پر مجھے صرف یہی فکر تھی کہ کسی طرح مصطفےٰ گرفتار ہو جائے۔ میں نہ صرف حیران تھی کہ بچوں کا کیا حال ہے بلکہ یہ بھی ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتی تھی کہ انہیں اغوا کیسے کیا گیا تھا۔ تفصیلات کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔ بظاہر مصطفےٰ نے بچوں سے کہا تھا کہ وہ انہیں ڈزنی لینڈ دکھانے لے جائے گا۔ وہ اس منصوبے کے

بارے میں چپ سادھے رہے۔ مصطفیٰ نے کہہ دیا تھا کہ اگر انھوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو ممکن ہے میں جانے کی اجازت نہ دوں۔

اس فیصلہ کن صبح وہ انھیں کار میں بٹھا کر ہوائی اڈے لے گیا۔ سازش میں اس کا بھائی، غلام عربی کھر، شریک تھا جو چند روز پہلے چھٹیاں گزارنے انگلینڈ پہنچا تھا۔ بچے اپنے والد، چچا اور آیا کے ساتھ پی آئی اے کے ایک طیارے پر سوار ہوئے۔ مصطفیٰ خود کو بڑے بھاری خطرے میں ڈال رہا تھا۔ وہ پی آئی اے کی پروازوں کے کبھی پاس بھی نہ پھٹکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر پاکستان میں حکام کو خبر ہو گئی کہ مصطفیٰ کھر طیارے پر سوار ہے تو وہ حکم دیں گے کہ پی آئی اے کی پرواز کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیا جائے۔

رستے میں مصطفیٰ انھیں بتاتا رہا کہ ڈزنی لینڈ کتنا حیرت انگیز ثابت ہو گا اور مکی ماؤس سے مصافحہ کرنے میں کتنا مزا آئے گا۔ طیارہ شیڈول کے مطابق پیرس رکا۔ مصطفیٰ نے بچوں سے کہا کہ اسے پیرس میں کچھ کام ہے۔ اس لیے وہ طیارے سے اتر رہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ امریکہ میں ان سے آ ملے گا۔ بچے بہت پریشان ہوئے اور رونے لگے۔ مصطفیٰ پیرس اتر گیا اور کسی اور پرواز سے لندن چلا آیا۔

بچے اکیلے رہ گئے۔ چچا ان کے لیے نسبتاً اجنبی تھا۔ وہ اس سے دوسرے دفعہ ملے تھے۔ دائی عائشہ سے وہ مانوس تھے۔ انھیں ڈر تو لگ رہا تھا لیکن ڈزنی لینڈ کے تماشوں کے خیال سے خوش خوش بیٹھے رہے۔

طیارہ اسلام آباد اترا، جولائی کا مہینہ تھا۔ درجۂ حرارت سو سے بھی اوپر پہنچا ہوا تھا۔ میرے بچوں کو اس سے پہلے جولائی کی کسی واقعی جھلس دینے والی سہ پہر سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ان کے چہروں پر لو کے تھپیڑے لگنے شروع ہوئے۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ وہ حیران رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امریکہ اتنا گرم اور اتنا۔۔۔ یوں کہہ لیجیے، پسماندہ ہو گا۔

میرے بیٹے علی نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے اسے کئی پاکستانی ڈھیلی ڈھالی شلواروں میں ملبوس نظر آئے جو کسی طرح امریکہ پہنچے ہوئے تھے۔ اسے اتنا پتہ تھا کہ وہ غریب پاکستانی ہیں کیوں کہ انھوں نے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اگر ان کے دل میں مواقع سے پُر سرزمین کے بارے میں کچھ خوش فہمیاں تھیں بھی تو وہ شدید گرمی کی لہر سے پہلی بار دوچار ہونے کے بعد مرجھا کر رہ گئیں۔

بچوں کو لینے کے لیے ہوائی اڈے پر ایک اور چچا یعنی غلام مرتضیٰ کھر موجود تھا جو

قومی اسمبلی کا رکن بھی تھا۔ وہ کوئی ترکیب لڑا کر انھیں اڈے سے نکال لے گیا اور ان کے پاسپورٹوں پر مہر لگنے کی رسمی کارروائی کی نوبت بھی نہ آنے دی۔ مصطفیٰ نہیں چاہتا تھا کہ بچوں کی آمدورفت کے حوالے سے کہیں پر اس طرح کے شواہد باقی رہنے دیے جائیں جن سے بعد میں الجھنیں پیدا ہوں۔

پھر انھوں نے چھ گھنٹے تک کار میں سفر کیا۔ انھیں سیدھے مصطفیٰ کے گھر لے جایا گیا۔ وہ نئے لوگوں کے درمیان تھے۔ ممی اور ڈیڈی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ انھیں یہ علم تھا کہ یہ سارا ڈراما صرف اس لیے رچایا گیا ہے کہ میں نے ان کے باپ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ وہ خوفزدہ تھے کہ ممکن ہے مجھ سے دوبارہ کبھی ملنے کا موقع نصیب نہ ہو۔ اس بات کا سب سے شدید احساس میری بیٹی نصیبہ کو تھا۔ لیکن وہ نڈر بنی رہی اور اپنے ہراس کو پی گئی، صرف اس لیے کہ چھوٹا بھائی اور بہن دونوں دہشت زدہ نہ ہوں۔

انھیں گاؤں میں چھپا دیا گیا۔ میری بیٹیوں نے اس بات کا برا مانا کہ انھیں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ میرے بیٹے، علی، کو گھر سے باہر کھیلنے کی اجازت تھی۔ وہ کھڑکی میں سے اسے کھیلتے دیکھتی رہتیں۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ لڑکیاں صرف چھ اور آٹھ سال کی تھیں۔ وہ لڑکیاں تھیں اور انھیں نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے تھا۔ جاگیردارانہ رت یہی تھی اور اس پر عمل کیا جا رہا تھا۔ لڑکیوں کو باقی عورتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا جو بظاہر اپنی تقدیر کے لکھے کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔

بچوں کو اپنا دیسی گھر بہت گندا اور حفظان صحت کے لحاظ سے بہت نامعقول نظر آیا۔ ان کا پہلی بار ڈھیٹ مکھیوں اور مچھروں سے واسطہ پڑا۔ جو انھیں ملتا وہ میلا کچیلا ہی ہوتا۔ بچے ہمیشہ گندے دکھائی دیتے۔ ان کے کپڑے گھسے پٹے اور عموماً سلوٹوں بھرے اور پھٹے ہوتے۔ سڑکیں کچی تھیں۔ کھلے گٹروں نے گارا اور گندگی ابل ابل کر باہر پھیلی ہوتی تھی اور ہر طرف کیچڑ اور گردوغبار کا راج تھا۔ نہ وہاں کوئی پارک تھا نہ ہرے بھرے قطعات جہاں جا کر کھیلا جا سکے۔ اس کے برعکس بچے تنگ گلیوں میں کھیلتے رہتے جہاں خارش زدہ نیم باؤلے کتے بیٹھے اپنی ہر وقت ہلتی دموں سے مکھیاں اڑایا کرتے۔ یہ دیہی حسن اور امن سے مالا مال کوئی مثالی گاؤں نہ تھا بلکہ بے برگ و نوا اور کھنڈر سی جگہ تھی اور ہر اس چیز سے جو انھوں نے کبھی دیکھی ہو گی یا جس کے بارے میں سوچا ہو گا قطعی طور پر ماورا معلوم ہوتی تھی۔

بچوں کی نگرانی ان کے سوتیلے بھائی عبدالرحمٰن کے ذمے تھی۔ غلام عربی نے اس

سارے بیہودہ معاملے سے خود کو الگ تھلگ کر لیا۔ مصطفیٰ نے اسے غالباً منا لیا تھا کہ ہماری بچی بچانے کی خاطر اغوا کے جرم میں اس کی اعانت ضروری ہے۔ بہرحال، پاکستان لوٹنے کے فوراً بعد عربی کی سوچ میں تبدیلی آ گئی۔ وہ اتنی آسانی سے مصطفیٰ کے فقروں میں آجانے پر پچھتایا اور ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ اس کے سننے میں آ چکا تھا کہ میں ہسپتال میں پڑی ہوں اور اس نے محسوس کیا کہ کسی ماں کے پاس سے بچوں کو چرا لانا بالکل غلط حرکت ہے۔ عربی جانتا تھا کہ اس ضمن میں مصطفیٰ کے محرکات قطعی خودغرضانہ ہیں۔ بچوں کے مفاد کا اسے کوئی خیال نہیں۔

غلام غازی کھر بھی گاؤں میں موجود تھا۔ اس نے بچوں کا خیال رکھا اور انہیں نئے ماحول کا عادی بننے میں مدد دینے کے لیے خاصا وقت ان کے ساتھ گزارا۔ اس کی مصطفیٰ سے بول چال نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بھتیجیوں اور بھتیجے کے لیے چاہت کا اظہار کیا۔ وہ بچوں کو اپنے گھر لے جاتا اور شکار کھیلنے نکلتا تو علی کو ساتھ رکھتا۔ اس نے میرے بیٹے کو ایک ٹٹو خرید دیا اور اسے سواری کرنی سکھائی۔

وڈیو فلموں کی مسلسل دستیابی سے لڑکیوں کا دل بہلا رہتا۔ کتابیں تو وہاں تھیں نہیں۔ لہٰذا ٹیلی وژن کا زور تھا۔ غلام مرتضےٰ کھر کی دونوں بیٹیاں میری بچیوں کی ہم عمر تھیں۔ ان میں گہری دوستی ہو گئی۔ مصطفیٰ کے بھائی بچوں سے بہت شفقت سے پیش آئے اور بڑی فیاضی سے ان کی ضروریات پوری کرتے رہے۔

جونہی مصطفیٰ کو خبر ملی کہ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ بچے کہاں پر ہیں اور میرے والد نے صدر سے رابطہ قائم کیا ہے تو اس نے فی الفور کارروائی کی۔ بچوں کو لاہور کے ہوائی اڈے لا کر فرضی ناموں کے تحت کراچی جانے والی پرواز پر سوار کرا دیا گیا۔

طیارے میں نصیبہ راز فاش کرتے کرتے رہ گئی۔ ایک ایرہوسٹس نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ بچی کے منہ سے اصلی نام بس نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اخباروں میں ان کے بارے میں بہت کچھ چھپ چکا تھا اور ان کے نام گھر گھر مشہور ہو چکے تھے۔ بچوں کا کہنا ہے کہ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ کاش کوئی انہیں پہچان لے۔ جانے کیا بات ہوئی کسی نے انہیں پہچانا نہیں حالانکہ پریس میں ان کے ادھر اُدھر دیکھے جانے کا ذکر آتا رہا۔

کراچی سے انہیں بذریعہ کار نواب شاہ میں جتوئی صاحب کے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ وہاں وہ جتوئی صاحب کے بیٹے، مسرور، اور اس کی امریکی بیگم سارہ کے مہمان تھے۔ یہ جائے روپوشی زیادہ آرام دہ تھی۔ انہیں سارہ اچھی لگی کہ وہ انگلینڈ میں اسی جیسی عورتوں سے ملنے جلنے کے عادی تھے۔ وہ سارہ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر سیر کرنے گئے اور

آزاد ہونے کے مزے لوٹے۔ بلحاظ سازوسامان اور صفائی یہ گھر اس جگہ سے بہتر تھا جہاں پہلے پہل انہیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔

بچوں کو معلوم تھا کہ انہیں چھپا چھپا کر رکھا جا رہا ہے۔ جب ان کی کار کسی ٹریفک سگنل پر رکتی تو ان سے نیچے دبک جانے کو کہا جاتا تاکہ انہیں کوئی پہچان نہ لے۔ ان سب باتوں پر انہیں لازماً کسی بہت بڑی آنکھ مچولی کا گمان ہوا ہو گا جو دو براعظموں پر کھیلی جا رہی تھی۔

میں سمجھتی تھی کہ اس دوران میں بچے بہت پریشان اور ناخوش رہے ہوں گے۔ لیکن بچوں کو باتیں زیادہ دیر تک یاد نہیں رہتیں۔ جب وہ خود ان واقعات اور حادثات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے ساتھ پیش آئے تھے تو انہیں یاد کر کے ہنستے ہیں اور ایسے کے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ پہلو پر توجہ دینے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ کردار کا یہ رنگ انہیں مجھ سے ورثے میں ملا ہے۔ میرا رویہ بھی انہیں جیسا ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے سب سے صبرآزما اور کٹھن ادوار کی طرف مڑ کر نظر ڈالتی ہوں تو انہیں مزاحیہ سچوایشنوں (SITUATIONS) میں بدل دیتی ہوں۔ چارلی چیپلن والا انداز اپنا لینے سے زخموں کے اندمال میں مدد ملتی ہے۔

بہت سارے مہینے گزر جانے کے بعد مجھے اپنی آنکھوں یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ اس دوران میں میرے بچوں کا رویہ اور ذہنی کیفیت کیا تھی۔ غلام غازی نے انہیں ویڈیو پر ریکارڈ کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ جو کچھ پہلے پہل میں نے دیکھا اس پر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میرے بچے جس سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس کی مجھے ان سے امید نہ تھی۔ وہ نارمل معلوم ہو رہے تھے اور انہیں اس دکھ درد کا ذرا بھی احساس نہ تھا جو مجھے ان سے زبردستی بچھڑ جانے سے پہنچا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی کہ میں آخر واپس آئی ہی کیوں؟ وہ تو میرے بغیر بھی خوب مزے سے رہ رہے تھے۔ یہ تو میں تھی جو ان کے بغیر نہ جی سکتی تھی۔ ویڈیو میں وہ پلنگوں پر اچھلتے، ہنستے اور کھیلتے نظر آئے۔ ان کے لیے ہر دن گویا عید، ہر شب شب برات تھی۔ علی کے بھی شاٹ تھے جن میں اسے بندوقیں صاف کرتے اور یابو پر چڑھے دکھایا گیا تھا۔ میں نے صورتحال کی عقلی توجیہہ کرنی چاہی۔ یہ خوشی عارضی نوعیت کی ہے۔ اس کے برقرار رہنے کا امکان نہیں۔ اپنی دانست میں وہ ایک ہنگامہ خیز تماشے میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ تمام وقت کسی نہ کسی شغل یا تفریح میں محو رہتے ہیں۔ لیکن والدین کی جدائی سے پیدا ہونے والی کشیدگیاں ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر گوشۂ غفلت میں پڑے رہنے کا یہ عرصہ کچھ زیادہ طول کھینچ گیا تو وہ ناشاد اور دلگیر ہو کر رہ جائیں

گے۔ ان کی تعلیم کا حرج ہو گا اور ذہنی ترقی کا عمل رک جائے گا۔

ابھی میں ہسپتال میں تھی۔ اتنے میں خبر آئی کہ مصطفےٰ کو برو سلز کے ہوائی اڈے پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ میری طبیعت الجھنے لگی۔ مجھے یاد ہے میں رو پڑی تھی۔ میں اس کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں عام مجرم بن گیا تھا۔ اس شخص کی تہہ تک پہنچنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ہماری شادی میں جو بگاڑ پڑا تھا اس میں تمام قصور اسی کا تھا۔ اسی کے اکسانے پر میں اسے چھوڑ کر آ گئی تھی۔ اب وہ زبردستی مجھے واپس بلانے کے در پے تھا۔ یہ آدمی جو وطن لوٹ کر سیاسی قیدی بن سکتا تھا اب گھٹیا قسم کے مجرموں کے ساتھ جیل میں بند تھا۔

مصطفےٰ جعلی پاسپورٹ پر بیلجیم سے سوئٹزرلینڈ جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے زیرزمین روابط سے کام لے کر پاکستانی سفارت خانے سے کسی آدمی کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ پھر اس نے اس آدمی کا فوٹو اتار کر اپنا فوٹو چسپاں کر دیا۔ برو سلز میں امی گریشن کے حکام نے ایک مشین کی مدد سے اس جعل سازی کا سراغ لگا لیا اور مصطفےٰ پکڑا گیا۔ اسے نشہ خوروں اور معاشرے کے دوسرے اسفل ترین مجرموں کے ساتھ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ کہاں اڈیالا جیل کا مصطفےٰ کھر اور کہاں یہ مصطفےٰ کھر۔ دونوں میں کس قدر بعد تھا۔ واضح فرق یہ تھا کہ برو سلز میں وہ اس اخلاقی حوصلے سے محروم تھا جو اسے پاکستانی جیل میں سہارا دیتا تھا۔ صحیح رابطے قائم کرنے پر دو روح فرسا دنوں کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ مصطفےٰ اب بھی بڑے رسوخ والا آدمی تھا اور اس کے روابط ایسی جگہوں سے تھے جہاں کا کہا وزن رکھتا تھا۔ اسے برو سلز بدر کر کے جینیوا چلتا کر دیا گیا۔

ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ میں بچوں سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں ہیں کہاں۔ یہ کہانیاں ہمارے سننے میں آتی رہتی تھیں کہ انہیں کسی ایک جگہ نہیں رکھا جا رہا۔ آج کہیں ہیں تو کل کہیں۔ آہستہ آہستہ میرے اوسان جواب دینے لگے۔ غصہ رفتہ رفتہ مایوسی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بے یقینی کی کیفیت کو میں اور کتنی دیر برداشت کر سکتی ہوں۔

مصطفےٰ کو معلوم تھا کہ ایک دوسرے کو ستانے اور دق کرنے کی اس جنگ میں، جو ہم لڑ رہے تھے، میرا حوصلہ جواب دیتا جا رہا ہے اور وہ مجھے گفت و شنید پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے فون کیا۔ اب وہ براہ راست بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ثالثوں کا ٹنٹا ختم کر دیا۔ یہ دو طرفہ مسئلہ تھا۔ اس کا تعلق صرف ہم دونوں سے تھا۔ ہم نے

بات چیت شروع کر دی۔

گفت و شنید کے ذریعے معاملے طے کرنے میں اسے کمال مہارت حاصل تھی۔ اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے اختیار میں کیا ہے، کیا نہیں۔ کیا میں بچوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر زندگی گزار سکتی ہوں؟ کیا میں انگلینڈ میں اکیلی خوش رہ سکوں گی، خاص طور پر جب مجھے یہی معلوم نہ ہو کہ بچوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا یہ بچوں کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی؟ "میں پاکستان نہیں جا سکتا۔ بچوں کی پرورش میرے خاندان والے کریں گے۔" مصطفےٰ معروضی حقیقت تشکیل دے کر میرے سامنے رکھ چکا تھا۔ ایجنڈا اس کا تیار کردہ تھا۔ مجھے اس کی چنی ہوئی حدود میں رہ کر فیصلے کرنے تھے۔

اس وقت تک میں جان چکی تھی کہ حکومتِ پاکستان ہماری مدد کرنے کے موڈ میں نہیں۔ وہ ایک ایسے معاملے کی خاطر جو ان کے نزدیک خالصتاً گھریلو اور نجی تھا مصطفےٰ کھر سے الجھنا نہ چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا احساسِ جرم مجھے کبھی نارمل زندگی بسر نہ کرنے دے گا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ میرے بچے سامنے کھڑے ہو کر مجھ پر خود غرضی کا الزام لگا رہے ہیں۔ ایک بار پھر میں نے محسوس کیا کہ مصالحت کیے بغیر چارہ نہیں۔ اپنی انا کو قربان کرنا ہی پڑے گا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میری توانائی میں آہستہ آہستہ کمی آتی جا رہی ہے۔ میں نے جان لیا کہ داخلی طور پر مجھ میں اتنا دم خم نہیں کہ میں یہ ختم نہ ہونے والی پیکار جاری رکھ سکوں۔ کسی نہ کسی چیز نے تو جواب دے ہی جانا تھا۔ مصطفےٰ اس بات کو تاڑ گیا تھا۔ وہ میرے احساسِ جرم کو دوچند کرنے اور میرے اندیشوں کو ہوا دینے میں مصروف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میری قوت مدافعت پر وہ اسی طرح مسلسل تھوڑا تھوڑا رندہ پھیرتا رہا تو میں مات کھا جاؤں گی۔ اس نے جلدی نہیں کی بلکہ بڑے اطمینان سے کارروائی جاری رکھی۔ وہ بالکل سیدھی سی چال چل رہا تھا یعنی مجھ سے ایک طرف تو گفت و شنید جاری رہے، دوسری طرف بچوں کو مجھ سے دور رکھا جائے۔ جتنا وقت درکار ہو لے لو۔ ذہن بالآخر ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ وہی چال ہے جس سے کام لے کر بحرانی صورتحال میں گفت و شنید کے ماہر دہشت پسندوں اور ہائی جیکروں کے حواس شل کر ڈالتے ہیں۔

مصطفےٰ نے بتدریج اپنی ساکھ دوبارہ جمالی۔ شروع شروع میں اس کی باتیں مجھے غلط اور جھوٹی معلوم ہوئیں۔ میں اس کی گفتگو میں پوشیدہ طعنوں اور ذومعنی باتوں کو تلاش کرتی رہتی۔ جو کچھ وہ کہتا اسے ذہن میں دہراتی تاکہ اس کے بچھائے ہوئے خفیہ جال ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو سکوں۔ اس نے مجھے اپنی راز کی باتیں بتانی شروع کر دیں۔ وہ پاکستان لوٹنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ بات میں اپنی امی کو نہ بتاؤں۔

وہ محسوس کرتا تھا کہ اس انکشاف کے بارے میں ان کا ردعمل منفی نوعیت کا ہوگا۔ "تمہاری ماں تم سے جلتی ہے۔ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو سکتی کہ میری بیگم کے طور پر تم پاکستان پہنچ کر کس قدر اہمیت کی مالک بن جاؤ گی۔ اسے پتہ ہے کہ میں بدل چکا ہوں۔ اسے پتہ ہے کہ میں بچ مچ ان زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں جو میں نے تم سے کی ہیں۔ وہ ہماری شادی کو توڑنا چاہتی ہے۔ اسے ہمارے بچوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی نظر میں وہ بالکل غیراہم ہیں۔ وہ صرف اس لیے تلملا رہی ہے کہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اسے زیادہ غصہ یہ ہے کہ میں اس کی موجودگی میں اس کے گھر سے بچوں کو لے گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی"۔

میری قوتِ مدافعت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میری طرف سے لڑنے کی ذمے داری امی نے سنبھال لی۔ ان کا لہجہ میرے لہجے کے مقابلے میں زیادہ کڑا اور تلخ تھا۔ ان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ مصطفیٰ کے ناقابل تسخیر ہونے کے ڈھکوسلے کا قلع قمع کیے بغیر چین سے نہ بیٹھنا چاہتی تھیں۔ ان سب باتوں کا مجھ پر منفی اثر مرتب ہو رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے کچھ ذہنی سکون نصیب ہو۔ میں بچوں کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ امی نے جو رویہ اپنایا ہے اس سے مسئلے کا کوئی حل کیسے ممکن ہے۔ سب سے پہلے تو باہمی نوک جھونک اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے کے اس مقابلے کو ختم ہونا چاہیے تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ مصطفیٰ کی زد میں آنا خطرناک ہے۔ وہ اپنی منطق سے میرے عزم کو کمزور کرتا گیا۔ وہ رفتہ رفتہ میرے ذہن پر قبضہ جما رہا تھا اور ایک بار پھر مجھے برین واش کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر وہ باز نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ جوا جیتنے میں وہ اس لیے کامیاب رہا کہ اکا (یعنی بچے) اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ میں موم ہو چلی ہوں تو اس نے مجھے بچوں سے بات کرنے کا موقع دیا۔

دو مہینے جوں توں کر کے گزر گئے تھے۔ 29 جولائی کو نصیبہ کی مجھ سے بات کرائی گئی۔ اس دن وہ آٹھ برس کی ہو گئی تھی۔ یہ ایک بہت جذباتی لمحہ تھا۔ اس کی وجہ سے میں بچوں کے اور زیادہ قریب ہو گئی اور طرفہ تماشا یہ کہ اسی نے مجھے مصطفیٰ کی آغوش میں دھکیل دیا۔ "ہیلو ممی۔" "نصیبہ، تمہارا کیا حال ہے؟" "ممی، یہاں بہت گرمی ہے۔" "بے بی، تم ہو کہاں؟" "میں یہ نہیں بتا سکتی۔ مجھے بتانے کی اجازت نہیں۔ آپ کو فون کرنے کے لیے ہمیں بڑی دور آنا پڑا۔ یہاں بہت ہی سخت گرمی ہے"۔ مجھے اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ "تمہارے پاس پڑھنے کے لیے کتابیں

ہیں؟" "نہیں۔" "تمہیں سالگرہ پر کوئی تحفہ ملا؟" "ہاں، مجھے روپے کے نوٹوں کا بنا ہوا ہار ملا۔ بڑا گھٹیا دکھتا ہے یہ ہار۔ مجھے اس سے گھن آتی ہے۔ ممی، یہاں اتنی زیادہ گندگی اور گرمی ہے۔ چاروں طرف اتنی ڈھیر ساری مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ مجھے مکھیاں زہر لگتی ہیں"۔

اس بار میرا ضبط جواب دے گیا۔ "ممی، آپ سے کب ملنا ہو گا؟" "جلدی، نصیبہ۔" "ممی، ہم واپس کیوں نہیں آ سکتے۔ ہم آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ہم گھر آنا چاہتے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمیں واپس بلا لیں"۔ "جلدی"۔ میرا وعدہ مبہم اور کھوکھلا معلوم ہوا۔ اس نے تقاضا کیا کہ میں ٹھیک بتاؤں کہ جلدی سے کیا مراد ہے۔ "ہمیں یہاں اور کتنی دیر رکنا ہو گا؟" اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی۔

مجھے لگا کہ میں بہت خودغرض ہوں۔ بھلا ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو دنیا میں لانے کی مجھے کیا پڑی تھی! وہ ہماری حماقتوں کی وجہ سے دکھ جھیل رہے تھے۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دوں۔ آنول نال ایک دفعہ کٹنے کے بعد دوبارہ نہیں کاٹی جا سکتی تھی۔ میں نے جو موقف اختیار کر رکھا تھا اس کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ میری استقامت اسی میں پنہاں تھی کہ میں، صرف بچوں کی خاطر، اس شخص کے پاس لوٹ جاؤں۔

اس آدمی کی حیثیت کو گھن لگ چکا تھا۔ پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اس کی شہرت گپ شپ کے اخباری کالموں کی زینت بنی ہوئی تھی۔ اس کا سیاسی کیریر جمود کی زد میں آ چکا تھا۔ جس ملک نے اسے سیاسی پناہ دی تھی اسی ملک کی میزبانی سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی خاصی درگت بن چکی ہے۔

اگلے دن جب اس نے مجھے جینیوا سے فون کیا تو میں نے پُرسکون اور نپے تلے لہجے میں اسے مطلع کیا کہ میں اس کے پاس لوٹ آؤں گی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رو پڑا اور کہنے لگا کہ منشائے ایزدی یہی تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مثالی شوہر ثابت ہو گا اور ماضی میں جو طرزِ عمل اس نے اختیار کیے رکھا تھا اس کی تلافی کر دے گا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہیں کھڑے کھڑے فتح کا ناچ ناچنے لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ جینیوا میں فون بوتھ کی تنگی اس کے جوش و خروش کی راہ میں آڑے آئی ہو گی۔

یہی وہ آدمی تھا جس نے مجھے دھمکایا تھا کہ اگر میں ضد پر اڑی رہی تو مجھے خوفناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ اس نے فون پر ایسی بات مجھ سے کہی کہ میں حواس باختہ ہو گئی۔ بہت ہی متانت آمیز اور خباثت بھرے لہجے میں کہنے لگا کہ میں نے تمہیں اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ "تہمینہ، میں تمہیں

چھوڑنے والا نہیں۔ میں طیارہ چارٹر کر کے انگلینڈ میں اتروں گا۔ تمہیں اغوا کر لیا جائے گا۔ میں تمہیں قبائلی علاقے میں لے جاؤں گا جہاں قانون کی رسائی نہیں۔ ہم وہاں بچوں کے ساتھ رہیں گے۔ تم کھانا پکانا۔ میں شکار مار کے لاؤں گا اور چولہے کے لیے ایندھن بھی۔ میں سنجیدہ ہوں، تہمینہ۔ میں یہ کر کے رہوں گا۔ دیکھتی جاؤ۔" اس نے ساری باتیں اس قدر سنجیدگی سے کہیں کہ میرے ہوش جاتے رہے۔ میں نے فوراً پولیس انسپکٹر کو فون کر کے اس تازہ دھمکی کی خبر دی۔ مجھے پتہ تھا کہ مصطفےٰ اس سے بھی بری حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

مجھے ہمت نہ ہوئی کہ میں کسی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر سکوں کہ میں مصطفےٰ کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ امی نے میرے رویے میں آنے والی تبدیلی کو سونگھ لیا۔ انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ اس صورتحال کی وجہ سے ان پر جنون کے دورے سے پڑنے لگے۔ ان کا موقف غیر معقول تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ استدلال سے بات کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔ لوگوں کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے تو پھر، کسی نہ کسی طرح، انہیں آپ پر قبضہ جما بیٹھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ جب آپ کوئی ایسا فیصلہ کریں جو ان کی مرضی کے خلاف ہو تو وہ اپنی گرفت اور سخت کر دیتے ہیں۔ میں نے طے کیا کہ آج کے بعد میں اپنے فیصلے آپ کیا کروں گی۔ میں دوسروں کی گھڑی ہوئی صورتیں اختیار کرتے رہنے سے تنگ آ چکی تھی۔ مجھے حقیقت پسندانہ رویہ اپنانا تھا۔ ہم بچوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کوئی چیز ان کی بہبود سے زیادہ اہم نہ تھی، خاص طور پر میری اپنی انا تو بالکل اہم نہ تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن مصطفےٰ اس ذلت کا انتقام لے کر رہے گا جو اسے میری وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر، جنہیں کوٹ ادو میں چھپا کر رکھا گیا تھا، یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔

امی نے کوشش کی کہ مجھے امریکہ لے جائیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میرے والد، جو پاکستان میں تھے، سمجھ گئے کہ اس معاملے میں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے میرا زیادہ ساتھ دیا اور کہا" "اپنا دل پتھر کر لو اور بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی اولاد بھی ہے۔ تمہارے بچے کسی نہ کسی دن تمہارے پاس لوٹ آئیں گے۔ اپنی زندگی گزارو۔ نئے سرے سے جینا شروع کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتیں تو پھر صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ اپنے میاں کے پاس واپس چلی جاؤ"۔

منو اور اس کے شوہر کو، جنہوں نے اس ساری آزمائش کے دوران میرا ساتھ نبھایا تھا، میرے فیصلے سے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ سخت آزردہ ہو گئے۔ انہوں نے اسے اپنی

مری کے کونوینٹ میں اپنی بہن روبینہ کے ساتھ 1968

پیپلز پارٹی کی میٹنگ 1984ء میں غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب کے ساتھ

شکست سمجھا۔ میری شکست اس لحاظ سے کھوکھلی نہ تھی کہ مجھے اپنے بچے واپس ملنے والے تھے۔ ان کی شکست اس لحاظ سے کھوکھلی تھی کہ ان سے میں بھی چھننے والی تھی۔

مصطفیٰ نے جتوئی کو میرے والدین کے پاس بھیجا تاکہ ہمارے تجدید تعلق کی راہ ہموار ہو سکے۔ جتوئی صاحب نے اس امر کی ضمانت دینی تھی کہ مصطفیٰ آئندہ میرے ساتھ تمیز سے پیش آئے گا۔ وہ انگلینڈ سے ابھی ابھی پاکستان واپس گئے تھے۔ دو دن بعد وہ دوبارہ انگلینڈ آئے۔ انہوں نے میرے والدین سے ملنا چاہا۔ جس دن ان کا آنا طے تھا امی تو امریکہ چلی گئیں اور والد صاحب کہیں ادھر اُدھر کھسک لیے تاکہ ملنا نہ پڑے۔ جتوئی صاحب نے ہمارے قضیے کو اپنا ہی قضیہ سمجھا تھا اور مجھے اور مصطفیٰ کو ساتھ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنی نئی سیاسی پارٹی کا اعلان کرنے والے تھے اور ہمارا سکینڈل ان کے لیے خفت کا باعث ہوا تھا۔ وہ ہمارے جھگڑے میں مستقل طور پر الجھ گئے تھے کیونکہ ان کے سب سے اچھے دوست اور پارٹی کے نمبر دو قائد پر کڑی تنقید ہو رہی تھی۔ جتوئی صاحب نے ہوٹل میں مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر اب مصطفیٰ نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ اس سے دوستی ختم کر دیں گے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آئندہ میرے ساتھ زیادتی نہ ہو گی۔

میرے اب تک کے طلیف ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اپنا سامان باندھا۔ جتوئی صاحب مجھے لینے میرے والدین کے گھر آئے اور ہم ہالینڈ پارک اپنے اپارٹمنٹ چلے گئے۔ میں نے مصطفیٰ کے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے اگرچہ میرے وکلاء کا کہنا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ گرفتاری کا وارنٹ بھی واپس لے لیا گیا۔ اب مجھے پچھلی تمام بدمزگیاں بھلا کر نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔

مصطفیٰ اب لندن میں قدم رکھ سکتا تھا۔ ہوائی اڈے پر بعض دوست اسے لینے کے لیے پہنچے۔ وہ اپارٹمنٹ آیا۔ ہم ایک بار پھر آمنے سامنے تھے۔ میری جلد پر چیونٹیاں سی چلنے لگیں اور میری گدی کے بال کھڑے ہو گئے۔ بظاہر وہ مطمئن اور بے غم دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود کمرے میں دہشت کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ مجھ میں اس آدمی کو دیکھنے کی تاب نہ تھی جس نے بلیک میل سے کام لے کر میرے عزم کو شکست دے دی تھی۔

اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری توقعات پر پورا اترے گا اور ان تمام خوابوں کو، جو ہم نے مل جل کر دیکھے تھے، حقیقت میں بدل دے گا۔ میں جانتی تھی کہ اب وہ بطور سیاستدان بات کر رہا ہے۔ اس نے بڑی رسانیت سے ایک نئے کردار کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ میری آدرش پسندی کو تقویت دینا چاہتا تھا۔

میری بیٹی نصیبہ

مصطفیٰ کھر سے پہلی بار علیحدگی کے بعد۔ "ماربیلا" میں سکونت کے دنوں میں

میں روئی تک نہیں۔

ہمارے جزوی میل ملاپ کے بعد کا ہفتہ بڑا مصروف ہفتہ ثابت ہوا۔ مصطفیٰ دن رات سوچ میں پڑا رہا۔ میرے لوٹ آنے کے بعد اب اسے وہ تمام شرطیں پوری کرنی تھیں جو مصالحت کے حوالے سے اس پر عائد ہوئی تھیں۔ بچوں کو انگلینڈ بلا لینا بھی ہمارے اختیار میں تھا اور پاکستان جاکر ان کے ساتھ رہنا بھی ہمارے اختیار میں تھا۔ بہرصورت، کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل تھا۔

میں جان گئی کہ اسے کیا فکر لاحق ہے۔ وہ یہ حساب لگا رہا تھا کہ اس تمام کام میں اس کے لیے جوکھم کتنا ہے۔ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کرنا کیا چاہتی ہوں۔ اسے پتہ تھا کہ اگر بچوں کو واپس بلا لیا گیا تو میں بڑی آسانی سے اسے خداحافظ کہہ کر اس پر دوبارہ مقدمہ دائر کر سکتی ہوں۔ اس کے پاس لوٹ آنا شاید میری چال ہو جو میں نے بچوں کو حاصل کرنے کے لیے چلی ہو۔ اس کے سامنے بساط پر ایسا نقشہ جما ہوا تھا جو اس سے پہلے اس کی نظر سے نہ گزرا تھا اور وہ تذبذب کا شکار تھا۔ میرے سردمہر رویے نے معاملے کو اور الجھا دیا۔

مصطفیٰ کو پتہ چل چکا تھا کہ مجھے اس سے محبت نہیں رہی۔ میری نظر میں وہ قابلِ احترام نہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں آدرش پسند ہوں۔ اس نے اپنی توجہ میری آدرش پسندی کو جلا دینے پر مرکوز کر دی۔ میرے اپنے بھی عزائم تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح مصطفیٰ کی ذات اور اس کی سیاست میں اس طرح پیچ در پیچ پیوست تھے کہ انہیں الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کی شہرت کا سہارا درکار تھا۔ میں عملی سیاست میں صرف اس کی بیوی کے حوالے سے قدم رکھ سکتی تھی۔ میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں زندگی میں کوئی ایسا کام کر جانا چاہتی تھی جو وقیع اور قابل قدر ہو۔ مصطفیٰ جان گیا تھا کہ میرے آدرشوں کے حوالے سے وہ کتنا کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی سیاست میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے نے ہماری زندگیاں بدل ڈالیں۔ اسے پتہ تھا کہ سیاست ہی وہ میدان ہے جہاں میں اس کا احترام کر سکتی ہوں۔ یہ سامنے کے بجائے پہلو سے آ کر حملہ کرنے کے مترادف تھا۔ مصطفیٰ کی اس چال کا کامیاب ہونا مقدر بن چکا تھا۔

مصطفیٰ نے پاکستان لوٹنے کا فیصلہ محض اس بنا پر کیا کہ میں جو اس کے پاس واپس آ گئی ہوں تو ضرور اس میں کوئی راز ہے۔ اسے میرے محرکات پہ شبہ تھا۔ تاہم وہ وطن واپسی سے بھرپور سیاسی فائدہ اٹھانے کا متمنی بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ میری نظر میں ایک عظیم قائد بن جائے، ایسا قائد جو اچھی طرح یہ جاننے کے باوجود کہ وطن پہنچتے

ہی اسے قیدخانے میں ڈال دیا جائے گا اپنے عوام کے پاس واپس جا رہا تھا۔

اس عظیم فیصلے کی ذمے دار میں تھی۔ مصطفیٰ نے جس سے بھی مشورہ کیا اس نے خبردار کرتے ہوئے یہی کہا کہ واپس جانے کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ جتوئی صاحب نے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ اگر وہ واپس گیا تو جنرل اسے بخشیں گے نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ اسے وطن پہنچتے ہی جیل بھیج دیا جائے گا۔ کیا پتہ بھیں جیل سے کبھی زندہ سلامت باہر آنا نصیب ہو گا یا نہیں۔ مصطفیٰ نے وطن واپسی کے ان جوکھوں سے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پاکستان واپس جانے کے فیصلے کی ذمے داری کا بوجھ میں بھی اٹھاؤں۔

میں سامان پیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ میں بچوں سے ملنے کے لیے بے کل ہو رہی تھی۔ ہماری واپسی کا دن آ پہنچا۔ جتوئی صاحب نے یہ کہنے کے لیے فون کیا کہ مصطفیٰ ہرگز اس طیارے سے سفر نہ کرے۔

ہم دونوں کا ایک ڈرامائی آمنا سامنا ہوا۔ مصطفیٰ میرے کمرے میں، بکھرے ہوئے سامان سے بچتا بچاتا داخل ہوا۔ اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جذبے کی شدت سے چمک رہی تھیں: "تہمینہ، ہر کسی نے مجھ سے کہا کہ واپس مت جاؤ۔ میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کی طرف سے فیصلہ تم ہی کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم فیصلہ کرو کہ جن آزمائشوں سے مجھے گزرنا ہو گا آیا تم ان میں میرے ساتھ نباہ کر سکو گی؟ کیا تم میری خاطر جدوجہد کر سکو گی؟ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو کیا تم یہ قسم کھانے کو تیار ہو کہ تم میرے مقصدِ اعلیٰ کو آگے بڑھاؤ گی؟ اگر مجھے بھٹو صاحب کی طرح قتل کر دیا گیا تو کیا تم میری وفادار رہو گی؟ کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ اپنی زندگی میرے کاز کے لیے وقف کر دو گی اور دوبارہ شادی نہیں کرو گی؟ بولو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ واپس جانا میرے حق میں ٹھیک ہو گا؟ میرے لیے اپنی جلاوطنی کا مزید کوئی جواز پیش کرنا ممکن نہیں۔ مارشل لا اٹھا لیا گیا ہے۔ میرے عوام چاہتے ہیں اور مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں ان کے درمیان پہنچ جاؤں"۔

اس کے الفاظ، اس کے سوالات، ٹھیک نشانے پر جا لگے۔ وہ میرے ذہن کے اس خفیہ حصے تک سرایت کر گیا جہاں میں نے اپنے آدرشوں کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ذہن میں لگے ہوئے جالوں کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہا ہے۔ میں اس کی واپسی کی اصل وجہ بھول گئی---- کہ اسے میری نیت پر اعتبار نہ تھا۔ یکایک مجھے ایک ارفع و اعلیٰ تصور---- یعنی جلاوطن قائد کی واپسی---- سے عشق ہو گیا۔

مجھے پتہ تھا کہ جلاوطنی کے سبب مصطفٰے کی مسلسل غیرحاضری اسے سیاسی طور پر غیرفعال بنا دے گی۔ سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے پہلے ہی نئی طاقتیں اور نئے چہرے تیزی سے سامنے آ رہے تھے۔ ساری سیاست میں تغیرات کی ایک عظیم رو کارفرما تھی۔ سیاسی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں جن سے نمٹنے کے لیے نئی طرح سے پہل کرنے کی ضرورت تھی۔ نئی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مصطفٰے کو اپنی اہمیت منوانی پڑے گی۔ دور بیٹھے بیٹھے حکم چلاتے رہنا کافی نہ تھا۔ خود اپنے ہی پالے میں اپنی لڑائیاں لڑنے کے لیے اس کا موقع پر موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس بہادری سے ڈٹے رہنے کے سوا چارہ نہیں۔

میں نے یاد کیا کہ جب وہ پاکستان سے فرار ہوا تھا تو مجھے کتنی مایوسی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں جنگی حیلے کے تحت اس کی وہ پسپائی بزدلانہ فعل تھا۔ بھٹو صاحب نے اکیلے جان دی تھی۔ اب مصطفٰے کے پاس اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کرنے کا موقع تھا۔

میں نے ذمے داری قبول کر لی۔ میں نے کہا کہ میں اس کا ساتھ دوں گی۔ میں اس کے کاز کے لیے جدوجہد کروں گی۔ جب تک اس کی سیاست پر مجھے یقین اور اس کے آدرشوں کے لیے میرے دل میں احترام رہے گا میں اس کی رفاقت سے کنارہ کش نہ ہوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے سامنے ثابت کر کے دکھائے کہ اس کی جرأت مندی کی جو داستان مشہور ہو گئی ہے وہ عوام کی گھڑی ہوئی کہانی نہیں۔ یہ ثابت کرنا صرف اسی طور ممکن تھا کہ وہ اپنے سیاسی اعتقادات میں استقامت سے کام لے اور فوجی حکومت کے ساتھ کچھ لو کچھ دو کی پالیسی کے تحت سازباز نہ کرے۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں وہ طاقتور انسان ہے۔ لیکن میں ٹھہری کمزور۔ اس لیے میری کیا رائے۔ اب وقت ہے کہ وہ کسی دیو سے پنجہ لڑا کر دکھائے۔ اب وقت ہے کہ اپنے متعلق وہ جو کچھ کہتا رہتا ہے اس کے مطابق جی کر دکھائے۔ اب آمر سے دوبدو ہونے کا وقت ہے۔

اُس کمرے میں ہم نے ایک فیصلہ کیا، اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں اڑ گئی کہ ہمارا فیصلہ یہی ہونا چاہیے۔ میں نے اصرار کیا کہ ہمیں پاکستان چلنا چاہیے۔ میں نے قسم کھائی کہ چاہے کچھ ہو جائے میں ہر حال میں اس کا ساتھ دوں گی۔

جتوئی صاحب نے دوبارہ فون کیا۔ وہ مصطفٰے کے بارے میں بہت فکرمند تھے۔ مصطفٰے نے انھیں نہایت پرسکون آواز میں جواب دیا کہ اس نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے تیور ایسے آدمی کے سے تھے جو اپنے کسی عظیم خواب میں سانس لے رہا ہو۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا۔ دروازے پر پہنچ

کر وہ رکا، کمرے پر آخری نظر ڈالی اور بولا: "یاد رہے تمھارے سوا ہر کسی نے مجھے واپس جانے سے باز رکھنا چاہا۔ میں تمھاری خاطر واپس جا رہا ہوں"۔

مصطفٰے اور میں چلتے ہوئے کار تک گئے۔ اب وہ محض میرا شوہر نہ تھا۔ میرا قائد بن چکا تھا۔ مجھے پہلے اس سے محبت تھی۔ اب محبت کی جگہ اس کے مشن پر یقین لے چکا تھا۔

کھر بمقابلہ کھر نامی مقدمہ عدالت سے باہر طے اور رفت گزشت ہو چکا تھا۔ اب ہم ایک اعلیٰ تر عدالت کے سامنے جا رہے تھے۔ عوام کی عدالت کے سامنے۔

ایک ایسے مرد کے ساتھ پاکستان واپس جاتے ہوئے مجھے خجالت محسوس ہونے لگی جسے میں اخباروں میں "راسپوٹین" کے نام سے یاد کر چکی تھی۔ میں اس پریس کا سامنا کیسے کروں گی جس نے ہمارے ازدواجی لڑائی جھگڑے کو رقت آمیزی اور جذباتیت سے چرپرا ہوا ڈراما بنا کر رکھ دیا تھا؟ میں اس بات کی وضاحت کیسے کروں گی کہ میں نے اسی مرد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں جس نے میرے بچوں کو اغوا کر لیا تھا؟ میں نے اپنے اندیشوں کا ذکر کیا۔ مصطفٰے مسکرایا: "شرمندہ مجھے ہونا چاہیے، تمھیں نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ میں نے تمھیں واپس آنے پر مجبور کیا۔ تمھیں اپنی پوزیشن کی صراحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے وہی کیا جو درست تھا۔ عوام بھیڑ بکریوں کی طرح ہیں۔ ان کو ہر وہ شخص ہانک سکتا ہے جسے راستے کا علم ہو"۔

میری سمجھ میں آنے لگا کہ سیاستدان کی کھال موٹی ہی ہونی چاہیے۔ وہ اپنے پر کیچڑ اچھالے جانے کا عادی ہوتا ہے۔ اگر کیچڑ لگ بھی جائے تو وہ بس اسے جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ سیاست دان تشہیر کی آکسیجن میں سانس لیتے ہیں۔ اخباروں میں بالکل ذکر نہ آنا نقصان دہ ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر یہ ہے کہ بدنام کرنے والی خبریں ہی چھپتی رہیں۔ مصطفٰے نے خطرہ تو بے شک مول لیا لیکن اس سارے بیہودہ واقعے کو ایسا رخ دے دیا جس سے اس کی منفعت کا پہلو نکلتا تھا۔ وہ لوگوں کو ایسا قدامت پسند شخص دکھائی دیا جو اپنے بچوں کے اخلاق پر مغرب کے اثر کے بارے میں پریشان تھا۔ یہ اس طرح کی خبر تھی جو لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ مجھے مغرب زدہ، آزاد خیال عورت کے روپ میں دیکھا گیا۔ ایسا شاذ ہی دیکھنے میں آیا تھا کہ اس سماجی طبقے سے، جس کا میں حصہ تھی، تعلق رکھنے والی کسی عورت نے اپنے شوہر پر مقدمہ دائر کیا ہو یا اسے گرفتار کرانے کا منصوبہ گانٹھا ہو۔ ان تمام باتوں سے پڑتا تو کیا، مصطفٰے کچھ محظوظ ہی ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ مستقبل ہمارا ہے۔

یہ باتیں میرے لیے معنی رکھتی تھیں۔ میں اپنے آدرشوں کی وفادار تھی۔ جب

میں بچوں کی بازیابی کے لیے آپ سے باہر ہوئی جا رہی تھی تو میرے والد نے مجھ سے زبردستی جنرل ضیاء کے نام خط لکھوایا۔ میرے لیے یہ خط لکھنا بڑا مشکل ثابت ہوا۔ حالات سے مجبور ہو کر مجھے ایسا قدم اٹھانا پڑا جو میرے مزاج کے منافی تھا۔ میں ایک ایسے شخص سے مدد کی طلبگار تھی جو ان تمام چیزوں کی علامت بن چکا تھا جن کے خلاف ہم برسرِپیکار تھے۔ یہ میری آدرش پسندی کے ساتھ ظلم تھا، دھوکا تھا۔ میں نے یہ خط ماں کی حیثیت سے لکھا۔ میں اسے سیاستدان یا ایسے فرد کے طور پر خط لکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس نے مصطفےٰ کے دبستانِ سیاست میں تربیت حاصل کی ہو۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ اقتدار کی سیاست میں آدرش پسندی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

وطن جاتے ہوئے پورے ہوائی سفر کے دوران مصطفےٰ مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے یہ عہد دہرانے کو کہا کہ میں اس کی خاطر جدوجہد کروں گی۔ اس نے مختلف سیاسی منظر ناموں پر تبادلۂ خیال کیا اور سمجھایا کہ ہمیں ان سے کس طرح نمٹنا ہوگا۔ وہ واضح طور پر مضطرب اور بہت جذباتی نظر آ رہا تھا۔ جب اس پر تھکن غالب آ جاتی تو وہ ننھے حمزہ کو ساتھ لے کر سونے کے لیے بڑے مزے سے فرش پر دراز ہو جاتا۔

میں ابھی تک مخبوط الحواس تھی۔ مجھے دم لینے یا اپنی موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔ واقعات تتلیوں کی طرح گریزاں تھے۔ میں نے ان کے متعلق سوچنا ترک کر کے اپنی نظر بے کراں نیلاہٹ پر جما دی۔ طیارے سے باہر کی فضا کتنی پُرامن معلوم ہو رہی تھی۔

ہم نے جو سوچا تھا کہ پاکستان پہنچیں گے تو ہمارا استقبال ہوگا۔ سو وہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بالکل الٹ معاملہ دکھائی دیا۔ جلاوطنی کے دوران ہم جن ہجوموں کا خواب دیکھا کرتے تھے ان کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہمیں کسی لحاظ ملاحظے کے بغیر ہوائی اڈے کے ایک دفتر میں لے جایا گیا جہاں ہم انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں خبر پھیل گئی۔ چند لوگ اپنے قائد کی جھلک دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ چند ایک مقامی اخبار نویس بھی کسی طرح اندر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم ہدایات کے منتظر بیٹھے تھے۔ اس اثناء میں ہمیں لنچ پیش کیا گیا۔

مصطفےٰ، حمزہ اور میری ایک تصویر ہے جو اس وقت اخباروں کے صفحۂ اول پر چھپی تھی۔ مصطفےٰ حمزہ کو گود میں لیے بیٹھا ہے۔ اب وہ اصولوں کی خاطر مر مٹنے والے آدمی کی طرح اپنے لیے مصائب و آلام کا ایک ہالہ بہم پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہے جسے اپنے گرد کسی ولی جیسے تیقن کے ساتھ تانے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی تکبر، کوئی غصہ

نہیں۔ البتہ ایک متمرد سی اطاعت ضرور ہے۔ انداز سے اعتماد ہویدا ہے۔ اگر ہجوموں کی غیر موجودگی سے اسے کوئی مایوسی ہوئی ہے تو وہ اس کے چہرے کی کیفیت سے ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے۔ بیوی اس کے ہمراہ ہے۔ گھریلو بحران اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ مستقبل اس کے سامنے ہے۔

حمزہ حیرت زدہ نظر آ رہا ہے۔ میں "ماڈل" بیوی دکھائی دے رہی ہوں۔ میں نے اپنا لباس احتیاط سے چنا تھا۔ میری قمیض اصلی وائی ایس ایل ہے جس کے آر پار دیکھتے رنگوں میں شیر بنے ہیں۔ یہ میرے "شیرِ پنجاب" کی وفادار ہونے کی علامت ہے۔ میں نے لوئی فرائیڈ کی بنی ہوئی بغیر آستینوں کی قبا پہنی ہوئی ہے۔ اس شاہ خرچی پر مجھے جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ جب ہم اس ملک سے رخصت ہوئے تھے تو ہمارے پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے اور اب واپسی پر ان دوسی پلٹ لوگوں جیسے نظر آ رہے تھے جن کی بھونڈی امارت ضرب المثل بن چکی ہے۔ بہر کیف، اس وقت مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میری پوشاک بالکل بے تکی ہے۔

میں باہر جا کر جتوئی صاحب کی بیگم، خلیقہ، سے ملنا چاہتی تھی جو کار میں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے روکا گیا۔ میں گارڈ پر دہاڑی: "تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ میری گرفتاری کا وارنٹ تو دکھاؤ"۔ میں وہاں سے نکل آنے میں کامیاب ہو گئی۔ فوجی افسر شاہی سے یہ میری پہلی جھڑپ تھی۔ ایسی بہت سی جھڑپیں اور بھی ہوئی تھیں۔ مجھے پتہ چلا کہ بے دھڑک ہو کر ڈرانے دھمکانے سے کام بن جاتا ہے۔

میں واپس آئی تو ہمارے تمام بیگ کھلے پڑے تھے اور چیزیں کاؤنٹر پر ادھر سے ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ پہلے وہ مصطفےٰ کے کپڑے اور کتابیں لے گئے۔ پھر وہ اسے بھی ساتھ لے گئے۔ اسے کراچی کے ایک ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ میں لاہور چلی آئی۔

میری جتوئی صاحب اور ان کی نئی نئی تشکیل یافتہ نیشنل پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں پریس والے بھی تھے۔ انھوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ اخباری نمائندوں کے ساتھ میری پہلی مڈھ بھیڑ تھی۔ "کیا آپ اپنے شوہر کی خاطر جدوجہد کریں گی؟" "ہاں۔" "کیا آپ ان کی سیاست پر یقین رکھتی ہیں؟" "ہاں"۔ جو وعدہ میں نے مصطفےٰ سے کیا تھا میں اسے نباہ رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی اس وعدے کو نباہے گا جو اس نے مجھ سے اور عوام سے کیا تھا۔

جب ہم باہر آئے تو میں جذبات کے وفور سے بے حال ہو گئی۔ یہی وہ دن تھا جس کے خواب ہم دیکھتے آئے تھے۔ اس نے سالہاسال ہمیں سہارا دے رکھا تھا۔

اچانک مصطفےٰ کے ساتھ گزاری ہوئی ازدواجی زندگی کی تمام چھوٹی چھوٹی ہولناکیوں نے، ایک ایک کر کے، میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ میں اس شخص کی زبردست حامی اور واحد امید بنی یہاں کھڑی تھی؟ میں، جہنم جا کے لوٹ آئی تھی۔ میں جہنم کے نشیب و فراز سے اتنی اچھی طرح آشنا تھی۔

باب - ۳

جہنم کے نشیب و فراز

(1985-1977)

ذکر اس پری وش کا پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

ہم جرنیلوں کے ساتھ کسی طرح کی ان کہی مفاہمت کے بعد پاکستان سے روانہ ہوئے تھے۔ فوجی انقلاب کے بعد سیاسی مخالفین کی پکڑ دھکڑ جاری تھی بھٹو صاحب کو قتل کے ایک الزام میں دھر لیا گیا تھا۔ اسی الزام کی وجہ سے انھیں آخر جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مصطفےٰ نے پاکستان چھوڑنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر میں بے کل سی تھی۔ جس سہولت سے ہم پاکستان سے نکل آئے اس سے یہ بے کلی اور بڑھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم غداری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی بے اطمینانی کو لفظوں میں ادا کر سکوں۔ مصطفےٰ نے میری بے کلی کو بھانپ لیا اور کہا کہ ہمارا پاکستان سے نکل آنا بزدلی کا فعل نہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے سیاست میں اس طرح کی مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ مردہ سیاست داں جلد ہی میراث کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عوام کے لیے اپنی میراث آپ تیار کرنا مصطفےٰ کی سب سے بڑی ضرورت بن چکا تھا۔

ہم صبح سویرے اسلام آباد سے روانہ ہوئے۔ ہمارے لیے صورتِ حال بڑی کشیدہ تھی۔ مجھے اپنے ملک ہی کو نہیں اپنی تین ماہ کی بیٹی نصیبہ کو بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ مصطفےٰ کے خیال میں نصیبہ کو ساتھ لے جانے میں خطرہ بہت تھا۔ ہمارے سامنے کوئی قطعی منصوبہ تھا۔ ہمیں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ ہماری اولیں منزل لندن ہے۔ ہمارے

پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے۔ جو پاؤنڈوں میں تبدیل ہونے کے بعد حقیر سی رقم بن کر رہ جاتے تھے۔

جب طیارہ رن وے کے آخر پر رکا پرواز کی اجازت ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے مصطفےٰ کے ماتھے پر پسینہ پھوٹتے دیکھا۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ اس کی کنپٹیاں دھک دھک کر رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جنرل متلون مزاج ہیں۔ وہ اپنا ارادہ بدل بھی سکتے ہیں۔ بہر حال، انھوں نے ارادہ بدلا نہیں۔ طیارہ حرکت میں آیا۔ فضا میں بلند ہوا۔ میں نے نیچے اپنے ملک کو دور ہٹتے دیکھا۔ مصطفےٰ کی نظر اب مستقبل پر جمی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کی جان میں جان آ گئی ہے۔ وہ تختۂ دار کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

انگلستان میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ہم جا کر ٹھہر سکتے۔ مصطفےٰ نے طیارے میں ایک پاکستانی تارک وطن کو، جس پر انگریزیت اتنی غالب آ گئی تھی کہ وہ خود کو بیری کہنے لگا تھا، باتوں میں لگا لیا۔ چھ گھنٹے بعد بیری ہمارا دوست بن چکا تھا۔ وہ ہمارے کاز کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ ملک سے باہر رہنے کے باوجود ابھی تک دل سے پاکستانی تھا۔ اس نے کہا کہ ہم اسے شرف میزبانی بخشیں۔ مصطفےٰ نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

بیری ارلز کورٹ میں ایک کونسل فلیٹ میں مقیم تھا۔ ہم ایسے غریبانہ علاقے میں اپنی خوشی سے نہ ٹھہرے تھے۔ مجبور کی کیا مرضی۔ فلیٹ چھوٹا سا تھا۔ میں وہاں بہت تنگ تھی۔ میزبان نے ہمارا بڑا خیال رکھا۔ مصطفےٰ نے خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ آخر وہ جلاوطن ہی تو تھا اور بے آرامی اور جلاوطنی لازم و ملزوم ہیں۔

میں راتوں کو زیادہ وقت جاگتی رہتی۔ میں مضطرب تھی۔ میں پاکستان سے بھاگ آنے پر مضطرب تھی۔ میں بھٹو صاحب کو موت کی کوٹھری میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے آنے پر مضطرب تھی۔ مجھے اس مشکوک لین دین کی وجہ سے اضطراب تھا جس کے نتیجے میں ہمیں پاکستان سے باہر جانے کی اجازت ملی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ مصطفےٰ نے کیا ٹیپ اڑائی تھی لیکن میرا دل کہتا تھا کہ اس نے زندگی بچانے کی خاطر اپنی عزت کا سودا کیا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر مجھے کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تو میں وطن ہی میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔ جلاوطنی، اپنے تمام رومانی اشاروں کنایوں کے باوجود مشکلات سے بچنے کا آسان طریقہ ہے۔ مصطفےٰ کی سیاسی سوجھ بوجھ سے مایوس ہو کر مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ انقلاب برپا ہو چکا ہے اور میں سر اٹھائے، سینہ تانے، پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ جب پھانسی کا پھندا میرے گلے کے گرد تنگ ہوا تو مجھے لرزش تک نہ ہوئی۔

پہلے چند ہفتے برطانیہ اور یورپ میں دوسرے جلاوطنوں سے رابطہ استوار کرنے میں گزرے۔ مصطفےٰ دوسروں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ جلاوطنی کی سیاست کا آغاز ہو گیا۔ اسی دوران میں ہم نے میرے روٹھے ہوئے والدین سے صلح صفائی کی کوشش کی میرے والد ابھی تک اس بات کو قبول کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکے تھے کہ میں نے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی ہے جو نہ صرف مجھ سے بیس سال بڑا ہے بلکہ پہلے ہی کئی شادیاں کر چکا ہے۔ امی ہم سے راضی ہو چکی تھیں۔ مصطفےٰ کو بڑی تشویش لاحق ہو گئی کہ میں اپنے والدین سے اختلاف دور کیوں نہیں کرتی۔ مجھے لگا کہ وہ مالی طور پر خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے اور مزید کسی مزاحمت کے لیے تیار ہے۔ گویا اس کے کردار کے رش پرنٹ میری نظر سے گزر رہے تھے۔ میں نے اس کی وہ کمزوریاں دیکھ لیں جنھیں وہ اپنی سخت گیر ظاہری وضع کی اوٹ میں چھپائے رکھتا تھا۔ ادھر اپنی بچی کے بغیر مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اور کسی بات کا مجھے دھیان ہی نہ تھا۔ ہر بار جب میں سڑک پر یا پارک میں کسی بچے کو پرام میں لیٹا دیکھتی تو میری مامتا بیدار ہو جاتی۔ میرے لیے ہر بچے پر کشش تھا اور محض اسے دیکھتے رہنے سے مجھے اتنا لطف آتا جیسے میں اپنی ہی بیٹی کو دیکھ رہی ہوں مصطفےٰ غالباً اسے کمزور، نسوانی جذباتیت کا ایک اور مظاہرہ سمجھتا تھا۔ دو کمزور افراد نامعلوم کے روبرو۔

میرے والدین سپین میں ماربیلا نامی جگہ مقیم تھے۔ میں نے امی سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، میں جانتی تھی کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں اور میں اس اذیت کو محسوس کر سکتی تھی۔ جو انھیں پہنچی تھی۔ میں ان کے اصولوں کی عزت کرتی تھی اور مجھے اس بات پر دل میں فخر تھا کہ اپنے تمام کرب کے باوجود انھوں نے اپنے اصولوں کو کبھی ترک نہ کیا تھا۔

ہم ملاگا کے ہوائی اڈے پر اترے اور کار سے ماربیلا پہنچے۔ وہاں ہم نے ہالیڈے ان میں کمرہ لیا۔ میرے والدین نے ہمارے لیے اپنی کار بھجوا دی تھی ان کا ولا سمندر کنارے واقع تھا۔ ہمیں ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ آگے چل کر اس ڈنر سے کیسا فساد برپا ہو گا۔

میری بہنیں منو زرمینہ اور عدیلہ، جو سب غیر شادی شدہ تھیں۔ ان دنوں میرے والدین کے پاس رہتی تھیں۔ گھر میں منو جیسی نٹ کھٹ کوئی نہ تھی۔ وہ (O) لیول کی تیاری کر رہی تھی۔ اتنی مدت کے بعد مجھ سے ملنے پر اسکا جوش و خروش دیدنی تھا۔ زرمینہ ابھی پندرہ سال کی تھی۔ مگر ملبوسات ڈیزائن کرنے میں مہارت حاصل کرنے کی

شان چکی تھی۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اس روز اس نے عروسی گون سے مشابہ، ڈھیر ساری جھالروں والی، عجوبہ پوشاک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں ایک گلاب اڑسا ہوا تھا۔ وہ کوئی ہسپانوی سینیورا لگ رہی تھی۔ اس نے ہمیں متاثر کرنے کے لیے اپنے بہترین کپڑے زیب تن کیے تھے۔

عدیلہ نے کالی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ بھی اپنی بہن سے مل کر خوشی اور جوش سے پھولی نہ سما رہی تھی اور میری سرکشی کو چوری چوری تحسین کی نظر سے دیکھتی تھی۔ میں نے ای سے، جن کا مزاج آمرانہ تھا، لڑجھگڑ کر ایک ایسے شخص سے شادی کر لی تھی۔ جو مشہور تو تھا لیکن اپنے ماضی کے حوالے سے بدنام بھی خاصا تھا۔ عدیلہ کو بڑا تجسس تھا کہ دیکھے تو سہی یہ مقتدر آدمی، جو اب اس کا بہنوئی بن چکا ہے کیسا ہے۔

میرے والد نے شفقت بھرے انداز میں مجھے گلے لگایا۔ میں رو پڑی۔ وہ کہنے لگے۔ "تمہارے فیصلے سے مجھے پریشانی بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی پہنچا تھا۔ اس کے باوجود آج میں پرانی رنجشیں بھلا کر تمہیں دوبارہ دل میں جگہ دے رہا ہوں۔ یہ تمہاری دوسری شادی ہے اور میری یہی خواہش ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو تم اپنے میاں کو ہرگز نہ چھوڑو۔ اب تمہیں اس کے گھر سے مر کر ہی نکلنا چاہیے۔ میں اسی شرط پر تمہیں خاندان میں پھر سے جگہ دے رہا ہوں"۔ میں نے عہد کیا کہ چاہے کوئی وجہ ہو حالات چاہے کیسا بھی رخ اختیار کرلیں، میں مصطفےٰ کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اس وقت مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ میں کتنی مشکل کمٹ منٹ کر رہی ہوں۔

ماحول میں جو تھوڑی بہت کشیدگی باقی تھی وہ تحلیل ہو گئی۔ منو بغیر رکے بولے جا رہی تھی۔ زرمینہ کا رویہ بہت ہی پیار بھرا تھا۔ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھنا چاہتی تھی۔ بس عدیلہ کی کسمساہٹ ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس وقت وہ صرف تیرہ سال کی تھی۔

عدیلہ اور مصطفےٰ میں کوئی بات بڑی عجیب سی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا مجھے محسوس ہو رہا تھا دو خبیث ذہن ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے ہوں۔ زیادہ عمر والا ذہن جسے ایک نوخیز شکار ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر خوش تھا کہ جسے اس نے اپنی مدعا گردانا ہے وہ بھی اس کی طرف اتنی ہی شدت سے مائل ہے یہی وہ عورت تھی جسے وہ اتنے بہت سے آلودہ بستروں اور مسلے روندے جسموں میں ڈھونڈتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جس عورت کےلیے وہ ترستا رہا تھا وہ اچھی یا نیک یا معزز یا حساس یا رحمدل نہیں تھی۔ وہ تو پھانسنے پھنسانے میں طاق ایک کمسن تھی۔ وہ خود اسی

کا عکس تھی۔ کمپلکسوں اور نفرتوں سے اٹی ہوئی شخصیت۔ تقاضائے فطری بھی یہی تھا۔ شہر صرف شہرنی سے تعلق قائم کرتا ہے اور کتا کتیا سے۔ شیطان مجسم کا کسی فانی بندے بشر کے ساتھ گزارا کہاں ہو سکتا ہے۔ عدیلہ میں اس طرح کے سبھی گن بھرے ہوئے تھے۔ ان کے مابین عہد و پیمان ہو گئے۔

وہ مل جل کر وار کرتے تو ان کا مارا پانی نہ مانگتا۔ ان کی فریب کاریوں کے فسانے ہر طرف مشہور ہو گئے۔ جو کوئی ان کے جال میں آ جاتا وہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ وہ دوسروں کے دلوں پر چھریاں چلاتے اور انھیں تڑپتا دیکھ کر لذت کے مارے کھلکھلاتے۔ وہ اپنے شکار کو بہلا پھسلا کر دیوانگی کے کنارے تک لے آتے اور پھر جب وہ قعر مذلت میں لڑھکنیاں کھاتا تو کھڑے بغلیں بجاتے۔ اس دن کے بعد میں بھی ان کے لیے ایک ایسا ہی شکار ثابت ہوئی۔

ہم ماربیلا میں ٹھیرے رہے۔ اپنی بچی کی وجہ سے میرا جی مٹی ہوا جا رہا تھا۔ والد صاحب نے اسے بلانے کا بندوبست کیا۔ ہماری خوشی اور جوش کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ہم اسے لینے گئے۔ نصیبہ کو اپنی تینوں خالاؤں سے ملوایا گیا تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری گڑیا کو دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ دائی عائشہ میری ننھی کے ساتھ آئی تھی۔ لگتا تھا کہ اب میری زندگی بڑی حد تک مکمل ہو چکی ہے۔ مجھے دوبارہ اپنے خاندان پر رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ میرے شوہر پر کسی قسم کی بڑبڑاہٹ طاری نہ تھی۔ ای اور مصطفےٰ کی خوب نبھ رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ ای کے ساتھ میرے تعلقات بھی خاصے سدھر چکے ہیں۔

میرے والدین نے پیش کش کی کہ ہم انگلینڈ میں ان کے اپارٹ منٹ میں اٹھ آئیں۔ ہم ماربل آرچ چلے گئے۔ اس جگہ کا اور بیری کی ارلز کورٹ کی کھولیوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ منو زرمینہ اور عدیلہ بھی ماربیلا سے ہمارے ساتھ واپس آئیں۔ وہ بیچ بل، ہیڈلے وڈ میں اپنے گھر میں رہنے لگیں۔

یہاں میں آرام سے تھی۔ گویا میں ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں مجھے اپنے طبقے کا مخصوص تحفظ حاصل تھا۔ مصطفےٰ کو ذرا زیادہ تذبذب کا سامنا کرنا پڑا اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں کچھ دیر لگی۔ اب ہم نے بڑے ٹھاٹ باٹ سے لوگوں کو دعوتوں پر بلانا شروع کر دیا۔

ایک شام ہم نے پاکستان سے آنے والے بعض پرانے دوستوں، ماریا جتوئی، حسنی اور چند لوگوں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ میں نے ای کے ہاں سے قیمتی کٹلری منگوائی۔ عدیلہ اور زرمینہ کٹلری لے کر آئیں۔ مصطفےٰ کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ میں

دعوت کے انتظامات کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ زرمینہ جا کر بچی سے لاڈ پیار کرنے لگی اور عدیلہ چپ چپاتے شراب پر پل پڑی۔ ہمیں اس کی حرکات سے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ اس طرح غٹاغٹ شراب پی رہی تھی جیسے یو کے میں شراب پر پابندی بس عائد ہی ہونے والی ہو۔ جلد ہی وہ نشے کی دھند میں ادھر اُدھر ڈولنے لگی۔ ہمیں دیر میں پتا چلا۔ ووڈکا اس کے سر کو چڑھ گئی۔ اس نے فی الفور اپنے تمام حجابات کو پس پشت ڈال دیا۔ زرمینہ اور مجھے اس پر سخت طیش آیا۔ اس نے ہمیں گھاس بھی نہ ڈالی اور ایسی حرکتیں کرتی رہی جن سے ہمیں زیادہ سے زیادہ اشتعال آ جائے۔ وہ لونگ روم میں لڑکھڑاتی پھرتی رہی۔ بار بار گر جاتی۔ ہم اسے گھسیٹ کر بیڈ روم میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ہمارا مقابلہ کیا اور ہمیں پرے دھکیلتی رہی۔ مجھے یہ پریشانی تھی کہ مہمان آ گئے تو وہ اسے اس حالت میں دیکھ لیں گے۔ بڑا ڈر یہ تھا کہ کہیں یہ بات ہمارے والدین تک نہ پہنچ جائے۔ شرمندہ ہو کر بادل ناخواستہ میں نے مصطفیٰ کا سہارا لیا تاکہ وہ اسے ٹھیک کرے۔ "مصطفیٰ تمہیں اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کی اچھی طرح خبر لو اور یہاں سے چلتا کرو"۔

مصطفیٰ عدیلہ کی طرف بڑھا۔ اسے اپنے پر کچھ زیادہ اعتماد نہ تھا اور بظاہر ہچکچا رہا تھا۔ اس نے عدیلہ کو پکڑنا چاہا۔ عدیلہ نے ہاتھ پیر مارے۔ بظاہر مصطفیٰ کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں وہ اس کے زیادہ قریب ہو گئی۔ ایک پل کے لیے وہ ٹھٹکے۔ عدیلہ ڈھیلی پڑ گئی اور گھر جانے پر آمادہ ہو گئی۔

تینوں بہنوں نے جلدی سے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم متفق تھے کہ یہ واقعہ امی سے چھپانا پڑے گا کیوں کہ ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے ملنے جلنے پر پابندی لگا دیں گی۔ اس طرح کی دیدہ دلیرانہ بے اعتدالی پر پردہ پڑا رہا۔ میں اسے اپنے ذہن سے فراموش نہ کر سکی۔ بدگمانی کا بیج بو دیا گیا تھا وہ جلد ہی پھوٹ آنے کو تھا اور بڑھ کر میرے پورے وجود میں پھیل جانے والے شک کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔

میرے والدین کی خواہش تھی کہ ہم بیچ بل آ کر ان کے ساتھ رہنے لگیں۔ امی کو سیاست سے بڑی دلچسپی تھی اور مصطفیٰ کی رفاقت سے بہت لطف اندوز ہوتی تھیں۔ مصطفیٰ چھوٹے چھوٹے پر لطف واقعات سنا کر انہیں بہلاتا رہتا اور سیال سیاسی صورت حال کا بڑی بصیرت سے تجزیہ کرتا۔ وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ میرے والد نے زیادہ محتاط رویہ اپنایا۔ انھوں نے میزبانی کا حق تو پورا پورا ادا کیا، مصطفیٰ کو ڈیویڈوف سگار پیش کرتے اور موقع محل کی مناسبت سے "ہوں ہاں" "واہ" "خوب" وغیرہ کہتے رہتے لیکن اپنی اور مصطفیٰ کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا۔ ان کے تعلقات رسمی سطح سے آگے نہ بڑھے۔

میں ذہن میں مصطفیٰ اور امی کا موازنہ کرتی تو مجھے اپنی حالت پر ہنسی آتی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ امی کے قلبے سے نجات پا کر میں ایک ظالم کی گود میں جا گری تھی۔ امی نے تو مجھے کھا ڈالا تھا۔ ان کا مزاج آمرانہ تھا۔ ان کی زندگی میں دوسرے لوگوں کی آرام کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہی حال مصطفیٰ کا بھی تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے پاس یہ آمرانہ خصوصیات کچھ زیادہ ہی بڑھی چڑھی نظر آتی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے خدا کی طرف سے مجھے اپنے پہلے شوہر سے بے وفائی کرنے کی سزا مل رہی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ میں سب سے کٹ چکی ہوں۔ میرے خاندان پر مصطفیٰ نے قبضہ جما لیا تھا۔ وہ اسی خاندان کا فرد بن گیا تھا جس سے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں اور باقی گھر والوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔ امی کو بھی میری طرح اس کی ذات میں ایک آدرش پسند انسان نظر آیا اور وہ اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ انھوں نے اس کی شادیوں، بہت السیشوں اور قلابازیوں اور اس کی خراب شہرت کو نظر انداز کر دیا۔ وہ پوری طرح اسکے سحر میں گرفتار ہو چکی تھیں۔

ہر روز وہ منہ اندھیرے اٹھ کر یوگا کی مشقیں کرتا اور پھر میرے والدین کے پاس ان کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ وہ خبروں پر تبادلہ خیال اور صورت حال کے بارے میں قیاس آرائی کرتے۔ ان کا تعلق ایک ہی نسل سے تھا اور ان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ میرے والدین کو خبر بھی نہ تھی کہ اس دلآویز شخص نے، جو ان کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا ہے، کل رات ان کی بیٹی کو ستایا اور مارا پیٹا تھا۔

مصطفیٰ انتہا کا بدمزاج تھا۔ وہ پہلے بھی مجھے مار پیٹ چکا تھا۔ والدین کے گھر آ کر میری زیادہ دھنائی ہونے لگی کیوں کہ میں تکلیف، تضحیک اور تذلیل سے پہنچنے والی سخت اذیت کو چپ چاپ پی جانے پر مجبور تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات کا بہانہ بنا کر مجھے گالیاں دیتا اور مارتا۔

ماضی میں میری ٹھکائی میری پہلی شادی کے بہانے کی جاتی تھی۔ وہ مجھ پر الزام لگاتا کہ میں اپنے سابقہ شوہر کے عشق میں مبتلا ہوں، بدکاری کرنے کی اہل ہوں، میں نے کسی اور مرد کے ساتھ بیاہے جانے کے بعد اس سے شادی کی تھی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ جاتی۔ میرے ذہن میں ابتری کے سوا کچھ نہ رہا۔ مجھے کسی بھی طرح کے جذبات کا اظہار کرنے سے خوف آنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے جواب میں لگاؤ کا ذرا سی بھی ثبوت دیا تو اس کے ذہن میں یہ گمان اور پختہ ہو جائے گا کہ میں کوئی عام قسم کی آوارہ عورت ہوں۔ یہ الجھن جاگیردارانہ ذہن کی خصوصیت ہے۔ جاگیردار سمجھتے ہیں کہ عورت صرف انہیں لذت پہنچانے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر اس کی

حرکتوں سے کبھی یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ خود بھی مزہ لے رہی ہے تو یقیناً اس کے اندر کوئی چھنال چھپی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی کھل کر سامنے آ سکتی ہے۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں۔ مصطفیٰ کو یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ میری کامنا کو کچل چکا ہے۔ اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کے نتائج بہت ہولناک تھے۔ میں اس گورکھ دھندے کو یہ سمجھ کر برداشت کرتی رہی کہ میں اس کے کسی کام تو آ رہی ہوں۔ میری یہی افادیت سہی۔

ہماری لڑائیاں اب خاندان والوں کے حوالے سے ہونے لگیں۔ وہ کھانے کی میز پر ہونے والی بات چیت میں سے اپنے مطلب کی باریکیاں چھانٹ کر انہیں میرے خلاف استعمال میں لاتا۔ جو باتیں میں ہرگز کسی کو نہ بتاتی اور جو میں نے، اپنے حق میں کانٹے بوتے ہوئے، اسے اعتماد میں لے کر بتادی تھیں، وہ انہیں کے ذریعے ٹوہ لیتا رہا کہ خاندان کے بارے میں میرے احساسات کیا ہیں۔ میں نے امی سے اپنے تعلقات کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ مصطفیٰ نے اس بات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان انکشافات کی جانب اشارے کر کر کے مجھے ذہنی عذاب دینا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر بات کو امی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا۔ اس نے یکایک مجھے احسان فراموش اور ناقابل اعتبار بیٹی قرار دے ڈالا۔ وہ بڑے طریقے سے ماں اور بیٹی کے درمیان حائل خلیج کو وسیع تر کرنے لگا۔ درحقیقت وہ میری تمام کشتیوں کو نذرآتش کرنے میں مصروف تھا تاکہ میں پابستہ اور لاچار ہو کر اس کے جزیرے سے کہیں نہ جا سکوں اور اس کا ظالمانہ راج سہے جاؤں۔ اس نے مجھے اپنے گھر والوں سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ماضی کو کرید کرید کر مجھے وہ تمام مشکلیں یاد دلاتا رہا جن کا مجھے اپنے خاندان کی وجہ سے سامنا کرنا پڑا تھا، اور یہ سب اس نے ایسے وقت کیا جب مجھے ان باتوں کو ذہن سے مٹا دینے کی سعی کرنی چاہیے تھی۔ وہ مجھے گھسیٹ کر میرے ماضی میں لے گیا اور مجبور کیا کہ میں اسے دوبارہ بسر کروں۔ میرے لیے آگے جانا ممکن نہ رہا۔ میں اپنے ہی انکشافات کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

پھر کبھی کبھار وہ حلیف کا روپ دھار لیتا۔ "میں سوچتا ہوں کہ ان بدگمانیوں کے بارے میں جو تمہیں اپنی امی سے پیدا ہو گئی ہیں مجھے تمہاری امی سے بات کرنی چاہیے۔ ان ساری باتوں کا جو تم نے مجھے سنائی ہیں، سامنے آنا ضروری ہے۔ انہیں یہ احساس تو ہو کہ ان کی وجہ سے تمہیں کتنی تکلیف پہنچی ہے"۔

یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو جاتے۔ یہ مصطفیٰ کو معلوم تھا۔ وہ مجھے صاف صاف بلیک میل کر رہا تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ امی اور مصطفیٰ دونوں سے ٹکر لے

سکتی۔ میں اس کی منت سماجت کرتی کہ امی سے کچھ نہ کہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح چپ رکھنے کے لیے میں اس کی ہرجفاکارانہ من موج کو سہتی رہتی۔

عذاب گاہ سے باہر آتے ہی مجھے مجبوراً ایسی وضع اختیار کرنی پڑتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بدن پر جہاں جہاں نیل پڑے ہوتے ان پر تو میں جوں توں کر کے پردہ ڈال دیتی لیکن جو تبدیلی میرے مزاج میں آتی تھی وہ میری روح میں گھاؤ ڈالتی جارہی تھی۔ امی کو پتہ چل گیا کہ میں کس مشکل میں ہوں لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ وہ اس چیز کی بڑی سختی سے قائل تھیں کہ آدمی کو اپنی نجی زندگی سات قفلوں میں چھپا کر رکھنی چاہیے۔ میرے اعصاب ادھڑنے لگے۔ میں نے ویلیم کھانی شروع کر دی۔ والد صاحب کو اس پر حیرانی ہوئی اور انہوں نے مجھے ٹوکا۔ اس کے برعکس امی نے میری ویلیم خوری کو حق بجانب قرار دیا۔ کہنے لگیں کہ اپنے ذہنی کھچاؤ کو کم کرنے اور اعصاب کو تسکین دینے کے لیے اسے ویلیم کی ضرورت ہے۔ انہوں نے میری ذہنی کیفیت کی ممکنہ وجہ کی طرف کبھی بھول کر بھی اشارہ نہ کیا۔ وہ اس طرح بات کرتیں جیسے عام سا مشورہ دے رہی ہوں: "اگر شوہر کوئی عجیب یا غیر معقول رویہ اپنا لے تو اسے بیمار سمجھو اور اس سے وہی سلوک کرو جو بیماروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بیمار کو طبی نگہداشت اور علاج معالجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے میاں سے اسی طرح نمٹو"۔

میں نے ان کا مشورہ مان لیا۔ سوچا کہ شاید یہ نئی حکمت عملی کارگر ثابت ہو۔ میں نے مصطفیٰ کے تشدد اور بد مزاجی کو بیمار ذہن کا شاخسانہ قرار دیا۔ اس پر غصے کا دورہ پڑتا تو میں طرح دے جاتی۔ میرے جسم کو اذیت پہنچتی رہی لیکن ذہن کی خلاصی ہو گئی۔

جلاوطنی کے پہلے دو مہینوں کے دوران مصطفیٰ کو اپنی سیاسی مصروفیات سے نسبتاً فراغت حاصل رہی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال پاکستان واپس نہیں جائے گا۔ اس نے بھٹو صاحب کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ وہ خود کو دوسروں سے الگ تھلگ محسوس کر رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ حالات کروٹ لیں گے۔ اسے اپنی پرانی زندگی کے ٹھاٹ باٹ کی یاد ستانے لگی۔ وہ دوسرے درجے کا شہری بن کر جینے کا عادی نہ تھا۔ اسے اپنے ملازموں اور جھک جھک کر سلام کرنے والے چیلوں چانٹوں اور یاروں دوستوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے "حضور والا" ہونے کی یاد ستا رہی تھی۔ اسے بدیس میں رہنا اچھا نہ لگتا تھا۔

بدلے ہوئے ماحول کا حصہ بننے میں مجھے کم دقت ہوئی۔ مجھے انگلینڈ میں رہنے میں مزہ آتا تھا۔ مجھے ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے خاصے مواقع ملے تھے اور کسی خو

ملک میں قیام میرے لیے عام سی بات تھی۔ اجنبی ماحول مانوس معلوم ہوتا سینڈوچ کھانا اور ساتھ ہی ساتھ کوک پیتے جانا برا بھاتا۔ مجھے آزادی کے اس احساس سے لگاؤ تھا جو پاکستان کے گھٹے گھٹے ماحول میں میسر نہ آ سکتا تھا۔ جتنی دیر ہم والد صاحب کی کوٹھی میں رہے، جو گولف کورس کے بالمقابل دو ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی، ہمیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ہمارے معیارِ زندگی میں کوئی فرق آیا ہے۔ ہماری خدمت بجا لانے کے لیے دو نوکرانیاں، ایک عدد باورچی، ایک شوفر اور ایک بٹلر موجود تھا۔ مصطفےٰ کو میرے والدین کی امارت سے چڑ تھی۔ ان کی وضع داری اور خوش اسلوبی سے، جو یوں لگتا تھا جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہو، وہ جل جاتا تھا۔ لیکن اس خوش سلیقگی اور رکھ رکھاؤ کو اپنانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے اجڈ پن اور ناشائستگی کی، ٹی شرٹ پر جلی حروف میں لکھے کسی نعرے کی طرح، نمائش کرتا پھرتا۔ بعض لوگوں کا وتیرہ ہے کہ اپنے سے برتر افراد سے جھک جھک کر اور اپنے سے کمتر لوگوں سے خسروانہ بے نیازی کے ساتھ ملتے ہیں۔ مصطفےٰ نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس سے بالکل الٹ روش اختیار کی یعنی برتر افراد کے ساتھ خسروانہ بے نیازی سے اور کمتر لوگوں سے جھک جھک کر ملنے لگا۔ اس نے اس خاندان سے انتقام لینے کے ٹھان لی جو محض اپنی وضع قطع پر قائم رہ کر نادانستہ طور پر اسے کھلا رہا تھا۔ مصطفےٰ نے ہمیں یہ کبھی نہ بھولنے دیا کہ اسے ہم سے کتنی کد ہے۔

میں جانتی تھی کہ اس پر کیا افتاد پڑی ہے۔ میں نے اسے سہارا دینا چاہا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ بیمار ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بیچ وطن کے لیے کلپ رہا تھا۔ وہ اس جاہ و حشم کی کمی محسوس کرتا ہے جو برسراقتدار ہونے کے وقت اسے حاصل تھا۔ مجھے اپنے پر خاصی حیرت ہوئی۔ میرے تھکے ہارے ذہن نے گاہے گاہے تجزیہ کرنا اور حالات کی عقلی تاویلات ڈھونڈنی شروع کر دی تھیں۔ میں اس ماؤف حالت سے رفتہ رفتہ ہوش میں آ چلی تھی جو نامعقول تشدد اور احتیاط سے چنے وقفوں سے کی جانے والی تذلیل کی وجہ سے مجھ پر طاری تھی۔

اس کی محرومی، دربدری اور ناتواں ہو کر رہ جانے کے احساس کو اپنے پر طاری کر لینا اب میرے لیے ممکن ہو گیا۔ جب پاکستان میں اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور سیاست میں تازہ تازہ بار پانے والے اوچھوں نے اس کی طاقت ملیامیٹ کر ڈالی تو میں نے اس سے ہمدردی محسوس کی۔ جب ایک فوجی عدالت نے، اس کی غیر موجودگی میں، اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی تو اس کی طرح مجھے بھی غصہ آیا۔ جب اس نے سنا کہ اس کی ماں جی اور اہل خانہ کو بے دردی کے ساتھ اس کے گھر سے نکال دیا گیا ہے اور اس کے تمام منقولہ اثاثے ضبط کیے جا چکے ہیں تو میں جان گئی کہ اسے کتنا

قلق ہوا ہے۔ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کے اپنے بھائیوں نے اس کے انتخابی حلقے میں دخل دیا ہے تو میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کی۔ مصطفےٰ خود کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی سرزمین کے اور اپنے درمیان جو دوری پیدا کر لی تھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی بدمزاجی اور دریدہ دہن فطرت کو معاف کرنے کی عادت ڈال لی۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنے لیے یہ کردار چن لیا کہ غلطی چاہے کوئی کرے، غلطی کی سزا بھگتنا میرا کام ہے۔ میں نے اس شخص کو، جس نے کبھی ایک پورے صوبے کے نظم و نسق کو انتہائی سخت گیری سے چلایا تھا۔ یہ اجازت دے دی کہ وہ میرا بندوبست بھی سنبھال لے۔ اس کا ہاتھ ایک دفعہ بھی نہ کانپا۔

خوش قسمتی سے نصیبہ اس کی پہنچ سے دور تھی۔ وہ ہر وقت میری بہنوں کے پاس رہتی جنہیں روایتی خالاؤں کی طرح اس کے ناز اٹھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے اس لحاظ سے تسکین کا باعث تھی کہ غیر نارمل حالت میں رہنے والے اس غیر نارمل آدمی سے کم از کم نصیبہ کو بچاتے پھرنے کے دردِ سر سے تو مجھے نجات ملی۔

یہ بڑے صبر آزما دن تھے۔ اپنی حالت چھپانے کے لیے میں ہر وقت اداکاری کرتی رہتی۔ اس خیال سے میرا خون خشک ہوا جاتا تھا کہ کہیں میری ازدواجی زندگی کا بھرم نہ کھل جائے۔ میں نے مصطفےٰ کو خوش رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس امر کو یقینی بنانے کی خاطر کہ ہم میں کوئی تصادم نہ ہو میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میں تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لیے مسلسل جتن کرتی رہی۔ مصطفےٰ نے میرے ذہنی انتشار کو بھانپ لیا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں اپنے دردِ پنہاں کا کسی سے ذکر کرتی تو کیوں کر۔ مصطفےٰ نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتایا جائے میں کسی پر تکیہ نہ کر سکتی تھی۔

میں گھر سے کہیں جاتی تو وہ خواہ مخواہ میرے بارے میں بدگمان ہوتا رہتا۔ میرا کہیں اکیلے جانا تو اسے سرے سے گوارا نہ تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کر ہی نہ سکتا تھا۔ متعدد بار امی نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ لنچ پر یا ڈاکٹر کے پاس یا محض شاپنگ کرنے چلوں۔ میں نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ یہ انکار صرف میری خودغرضی کا نتیجہ ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اصل وجہ انہیں بتا دوں لیکن اس خوف سے کہ اس طرح میری دکھ بھری ازدواجی زندگی کا راز فاش ہو جائے گا، دل کی دل میں رہ جاتی۔

بر پھر کر میں اس کے گن گانے پر اتر آتی۔ مصطفےٰ تھوڑی دیر کے لیے سدھر جایا کرتا۔ اس وقت وہ ٹوٹ کر پیار کرنے لگتا۔ اکثر جب اس کی طبیعت میں وقتی طور پر گداز پیدا ہو جاتا، وہ مجھے اور میرے صبر و تحمل کو سراہتا: "تمھیں پتہ بھی ہے تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔ تمھارے بغیر میں نامکمل ہوں۔ یہ میری زندگی کا ایسا دور رہا ہے جس میں میرے حصے میں ناکامیوں کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہ دور بھی گزر جائے گا۔ دیکھ لینا۔ میں بدل جاؤں گا اور اپنی تمام زیادتیوں کی تلافی کر دوں گا۔ قریب تھا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔ صرف تمھاری محبت اور ارادت کی وجہ سے میرے ہوش و حواس بحال رہ سکے"۔

وہ جذباتی ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے: "تم ایک بہت ہی مشکل وقت میری زندگی میں آئیں۔ میرے ارد گرد ہر چیز ڈھے چکی ہے لیکن تم میرے شانہ بہ شانہ کھڑی رہی ہو۔ کاش تم میری زندگی میں ذرا پہلے آئی ہوتیں تاکہ میں تمھیں زندگی کی تمام آسائشیں فراہم کر سکتا۔ میں نے تمھاری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ مجھے سچ مچ افسوس ہے۔ کیا تم مجھے کبھی معاف کر سکو گی؟"

وہ میرے قدموں میں بیٹھ کر آنسو بہاتا۔ اعتراف کرتا کہ وہ مجھے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کر چکا ہے اور میری قوت برداشت اور لچک پر حیرت زدہ ہے۔ "میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم اس تشدد کی تاب لا سکو گی جو میں نے تمھارے ساتھ روا رکھا ہے۔ میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ تم بہت نازک اور چھوئی موئی ہو۔ تم نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ تم طاقتور عورت ہو۔ تم واحد عورت ہو جس میں مجھ سے ذہانت کے ساتھ نمٹنے کی قوت برداشت موجود ہے۔ میں تمھیں ہرگز کبھی دغا نہ دوں گا۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرا ساتھ چھوڑنے کا خیال کبھی دل میں نہ لاؤ گی۔"

اس کے آنسوؤں سے پگھل کر، جو گویا مجھے گرداب سے نکال کر ساحل تک لے آتے، میں وعدہ کر لیتی۔

عدیلہ کو لاڈ پیار نے بگاڑ دیا تھا۔ اسے ہوکا تھا کہ لوگ ہر وقت اس کی طرف متوجہ رہیں اور اسے حسب منشا توجہ ملتی بھی رہتی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا اور جسم اتنا پرکشش کہ نظر نہ ہٹے۔ مصطفےٰ اور اس میں خوب نبھنے لگی۔ میری دوسری بہنوں نے مصطفےٰ سے رسمی سا فاصلہ برقرار رکھا۔ وہ ابھی اس کے بارے میں اندازہ لگا رہی تھیں۔ عدیلہ سمجھ گئی کہ وہ اور مصطفےٰ اصل میں یک جان و قالب ہیں۔ عدیلہ کے لیے مصطفےٰ کے پاس بہت وقت تھا۔ وہ اس کی ناز برداری کرتا اور شرارتوں اور چٹکلوں کا لطف لیتا۔ وہ اس کی ایسی ایسی شوخیاں معاف کرنے پر آمادہ رہتا جو اگر میں کرتی تو

لامحالہ میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ پڑتا۔

ابتدا میں تو میں نے اس میل جول کو بڑھنے دیا۔ یہ دل کو بھلا لگتا تھا کہ مصطفےٰ نے اپنا آمرانہ مکھوٹا اتار کر رکھ دیا ہے اور بڑا بھائی بنا ہوا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ میری بہنوں میں سے اس نے اپنے خصوصی التفات کے لیے صرف عدیلہ کو کیوں چنا ہے۔ میں جان گئی کہ یہ التفات دو طرفہ ہے۔ عدیلہ کو اپنے التفات کے بدلے میں کہیں زیادہ التفات مل رہا ہے۔ میری دوسری بہنوں کی نظر میں مصطفےٰ ایک جاگیردار تھا۔ انھیں احساس تھا کہ ان کی اور ان کے بہنوئی کی عمر میں بہت فرق ہے۔ اس کی موجودگی میں یا اس سے گفتگو کرتے وقت ان کا رویہ شائستہ رہتا۔ انھوں نے اپنے اور اس کے درمیان ایک بڑی واضح لکیر یہ جتانے کے لیے کھینچ دی تھی کہ ان کے تعلقات کی بس ایک حد ہے۔ عدیلہ کسی قسم کی حدود کی پابند نہ تھی۔ ہم نے اس کے کھلم کھلا عشووں غمزوں کو لڑکپن کی خودرائی پر محمول کیا۔

میرے والدین مشرق وسطیٰ چلے گئے۔ عدیلہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ اب ہم دونوں کے علاوہ گھر میں یا نصیبہ تھی یا ملازم تھے۔ ان پندرہ دنوں کے دوران مصطفےٰ بہت چڑچڑا اور بے چین رہا ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر مجھ سے ہولناک انداز میں لڑتا جھگڑتا۔ اب سارا گھر اس کی تحویل میں تھا اور اسے پتہ تھا کہ وہ بلا خوف و خطر ٹھکائی کر سکتا ہے۔ ایک بار میں نے فون پر اپنے بھائی سے بات کی تو اس پر بگڑ بیٹھا۔ اس کے خیال میں ہم فون پر بہت دیر بات کرتے رہے تھے۔ "تم اس سے اتنی دیر کیوں باتیں کرتی رہیں؟ وہ تمھارا بھائی ہے یا تمھارا یار ہے؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ میرا بھائی ہے، مصطفےٰ" "حد ہو گئی" "مجھے جواب دے رہی ہو تم؟" میں یہ سیکھ چکی تھی کہ اسے جواب دینے کی جرات کبھی نہ کرنی چاہیے۔ جواب دینا گستاخی کی انتہا تھا۔ بغاوت کی پہلی سرسراہٹ، جسے جاگیردارانہ اندازمیں تلے کچل دیا جانا ضروری تھا۔ وہ میری جانب سے اس برائے نام جسارت کو بہانہ بنا کر مجھے مارا پیٹا کرتا۔

ایک بار مجھ پر پل پڑنے کے بعد اس نے مجھے اتنے زور کی لات ماری کہ میں سیڑھیوں پر لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔ میں ابھی وہاں نیچے مری تڑپی گٹھڑی بنی پڑی تھی کہ وہ سیڑھیوں سے دوڑتا ہوا اترا اور پہلے کی طرح وحشیانہ انداز میں مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگا۔ میری پسلیاں بل گئیں لیکن تکلیف کا احساس تو اضافی چیز ہے۔ جب اس کے مکے اور لاتیں میرے جسم پر تھمیں اور بر... شروع ہوئیں تو میں پسلیوں کو بھول گئی۔ اس بے رحمانہ تشدد کے دوران مصطفےٰ سے میں نے پہلی بار کہا: "میرے اباجی کا گھر ہے اور میرے خیال میں تمھیں یہاں مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں ہونی

چاہیے۔" سناٹا چھا گیا جیسے مصطفےٰ کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ میری زبان پر پہلی بار وہی کچھ آ گیا تھا جو میرے دل میں تھا۔ اتنا کہہ کر میں نے ایک بات اور اس پر واضح کر دی تھی۔ میں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ میرے اور بھی رشتے ہیں جو اس بندھن سے، جس نے مجھے اس کے ساتھ نتھی کر دیا تھا، کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ خون کے رشتے۔ یہ ایسی بات ہے جسے جاگیردار سمجھ سکتا ہے اور بورژوا طبقے کے لوگ ہیچ پوچ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ میں نے پہلی بار دیدہ و دانستہ اسے الٹ کر جواب دیا تھا۔

اب اس کا غیظ و غضب اور بڑھا تو نشانہ میں ہی بنی۔ اس روز اس نے مجھے اتنا مارا اتنا مارا کہ میں تقریباً بیہوش ہو گئی۔ میری چیخیں کمزور پڑتے پڑتے سسکیوں اور آہوں میں تبدیل ہو گئیں۔

بعد ازاں، مزید پٹائی سے بچنے کے لیے، میں نے اپنے کیے پر معافی مانگ لی۔ مجھے احساس تھا کہ مصطفےٰ اندر سے جل گیا ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے کچل ڈالنے کے لیے اب کوئی اور منصوبہ بنائے گا۔

میرے والدین واپس آ گئے۔ عدیلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ دیر کے لیے دانتا کلکل سے میری جان چھوٹ گئی۔ پھر میرے والدین، عدیلہ کو ہمارے پاس چھوڑ کر دو دن کے لیے گلمبرگ چلے گئے۔ عدیلہ کو سکول سے چھٹی کرنے کی سوجھی۔ ایک دن پہلے اس نے مجھے منا لیا کہ میں اسے کلاسیں گول کرنے دوں۔ اس نے ہم دونوں کے لیے پروگرام ترتیب دیا۔ "میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہ باز نہ آئی تو میں نے اس کی بات مان لی۔ اس دن رات گئے وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس نے اپنا پروگرام بدل لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ سب نوجوانی کی تلون مزاجی کا اظہار ہے۔

اگلی صبح ہمارا ڈرائیور ایرک نہیں آیا اور عدیلہ پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی مصطفےٰ کو لندن جانا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ وہ عدیلہ کو سکول اتارتا جائے۔ وہ چلے گئے۔ میں نے انہیں رخصت کیا اور دوبارہ نصیبہ اور اس کے معمولات میں الجھ گئی۔

سہ پہر کو عدیلہ کا فون آیا: آج میں سکول نہیں گئی۔ میں اپنی ایک سہیلی کے گھر اتر گئی تھی۔" "تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟" "ابھی تو آدھے دن کی کلاسیں چھٹی ہیں۔ میں اب چلی جاؤں گی۔ شام کو مجھے لینے کے لیے ایرک کو سکول بھجوا دو گی؟" اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے شوفر کو بھیج دیا کہ اسے لے آئے شام کو عدیلہ گھر آ گئی۔ بات رفت گزشت ہوئی۔

عدیلہ اب اور ہی راستے پر چل نکلی تھی۔ وہ میرے مصطفےٰ کے درمیان تفرقہ ڈالنے

میں مصروف تھی۔ پہلے میں سمجھی کہ وہ یہ سب کچھ بھولے پن میں کر رہی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی حرکات کو محض اتفاق قرار دینا ممکن نہ رہا۔ بھولے پن کی آڑ میں ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کیا جا رہا تھا۔ اسے ہماری زندگیوں کے ان تمام گوشوں کا علم تھا جن میں کسی کو جھانکنے تک کی اجازت نہ تھی اور وہ بڑی ڈھٹائی سے ان میں دندناتی پھرتی تھی۔ میرا سابق شوہر، انیس، انہیں حساس موضوعات میں سے ایک موضوع تھا۔ چنانچہ وہ اٹھتے بیٹھتے انیس کا ذکر کرتی رہتی۔ بڑی معصومیت سے مصطفےٰ کو بتاتی کہ میں انیس سے شادی کرنے کے لیے کس طرح مری جا رہی تھی۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چٹکیاں وہ بڑے حساب سے مصطفےٰ کی دکھتی رگوں میں بھرتی رہتی۔ مصطفےٰ کے غضب کا نشانہ مجھے بننا پڑتا۔ تشدد کا جو راتب روز رات کو مجھے ملتا تھا اس کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

عدیلہ کی دیدہ و دانستہ بے حسی میری دوسری بہنوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے اسے ٹوکا۔ عدیلہ نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مصطفےٰ کو میرے خلاف زیادہ سے زیادہ برافروختہ کیا جائے۔ جس طرح وہ میرے ماضی میں مخل ہو رہی تھی اور اس کی مداخلت کا جو نتیجہ میرے حال پر مرتب ہو رہا تھا وہ مجھے بہت برا لگا۔ مصطفےٰ جس طرح اس کے ناز اٹھاتا تھا اس کی وجہ سے بھی میں کبیدہ خاطر ہوئی۔ میں نے مصطفےٰ کو بتا دیا کہ اس بارے میں میرے جذبات کیا ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عدیلہ کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہے اور عدیلہ اس بات سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ میں نے کہا کہ میں عدیلہ کو ڈانٹوں گی اور کہوں گی کہ اپنی کم عمری کا لحاظ کرے اور ایسی حرکتوں سے باز رہے جو اسے زیب نہیں دیتیں۔

پہلا دھماکا منو نے کیا۔ اس نے امی کو بتایا کہ عدیلہ میرے اور مصطفےٰ کے درمیان مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ امی نے یہ الزام کھڑے کھڑے مسترد کر دیا۔ عدیلہ ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ کوئی غلط بات کیسے کر سکتی تھی! انہوں نے الٹا ہم پر الزام دھرا کہ ہم خواہ مخواہ کی خواہرانہ رقابت کو جنم دے کر ان کی "چاند سی بٹو" کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔

ادھر "چاند سی بٹو" اب کھلم کھلا یہ ظاہر کرنے لگی جیسے مصطفےٰ پر اس کے سوا کسی کا حق نہ ہو۔ وہ دونوں خاصا وقت ساتھ گزارتے۔ بظاہر مصطفےٰ اسے کوئی پٹی پڑھا رہا تھا۔ وہ آپس میں ایسا ہنسی مذاق کرتے جسے کوئی اور نہ سمجھ سکتا اور میرا تمسخر اڑانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر لیتے۔ "دیکھو عدیلہ، تہمینہ کی حرکتیں تو دیکھو۔ یہ تم سے

جلتی کیوں ہے؟" ہاں، میں نے سوچا۔ پہلے چاقو گھونپو اور پھر اسے بل پر بل دو تاکہ ایذا دوئی ہو۔ جب بھی میں بڑی ہونے کے ناتے عدیلہ پر رعب ڈالنا چاہتی تو وہ فوراً اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا اور سب کے سامنے اعلان کرتا کہ "تہمینہ عدیلہ سے حسد کرتی ہے۔" اب مجھے بے سبب مارپیٹ اور نامعقول رویے کے علاوہ عدیلہ کی پیدا کردہ مشکلات سے بھی نمٹنا پڑتا۔ غرض کہ ایک لمحے کے لیے بھی چین نہ تھا۔

جب ہم نے والدین کی رہائش گاہ چھوڑی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم جام صادق علی کے مکان میں اٹھ آئے جو ہیمپ سٹیڈ میں واقع تھا۔ جام صاحب بہت مہربان آدمی تھے۔ میں ان کی بہت گرویدہ ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے رہے۔ اس بڑے مکان میں، جہاں ان کا پورا کنبہ تھا، ہمارے پاس اپنا بیڈروم تھا۔ نصیبہ اور دائی عائشہ کو میں پیچھے ہی چھوڑ آئی تھی۔

مصطفےٰ بے چین تھا۔ لگتا تھا کہ جگہ کی تنگی سے پریشان ہے ہم لامحالہ خاصا وقت میرے والدین کے پاس گزارتے۔ مصطفےٰ کو بیشتر وقت سسرال چلنے کی پڑی رہتی۔ مجھے وہاں جانے کا اتنا اشتیاق نہ تھا۔ وہ بضد ہو کر اس بات کو بھی وجہ نزاع بنا لیتا۔ مجھے ہار ماننی پڑتی۔ عدیلہ کی وجہ سے میں اپنے گھر جانے سے متنفر تھی اور مصطفےٰ عدیلہ ہی کی وجہ سے وہاں جانا چاہتا تھا۔ ہمارے اس مثلث کی ایک مشترکہ اساس موجود تھی۔

ابھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جس پر گرفت کی جا سکتی۔ اس وقت تک مجھے صرف عدیلہ کی لگائی بجھائی سے چڑ تھی۔ مصطفےٰ کا جی ایسی باتوں میں بہت لگتا تھا۔ وہ میرے بارے میں حاصل ہونے والی ہر طرح کی معلومات کو خود میرے خلاف استعمال کرنے کے فن میں طاق تھا۔ عدیلہ ہنسی خوشی اسے خام مواد فراہم کرتی رہتی جسے وہ زہر بھرے بغض میں ڈھالتا جاتا۔

ایک اتوار کا ذکر ہے۔ ہم دن گزارنے میرے والدین کے ہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مصطفےٰ پاتیو میں یوگا کی ورزشوں میں مشغول تھا۔ عدیلہ مسحور ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا بھی اس پُرسکون ماحول میں گزر ہوا۔ "اگر تمہیں یہ ورزشیں کرنی ہی تھیں تو آنے سے پہلے گھر پر کر لیتے۔ یہاں کس لیے کر رہے ہو؟" وہاں عائشہ دائی بھی موجود تھی۔ مصطفےٰ بے پروائی سے اس سے مخاطب ہوا اور بولا: "بیگم صاحبہ کو ان کے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر باہر پھونک دو۔" شرم کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی۔ عدیلہ کھی کھی کرنے لگی۔ میں کوئی ردعمل تک ظاہر نہ کر سکی۔ مصطفےٰ نے ایک زندہ عضو کو اپنا تختۂ مشق بنا کر گاجر مولی میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا ذہن باقی نہ رہا تھا۔ دماغ مردہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں کہاں پہ ہوں یا میرا کوئی وجود ہے بھی۔ میں مبہم سے انداز میں موجود تھی۔

دھندلی سی شبیہ۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا میں وجود رکھتی ہوں۔ اول اول تو میری دونوں دنیائیں ایک ایسے راستے پر چل رہی تھیں جہاں ان میں تصادم ناگزیر تھا۔ اب وہ دونوں ساز باز کر کے میرے خلاف صف آرا تھیں۔ مصطفےٰ اور میرے گھر والے درپے تھے۔ میرے سکتہ زدہ ذہن کے خلاف کبھی نہ رکنے والی جنگ لڑ رہے تھے۔ میرے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بڑی استادی سے بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں اس تحفظ سے محروم ہو چکی تھی جو مجھے میکے کی طرف سے ملنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی بیٹی نصیبہ، کا سہارا لیا۔ میں اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی رہتی۔ میری سونی دنیا میں صرف اس کی ذات ایسی تھی جو میرا دکھ درد سمجھ سکتی تھی۔ اس کی گرماہٹ کے سوا میری دل جوئی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

مجھے چاہیے تھا کہ اپنا سامان اٹھاتی اور مصطفےٰ کو چھوڑ کر چلی آتی۔ میں نے یہ کیوں نہ کیا؟ معاملہ اتنا سیدھا نہ تھا۔ میں ایک کنویں میں جا گری تھی اور باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کیچڑ میں اٹی دیواریں بہت پھسلواں تھیں اور باہر نکلنے کے لیے جتنا زیادہ زور درکار تھا وہ مجھ میں کہاں تھا۔ میں کبھی ابھرتی کبھی ڈوبتی۔ بمشکل تیرا کی۔ میرا دم گھٹنے میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ اتنی مہلت ہی نہ ملی تھی کہ بچ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچ سکتی۔ انھوں نے فرش پر پینٹ کر کے مجھے ایک کونے میں دھکیل دیا تھا اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ تازہ پینٹ پر چلتی ہوئی آزادی کی فضا میں جا نکلتی۔

والد صاحب کے گھر میں نیند میں چلنے والی کسی عورت کی طرح قدم اٹھاتی میں غسل خانے میں گئی اور کھڑی کھڑی دواؤں کی الماری کو تکتی رہی۔ میں نے الماری کھولی۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی کیپسولوں سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے شیشیوں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے بعض پر صلائے عام کے انداز میں "زہر" لکھا ہوا تھا۔ ایلس* کی طرح میرا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میرے لیے اب زندہ رہنا ممکن نہیں۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یکایک ایک کوندا سا لپکا اور سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں نے دواؤں کی الماری کے سامنے کھڑے کھڑے ایک بے لحاظ فیصلہ کیا۔

میں جس دلدل میں پھنس چکی تھی اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ ممکن ہی نہ رہا تھا کہ میں زندہ لوگوں کی نقل اتارے چلی جاؤں۔ کوئی تعلق تاریخ سے ٹوٹ گیا تھا۔ میں بالکل تنہا تھی۔ اپنی زندگی کے لیے ذمے دار صرف میں ہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ہمارا خدائے بزرگ و برتر فوت ہو چکا ہو اور اپنے پیچھے جو خلا چھوڑ گیا ہو وہ انتہائی ہولناک ہونے کی وجہ سے ناقابلِ برداشت ہو۔ آدمی خودکشی اس وقت کرتا ہے جب اسے سہارا

---

* "ایلس ان ونڈر لینڈ" کی ہیروئن

دینے والی تمام جہات منہدم ہو چکی ہوں۔ یہی وہ پل تھا جس کے دوران میں نے جان لیا کہ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ یہ فیصلہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

میں جام صاحب کے گھر لوٹی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ سوچتی رہی۔ مجھے نصیب کا خیال آیا لمحے بھر کے لیے میں ڈانواں ڈول ہوئی۔ لیکن میرے ذہن میں برپا ہیجان اس قدر مہیب تھا کہ یہ بچی تک، جس کے میں ہر رات خواب دیکھتی تھی اور اس ادھیڑبن میں مبتلا رہتی تھی کہ اس کے ناشتے کے لیے کیا تیار کرنا ہے، اس طرح دھندلا کر غائب ہو گئی جیسے شام کے جھٹپٹے میں سائے ماند پڑ جاتے ہیں۔

میں نے شیشی کھولی۔ گولیاں نگل لیں۔ میں اپنی کوشش کو بالکل یقینی بنانا چاہتی تھی۔ میری یہ مرضی قطعاً نہ تھی کہ اتفاقاً کچھ اور ہو جائے۔ جو کچھ میں کر رہی تھی وہ نہ تو کوئی خالی خولی دھمکی تھی نہ مدد یا توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے بھٹکے ہوئے ذہن کی پکار۔ میں نے جتنی گولیاں ہتھیلی میں سما سکیں شیشی سے انڈیل لیں۔ میں نے ہتھیلی پر ٹکیوں کو لہراتے اور جگہ بدلتے دیکھا۔ میں اپنی قسمت کی لکیر کو بدل رہی تھی۔ میں ڈگمگائی اور میں نے ایک موج کو بل کھا کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ مجھے امن چین تک نہلاتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔

تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مصطفےٰ کو اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو میں فرش پر چت پڑی تھی۔ مجھے وہاں اس طرح بے سدھ پڑے پڑے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ میری جان دھیرے دھیرے نکلتی جا رہی تھی۔ مصطفےٰ نے جام صاحب کو بلایا اور ان دونوں نے میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر مجھے ہوش میں لانا چاہا۔ میں بدستور لاانسانیت کی امواج میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان موجوں کی ختم نہ ہونے والی گونج مجھ پر لوری کا سا اثر کر رہی تھی۔ انہوں نے کسی ڈاکٹر قریشی کو بلایا جو جام صاحب کا جاننے والا تھا۔ اس نے فوراً ایمبولنس طلب اور مجھے جھٹ پٹ پمپ سٹیڈ میں رائل فری ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ مجھے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لے جایا گیا اور میں زندگی سے چمٹی رہی۔ وہاں ڈاکٹر نے مصطفےٰ کو بتایا کہ زہریلے مادے میرے خون میں سرایت کر چکے ہیں۔ "کیا یہ بچ جائے گی؟" "کیا یہ جی دار ہے؟" "ہاں۔" "تو پھر بس ہم اس کی جی داری پر ہی تکیہ کر سکتے ہیں۔" میں جی داری نہیں دکھا رہی تھی۔ لیکن ابھی میرا وقت نہیں آیا تھا۔ اس رات میری حالت انتہائی تشویش ناک رہی۔

مصطفےٰ نے میری بڑی بہن، روبینہ، کو فون کیا جو ان دنوں امی اور ابا سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ "تہمینہ نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے"۔ اس نے روبینہ کو بتایا "خدا جانے کیوں کی ہے۔ وہ پاگل ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم آ جاؤ اور ہاں---- اپنے والدین سے

اس کا ذکر نہ کرو تو اچھا ہے۔ وہ گھبرا جائیں گے"۔ روبینہ دوڑی چلی آئی۔

رات گزر گئی۔ میں اپنے جسد خاکی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ زندگی اور موت کے درمیان واقع جھٹپٹوں کی اس دنیا میں کس طرح کے خواب دکھائی دیتے ہیں؟ میرے خواب تو سہانے نہ تھے۔ دن گزرا۔ ایک اور رات آئی۔ میں ابھی تک موت سے نبرد آزما تھی۔ میں ہار ماننے کو بالکل تیار نہ تھی۔

بالآخر مجھے ہوش آ گیا۔ میں گھر لوٹ آئی۔ مجھ پر دہشت چھائی تھی۔ مصطفےٰ مجھے امی کے گھر لے گیا۔ میں ابھی تک مدہوش سی تھی اور مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ امی ایسی بن گئیں جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو۔ تجاہلِ عارفانہ کی اس سے زیادہ مکمل مثال پیش کرنی مشکل ہے۔ والد صاحب نے وہی کیا جو انہیں بتایا گیا تھا اور اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں۔

میں مصطفےٰ کے ردعمل کے بارے میں پریشان تھی۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھا۔ اس نے مجھ پر غصہ اتارنے میں کسر باقی نہ رکھی۔ اس نے مجھے میری بے حسی پر لتاڑا۔ "تمہاری وجہ سے میری سبکی ہوئی" وہ درشت لہجے میں بولا"۔ تمہیں پتہ بھی ہے مرد ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرتے رہے ہیں۔ مرد ڈاکٹر! تم نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ تمہیں اس احمقانہ فعل کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ دیکھتی جاؤ"۔

جب میں بیہوشی کی گہرائیوں سے ابھر کر سطح پر پہنچی تو مصطفےٰ کا قہر سر پر منڈلاتا دکھائی دیا۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ جان بچ جانے کی مجھے کوئی خوشی نہ تھی۔

امی کی خواہش تھی کہ رات میں انہیں کے پاس گزاروں۔ ان کے ہاں کچھ اور مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سٹڈی روم میں ہمارے لیے بستر لگا دیا گیا۔ مجھے فوراً ہی نیند آ گئی۔ بڑی دیر بعد کہیں آدھی رات گئے، مجھے لگا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ مجھ پر ابھی تک سکون آور دواؤں کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ یونہی سا یاد پڑتا ہے کہ مجھے ایک صورت دکھائی دی۔ مصطفےٰ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ مجھ پر نیند کا بڑا غلبہ تھا اور مجھے ٹھیک طرح کچھ علم نہ تھا کہ میں ہوں کہاں پر۔ میں دوبارہ سو گئی۔ خاصی دیر بعد میری آنکھ پھر کھلی۔ میں نے جبلتاً مصطفےٰ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بستر میں نہ تھا۔ بستر میں وہ جگہ، جہاں وہ لیٹا تھا، ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کمرے میں کوئی آیا تھا اور مصطفےٰ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کیوں چلا گیا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں گرتی پڑتی بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے ڈگمگاتی چال سے کچن کا رخ کیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک سایہ دوڑ کر سیڑھیاں چڑھا۔ مصطفےٰ، جس نے پورے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے، تیزی سے قدم اٹھاتا میری طرف آیا۔ "تم باہر کیوں آ گئیں؟" اس کی آواز واضح طور پر کھسیائی ہوئی

معلوم ہو رہی تھی۔ "میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔" "جا کے سو جاؤ۔ تمہیں اس حالت میں ادھر اُدھر نہیں پھرنا چاہیے"۔ میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اس وقت اس پر الزام دھرنے کی نیت سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کر سکی۔ صبح مجھے زیادہ ہوش تھا۔ "رات کیا ہوا تھا؟ کوئی کمرے میں آیا تھا۔ کون آیا تھا؟" "اوہ، وہ تو عدیلہ آئی تھی۔" "عدیلہ؟" "ہاں، اس پر ایک مشکل آ پڑی ہے۔ اس کا کسی ایرانی لڑکے سے میل جول ہے۔ اس میل جول کے حوالے سے اسے بعض مسائل کا سامنا ہے۔ اسے کچھ مشورہ چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بات چیت کرنے آئی تھی۔" "اچھا؟" "تم سو رہی تھیں۔ میں تمہاری نیند خراب نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے لے کر ناشتے کے کمرے میں چلا گیا۔" "تمہیں اس سے یہیں بات کرنی چاہیے تھی۔ آدھی رات گئے اس سے اکیلے میں باتیں کرنا تمہارے لیے نامناسب تھا۔ فرض کرو، اس وقت میرے والد صاحب نیچے آ جاتے"۔

مصطفےٰ اپنی کہانی پر اڑا رہا۔ اس نے مجھے یقین دلا کر چھوڑا کہ عدیلہ کا واقعی کسی ایرانی لڑکے سے میل جول تھا اور وہ اس ضمن میں بات چیت کرنے کی خواہاں تھی۔ وہ مصطفےٰ پر، اسے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر، اعتماد کرتی تھی۔ اور اپنی راز کی باتیں صرف اسی کو بتاتی تھی۔ وہ اسے صحیح مشورے دیتا رہے گا تاکہ عدیلہ کو نہ تو کوئی دکھ یا ضرر پہنچے اور نہ اس سے کوئی احمقانہ حرکت سرزد ہو۔ مصطفےٰ نے اب خاندان کی عزت آبرو کے محافظ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

دوسروں سے اپنی بات منوا لینے میں مصطفےٰ کا جواب نہ تھا۔ میں صرف اسی سمت میں قدم اٹھا سکتی تھی جو اس نے میرے لیے متعین کر دی ہو۔ اپنے طور پر کچھ سوچنا جرم تھا جس کی سزا دینے کا حق اسے حاصل تھا۔ اس نے اپنے اصول، اپنے آدرش مجھ پر تھوپ دیئے۔ اس کے بعض عقائد ان تمام باتوں کے بالکل الٹ تھے جو میری دانست میں درست تھیں۔ ان عقائد سے سراسر ازمنۂ وسطیٰ کے ماحول کی بو آتی تھی۔ وہ تعصبات، توہمات اور بڑی بوڑھیوں کے روایتی معتقدات کے ایک آمیزش کی پیداوار تھے۔ لیکن اسے تعقل پسندانہ اور مدلل مباحثے میں حصہ لینے پر کسی طرح آمادہ کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔

جن اوامر کی پابندی اس کے نزدیک لازمی تھی ان کی فہرست میں ان خیالات کی جگہ بہت اوپر تھی جو عورت کے رول کے حوالے سے اس کے ذہن میں تھے۔ عورت کی عزت اسی میں تھی کہ وہ شوہر کی امنگوں اور اوٹ پٹانگ ترنگوں کے مطابق زندگی گزارے۔ عورت مرد کی کھیتی ہے۔ "یہ قرآن میں آیا ہے" وہ کہتا۔ میں اس آیت کی اور طرح تشریح کرتی۔ میرے خیال میں کھیتی سے صرف اسی صورت میں کچھ حاصل ہو سکتا

ہے جب اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے اور اسے موسمی تغیرات کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچایا جائے۔ یہ روحانی نقطۂ نظر تھا۔ جاگیردار اپنی کھیتی کو عزیز رکھتا ہے تو صرف یہ دیکھ کر کہ وہ اس کے کتنے کام آ سکتی ہے۔

وہ زمین کے گرد حصار کھینچے گا، اس کی حفاظت کرے گا۔ اگر وہ بنجر ہو گی تو اسے نظر انداز کر دے گا۔ اس کے قریب نہ پھٹکے گا۔ اس کی دیکھ بھال کا کام دوسروں پر چھوڑ دے گا۔ اس کے لیے زمین اقتدار اور جاہ کی نشانی ہے۔ زمین جاگیر ہے۔ لہٰذا جاگیردار کی عورت پر بھی فرض ہے کہ وہ خود کو سر سے پیر تک ڈھانپے رہے، مسکین دکھائی دے، بیٹے پیدا کرے، اجنبیوں کے سامنے نہ آئے اور جاگیردار کی ضروریات کو پورا کر کے اسے خوش رکھے۔

مصطفےٰ ایسا جاگیردار تھا جسے ایک مختلف دنیا کی ہوا لگ چکی تھی۔ اس کی اقدار میں تھوڑی بہت دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اپنے ذہنی انتشار کی وجہ سے وہ مجھ سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے میں اس کی ساتھی ہوں۔ وہ میرے ساتھ اپنی سیاست پر بات چیت کرتا اور مجھ سے توقع رکھتا کہ میں سیاست میں سرگرمی سے حصہ لوں گی۔ اس کے باوجود وہ مجھے سر نہ اٹھانے دیتا۔ مجھے گھر میں بند رکھنا چاہتا۔ میں محض دیوار تھی جس پر وہ اپنے خیالات گیند کی طرح مارا کرتا اور وہ ٹکرانے کے بعد واپس اس کے پاس پہنچ جاتے۔ میرا کام بس وہاں موجود ہونا تھا۔ میری طاقت اسی جمود میں پنہاں تھی۔ اس کے خیالات کو کوئی نیا رخ دینا یا انہیں کسی طرح بدل ڈالنا میری بساط سے باہر تھا۔

شادی کے پہلے چند برسوں اور ہماری جلاوطنی نے مجھے ایسی ٹھوس عورت بنا دیا تھا جس کی اپنی کوئی مرضی، سوچ یا جذبہ نہ ہو، جو بس دوسروں کے اشاروں پر چلتی رہتی ہو۔ مجھے یہ حق بھی حاصل نہ رہا تھا کہ میں کسی چیز کی خواہش ہی کر سکوں۔ مسئلہ کوئی بھی ہوتا، میں نہ اس پر کبھی غور کرتی نہ اس کا تجزیہ۔ مجھے بس یہی فکر رہتی کہ کون سی ترکیب لڑا کر کسی نہ کسی طرح دن اور پہاڑ سی رات کاٹی جائے۔ یہ اندیشے میرے ذہن پر سوار رہنے لگے کہ مصطفےٰ مجھے سزا دینے کے لیے نصیبہ کو مجھ سے چھین لے گا۔ ہر روز ایک نیا معرکہ گرم ہوتا جس کے دوران دشمن کو میں یہ موقع نہ دیتی کہ وہ میری بیٹی نصیبہ کو جو میری ہوش مندی کی آخری اور رہی سہی نشانی تھی، کوئی تکلیف پہنچائے یا اٹھا لے جائے۔ میں اسے مصطفےٰ کی غضب ناکی اور بد مزاجی سے بچائے رکھتی۔ اسے مصطفےٰ سے دور رکھنے کی ترکیبیں نکالنے پر خاصا وقت صرف کرتی۔ میں ایک بار پھر حاملہ ہو گئی تھی اور ان پستیوں سے بری طرح خوف زدہ تھی جن تک جان بچانے کے لیے مجھے اترنا تھا۔

ہم ہیمپ سٹیڈ میں کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ عدیلہ کے تازہ ترین

واقعے نے جن وسوسوں کو جنم دیا تھا انھوں نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک مبہم سا احساس تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ نسوانی وجدان کا کرشمہ جو ایک نیم مردہ ذہن میں معمول سے زیادہ سرگرم عمل تھا۔

مصطفے نے میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کو دعوت دی کہ وہ ہمارے ساتھ آ کر رہیں۔ میں نے نصیبہ کو امی کے پاس چھوڑا۔ میرا دوسرا بچہ پیٹ میں یونہی سا محفوظ میرے پاس رہا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ میری ناکام خود کشی سے بچے پر کوئی مضر اثر نہ پڑا تھا۔ میرا اب پانچواں مہینہ جا رہا تھا۔

فلیٹ بہت گھسا پٹا تھا۔ گنجائش کم، کمرے تنگ، اس میں دم گھٹتا جاتا تھا۔ بڑا بیڈروم میرے اور مصطفے کے پاس تھا۔ دوسرے چھوٹے کمرے میں میر اور شاہنواز نے ڈیرے ڈال دیئے۔ فلیٹ میں ہر وقت ان کے دوست موجود رہتے جن کے نہ سونے کے اوقات متعین تھے نہ صبح اٹھنے کے جہاں جگہ ملتی وہیں پڑ کر سو جاتے۔ ایک وقت میں تو فلیٹ پر ہپیوں کے اجتماعی بسروں کا گمان ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان مل جل کر بسیرا کرنے والوں کو بیچ بیچ کے "اقتدار" سے دلچسپی تھی۔

مجھے ان دونوں آدرش پسند نوجوانوں سے لگاؤ ہو گیا جن کے اس کیریر کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا جس کے دوران انھوں نے ایسے امیر کبیر دہشت پسندوں کے روپ میں سامنے آنا تھا جو دہشت گردی کے منصوبے تیار کرتے رہتے ہوں۔ انھوں نے بھانپ لیا کہ میری کیا گت بنی ہوئی ہے۔ ان کا پس منظر وہی تھی جو میرے طبقے کا تھا اور انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں۔ فلیٹ کو رہائش کے زیادہ قابل بنانے کی غرض سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے وقت میں شاذ ہی کسی سے بات کرتی۔ بس پیالیاں اٹھاتی، راکھ دانیاں خالی کرتی اور رکابیاں دھوتی رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ میری موجودگی دخل در معقولات کے ذیل میں بالکل نہ آتی تھی۔ نہ جانے میں انھیں کیسی لگتی ہوں گی۔ ان کی جوشیلی سکیموں یا ہمارے ملک کے مستقبل کے بارے میں ان کے تند و تیز مباحثوں میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ میں تمام کپڑے دھلنے کے لیے امی کے ہاں بھجوا دیتی تھی۔ شاہنواز دال کا رسیا تھا اور میں ان گنت ترکیبوں سے دالیں تیار کر کے اس کی عادت اور بگاڑتی رہتی۔ دال ہم مل کر پکاتے۔ وہ دال کھاتا اور ساتھ میں کوک پیتا جاتا۔ انھوں نے جو بہروپ بھر رکھا تھا اس پر بے رحم دہشت پسندوں کا کسی طرف سے شائبہ نہ ہوتا تھا۔ وہ تو صرف حوصلہ مند نوجوان تھے جو لگتا تھا کہ "دہشت دہشت" کھیلنے لگے ہیں۔

میرے ڈرائنگ روم کو چاند ماری کے میدان میں تبدیل کر دیا گیا۔ کمرے کے

ایک سرے پر ہدف نصب کر کے میر ہوائی بندوق سے نشانہ بازی کی مشق میں لگا رہتا۔ میرا قیاس ہے کہ وہ تھوڑے فاصلے سے قتل کرنے اور دست بدست لڑائی لڑنے کا شوق پورا کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ مجھ پر خاک بھی رعب نہ پڑا۔ مجھے صرف ان گولیوں کی فکر تھی جو قالین پر جا بجا بکھری نظر آتی تھیں۔ جب چاندماری کا سیشن تمام ہو جاتا تو میں ان کے رخصت ہونے کا انتظار کرتی رہتی تاکہ انھیں بے آرامی محسوس نہ ہو اور ان کے جانے کے بعد گولیوں کے خول ڈھونڈنے میں لگ جاتی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ نصیبہ انھیں نگل نہ لے یا کہیں ان پر اس کا پاؤں نہ آ جائے۔ انقلاب سے بچ بچا کر چلنا ضروری تھا۔ یہی میں نے کیا۔

ہماری حسنیٰ شیخ سے دوستی تھی جس کا کہنا تھا کہ وہ بھٹو صاحب کی خفیہ بیگم ہے۔ بہر صورت، اگر نصرت بھٹو خاتون اول تھی تو حسنیٰ کو بھٹو صاحب کا پہلا عشق سمجھا جاتا تھا۔ حسنیٰ پہلی فرد تھی جس سے میں نے اپنے مسائل کے بارے میں گفتگو کی۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو میری باتیں سن کر مجھے یہ یقین دلا سکے کہ میں پاگل نہیں ہو چلی ہوں۔ حسنیٰ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کسی لگی لپٹی سے کام نہ لیا۔ "چلتی بنو۔ کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ سب کچھ برداشت کرو۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو میرے اپنے احساسات پر صاد کر سکے۔ حسنیٰ کی بات سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ پہلی بار اس دنیا کی طرف دروازہ کھلا تھا جس سے میں نے تالا لگا کر خود کو الگ تھلگ کر لیا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اس شخص کو چھوڑنے اور اپنے نقصانات کو کم کرنے کے بارے میں سوچنے کی جرات کی۔ بیج بو دیا گیا تھا۔ اسے پروان چڑھانے کے لیے وقت درکار تھا۔

ہم دونوں نے میرے والدین سے قریبی رابطہ قائم رکھا میرا دل بہت شدت سے چاہنے لگا کہ پھر سے رحم مادر میں جا چھپوں۔ امی سے میرے تعلقات بہت اچھے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود میں ان کی طرف کھنچ رہی تھی۔ میری نظر میں وہ طاقت کی علامت تھیں۔ میرے خیال میں مصطفے کے شر کو پورے زور شور سے کاٹ کر سکنے کی طاقت صرف انھیں میں تھی۔ وہ جب بھی مجھے ایذا پہنچاتا میں دل ہی دل میں امی کی دہائی دیتی۔ میں انھیں یاد کر کے روتی اور دعا کرتی کہ کوئی ایسا معجزہ ہو کہ وہ آئیں اور مجھے بچا لیں۔ میں انھیں تفصیل سے بتانا چاہتی تھی کہ میری زندگی کس طرح ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمارے باہمی تعلقات کے پیش نظر اس طرح کی قربت خارج از امکان ہے۔ میں ان تعلقات کو از سر نو آزمانے سے ڈرتی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں اس سرچشمے سے کٹ کر نہ رہ جاؤں جس سے میں اپنی تمام طاقت حاصل کرتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے الیے کو اتنی حقارت سے دیکھیں کہ وہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جائے یا

میری لغزش کا تمسخر اڑائیں۔ میں اڈی کے ردعمل کے بارے میں پہلے سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی اور اس بے یقینی نے مجھے انہیں اعتماد میں لینے سے باز رکھا۔ میں اس سلسلے میں ان سے بات کرنے کو آج کل پر ٹالتی رہی اور ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ ہر طرح سے خیروعافیت ہے۔

میں بہت دیندار تھی۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتی۔ حسنیٰ اور نصیبہ کے علاوہ میں نے جس کے سامنے اپنا دل چیر کے رکھ دیا وہ اللہ کی ذات تھی۔ جانماز پر بیٹھے بیٹھے میں نجات کی التجا کرتی۔ مایوسی کے عالم میں اللہ کی طرف رجوع ہوتی۔ میں تباہ حال تھی اور محسوس کرتی تھی کہ سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اللہ سے یہ نہیں کہا کہ وہ میرے بحران کو خاص اس طرح یا اُس طرح حل کر دے۔ میں تو بس یہی دعا کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنی الٹ پلٹ زندگی کو سلجھانے کی توفیق عطا فرمائے اور مصطفےٰ کو کسی طرح بہتر انسان بنا دے۔

میں اس پورے عرصے میں اس شخص کا مزاج بدلنے کے لیے نہایت جرات مندانہ کوشش کرتی رہی۔ میں اپنی شخصیت کو بار بار بدلنے پر آمادہ تھی کہ دیکھوں تو ان تبدیلیوں کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں محسوس کرتی تھی کہ "یہ نہیں تو پھر یہ سہی" کے عمل کے ذریعے بالآخر میں ایک ایسی شخصیت بن کر ابھر سکوں گی جس کے ساتھ وہ خوشگوار تعلقات قائم رکھ سکتا ہو۔

میں نے باری باری مختلف رول اختیار کیے۔ اس کی تمام سابقہ بیویوں کا روپ دھارنے کی کوشش کرتی رہی۔ ان بیگمات کی ہر وہ بات جو اسے قابلِ تعریف معلوم ہوتی تھی میں نے اپنالی۔ یہ کوششیں ایسی تھیں جیسے کوئی ڈوبتے ڈوبتے پیر مارے۔ مراد یہ تھی کہ ان کی مدد سے کسی طرح مصطفےٰ کا قرب حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے بارے میں کوئی مثبت ردِعمل ظاہر کرنے پر راغب کیا جائے۔ میرے گھڑی گھڑی نت نئے سے نیا بہروپ بھرنے سے شاید اس کو ذہنی الجھن ہوتی ہو یا ہنسی آتی ہو لیکن اس کے وحشیانہ طرزِ عمل میں ذرا سا بھی فرق نہ آسکا۔ ان دنوں عدیلہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو اسے خوشی رکھ سکتی تھی۔

اپنی چھوٹی بہن سے میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ پکی پیسی ہو چکی ہے۔ جس طرح کے چکر وہ چلاتی رہتی تھی ان سے مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ میری ازدواجی زندگی کو کسی قسم کے بیرونی اثرات کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے شکوک وشبہات کو پاس نہ پھٹکنے دیا اور تمام توجہ گھر کا حلیہ درست کرنے پر مرکوز کر دی۔ عدیلہ کو یہ کب منظور تھا۔

ایک دن ہم میرے والدین کے ہاں گئے۔ جیسے ہی ہم نے لونگ روم میں قدم رکھا منو نے عدیلہ سے کہا کہ وہ کمرے سے چلی جائے عدیلہ نے بہن کا کہنا ٹال دیا اور جھوٹوں

فرسیلی لیلیٰ بنی وہیں ڈٹی رہی۔ مجھے تجسس ہوا کہ کمرے میں عدیلہ کی موجودگی پر منو کو اعتراض کیوں تھا۔ واپس آ کر میں نے منو کو فون کیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے بات اگل دی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ مصطفےٰ نے عدیلہ کو سکول سے لیا اور دونوں کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اسے یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ گئے کہاں تھے لیکن ان کی ملاقات تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ منو نے بات جاری رکھی "جب آپ اور مصطفےٰ بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو میں عدیلہ کو غور سے دیکھتی رہی۔ میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ عدیلہ نے اس وقت بھڑکیلا لباس خاص طور پر زیب تن کیا تھا۔ اس نے کپڑے تب بدلے تھے جب اسے خبر ملی تھی کہ آپ دونوں آ رہے ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ میں اور مصطفےٰ تو اتفاقاً جا نکلے تھے۔ تو پھر عدیلہ نے لباس کے معاملے میں اتنا زیادہ اہتمام کیوں کیا تھا؟ وہ بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی عدیلہ کے ردعمل پر منو کا اس طرح نظر رکھنا ثابت کرتا تھا کہ اس کی آنکھ کسی فوٹوگرافر کی آنکھ ہے۔ "لگتا تھا کہ عدیلہ کا پورا وجود مصطفےٰ کا استقبال کر رہا ہے۔ اس کے بیٹھنے کا انداز، ان کے آنکھیں چار کرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان میں آپس میں ایسی کوئی بات ہے جس کی ہمیں خبر نہیں۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھے اس سے کہنا پڑا کہ کمرے سے چلی جائے۔ اس قدر ڈھٹائی سے آنکھیں لڑانے اور پیار جتانے کی کوئی حد بھی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کسی اور کا خیال ان باتوں کی طرف نہیں گیا۔" مجھے یقین تھا کہ مصطفےٰ کا خیال ضرور گیا ہو گا۔ "جب آپ لوگ چلے گئے تو میں نے اسے کھری کھری سنائیں۔ ایسا لتاڑا کہ یاد ہی کرے گی۔ ممی اور زروینہ بھی موجود تھیں۔ اس طرح کا رویہ نہیں چلے گا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔؟"

میں فون ہاتھ میں لیے اس طرح گم سم کی گم سم رہ گئی جیسے مجھ میں جان ہی نہ ہو۔ میں جا کے مصطفےٰ سے دوبدو ہوئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پورے واقعے کی صداقت سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ یہ سب منو کے ضرورت سے زیادہ فعال تخیل کا کمال ہے "بالکل فضول بات ہے یہ۔ میں کبھی عدیلہ کو کہیں لے کر نہیں گیا۔" اس کی تردید کے بعد تفتیش کی گنجائش نہ رہی۔ میں پوری طرح قائل تو خیر کیا ہوتی البتہ مکمل بے بسی کے عالم میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

اب مصطفےٰ نے ان لوگوں سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے شروع کیے جو میرے لیے مخبری کرتے تھے۔ اس نے میرے ذہن میں منو کے بارے میں چھوٹے چھوٹے شکوک داخل کر دیے۔ نتیجتاً میرے اور منو کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ایک بار پھر وہ ان پناہ گاہوں سے میرا رشتہ منقطع کرنے میں مصروف تھا جہاں میں مشکل وقت میں لنگر

انداز ہو سکتی تھی۔ دشمن کو پہلے سب سے الگ تھلگ کردو اور پھر اسے کچل ڈالو۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سی بات پر یا کس پر یقین کروں۔ کیا منو یہ سب کچھ اس وجہ سے کر رہی تھی کہ وہ مصطفےٰ سے چڑتی تھی؟ کیا وہ مصطفےٰ کے عدیلہ کی طرف کھلم کھلا جھکاؤ کی وجہ سے دکھی تھی؟ کیا میری ہر بہن مصطفےٰ کے دل میں گھر کر کے سب سے چہیتی سالی بننا چاہتی تھی؟۔ منو کے مقاصد کے بارے میں شکوک کی موج در موج یلغار نے مجھے ہلا ڈالا۔ یہ کوئی معمولی سا الزام نہ تھا۔ اور اس کے باوجود درست بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ جن باتوں کے سچ ہونے کا مجھے علم تھا میں ان پر بھی یقین نہ کرنا چاہتی تھی۔

اگلی صبح امی نے بدحواس ہو کر مجھے فون کیا۔ عدیلہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ مصطفےٰ اس روز لورپول روانہ ہونے والا تھا۔ امی نے مدد کے لیے اس سے رجوع کیا۔ اس کے سوا وہ کسی پر بھروسا نہ کر سکتی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھیں کہ بات بڑھتے بڑھتے کہیں سکینڈل کی شکل اختیار نہ کرے اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی بیٹی کی نامعقول حرکت پر پردہ ڈال کر رہیں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مصطفےٰ سے کہوں کہ وہ عدیلہ کو ڈھونڈنے میں ہاتھ بٹائے۔

امی کہنے لگیں۔: "یہ سب منو کا کیا دھرا ہے۔ عدیلہ پر ہر طرح کے خوفناک الزام عائد کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اسے بہت صدمہ پہنچا۔ منو دیوانی ہے۔ اس نے اشارتاً کہا کہ مصطفےٰ اور عدیلہ کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے۔ عدیلہ محسوس کرتی ہے کہ ہم سب اس کے خلاف ہو گئے ہیں اور اس کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔"

میں نے مصطفےٰ کو بتایا کہ اسے لورپول کا سفر منسوخ کر کے عدیلہ کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرنی ہو گی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ کہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ گھر سے نکل پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ والد صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے امی کے گھر کی راہ لی تاکہ وقتی طور پر وہاں کا بندوبست سنبھالوں اور معاملات پر نظر رکھوں۔ پوری صبح گویا کانٹوں پر لوٹتے گزری۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ امی کو ڈر تھا کہ اب کوئی بدترین خبر ہی آئے گی لیکن وہ ظاہری طور پر پُرسکون رہ کر اپنے ہیجان اور بوکھلاہٹ کو چھپانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ منو فرار ہونے والی بہن کا کھوج لگانے کے لیے اس کی تمام سہیلیوں کو فون کرنے میں مصروف تھی۔ امی، جو اب خاصی بے اوسان دکھائی دے رہی تھیں۔ ادھر سے اُدھر ٹہلتی رہیں۔ اس گھریلو بحران کے دوران وقفے وقفے سے کافی کا دور چلتا رہا۔

مصطفےٰ نے سہ پہر کے وقت فون کیا۔ امی کا ضبط فون سنتے ہی جواب دے گیا۔ انہوں نے مصطفےٰ سے گڑگڑا کر کہا کہ تلاش جاری رکھے۔ یہ ان کے خاندان کی عزت کا

سوال ہے۔ خاندان میری شادی کا صدمہ جھیل کر ابھی ابھی سنبھلا تھا کہ یہ نئی آفت ٹوٹ پڑی۔ مصطفےٰ نے ان کی بہت ڈھارس بندھائی۔ کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ گھر آ رہا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک پلان ہے۔

اس نے واپس آ کر اپنے منصوبے سے پردہ اٹھایا۔ کہنے لگا کہ وہ امی کے فون اور ہمارے فون پر ٹیپ لگا دے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کسی نہ کسی مرحلے پر عدیلہ ہم سے رابطہ کرے گی۔ "اس کے فون کرتے ہی ہم اس کا کھوج لگا لیں گے۔ میں نے متعلقہ انتظامیہ سے بات کر لی ہے۔ وہ عدیلہ کی تلاش میں ہماری مدد کرنے پر رضامند ہیں۔" جاتے وقت وہ مجھ سے کہہ گیا کہ میں گھر جا کر فون کے پاس بیٹھی رہوں۔ ہم روانہ ہوئے۔ جب ہم گھر جا رہے تھے تو راہ میں رک کر اس نے ایک آف لائسنس ("خریدو اور ساتھ لے جاؤ") دکان سے دو بوتلیں وائن کی خریدیں مجھے اس کی یہ حرکت بڑی بے تکی معلوم ہوئی۔ میں نے کہا "اس وقت تمہیں وائن کا خیال کیسے آ سکتا ہے؟ سب کچھ تو چوپٹ ہوا پڑا ہے۔ تمہیں وائن کی چسکیاں لگانے کی فرصت کب ملے گی؟" اس نے بڑا بڑاتے ہوئے کچھ اس طرح بات کی کہ اس کے پاس وائن کا سٹاک ختم ہو گیا ہے اور اس کا ذہن ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا۔ یہ بے سروپا جواب تھا جو دل کو نہیں لگا۔ اس کا طرز عمل فریب سے خالی نہ تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا ہی جانے والا تھا۔ اس لیے فاش غلطیاں سرزد ہو رہی تھیں۔ مجھے گھر اتار کر وہ چلا گیا۔

ہمارے فون بجتے رہے۔ عدیلہ کو کوئی فون نہ آیا تھا۔ بس دونوں گھر فون کے ذریعے آپس میں مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ابھی نہ اُدھر کچھ پتہ چلا تھا نہ ادھر۔ مصطفےٰ بھی غائب تھا۔

کوئی دس بجے رات عدیلہ نے فون کیا۔ آواز سے لگتا تھا جیسے وہ بہت پژمردہ اور دکھی ہو۔ "وہ جو گھر ہے نا، میں وہاں ہرگز واپس نہیں جانے کی۔ وہاں سب کو مجھ سے نفرت ہے۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ میں مصطفےٰ بھائی پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ وہ تو میرے لیے بھائی جیسے ہیں۔ مجھ پر تو تمہیں بھی بھروسا نہیں۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ میں بعد میں فون کروں گی۔"

میں نے کلک کی آواز سنی، میں انتظار کرتی رہی۔ بیس منٹ بعد مصطفےٰ کا فون آیا۔ کہنے لگا کہ عدیلہ کی کال کا کھوج مل گیا ہے۔ اب وہ کار لے کر عدیلہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ مجھے دوبارہ فون کرے گا۔

میں نے امی کو مطلع کر دیا۔ گیارہ بجے رات عدیلہ نے دوبارہ فون کیا۔ میں نے ضد کی کہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ذرا تمیز سے کام لے۔ اگر اس

کی اس چھوٹی سی ڈراما بازی کی خبر والد صاحب کو ہو گئی، جو جاپان گئے ہوئے تھے، تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔ وہ نرم پڑ گئی۔ "آ کے مجھ سے بلٹن ہوٹل کی لابی میں مل لو۔"

میں اس وقت پورے دنوں سے تھی۔ دائی عائشہ اور نصیبہ کو ساتھ لے کر ٹیکسی کر بلٹن پہنچی۔ میں نے جو قفتان پہن رکھا تھا وہ زچہ گون کا کام بھی دے رہا تھا۔

میں ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئی۔ دو منٹ بعد مصطفےٰ بھی وہاں آ گیا۔ میں نے اسے عدیلہ کے دوسرے فون کی خبر دے کر کہا تھا کہ وہ بھی بلٹن پہنچ جائے۔ عدیلہ نے بڑے ٹھسے سے لابی میں قدم رنجہ فرمایا۔ لابی میں ایک اور مانوس چہرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ چہرہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ایک جگری یار نجیب اللہ کا تھا۔ وہ ہم سے دُور ایسی جگہ موجود رہا جہاں روشنی کم اور سائے زیادہ تھے۔

عدیلہ اور مجھ میں سخت بحثا بحثی ہوئی۔ میں اس کی چھچھوری بازیوں سے نہ صرف تنگ آ چکی تھی بلکہ خاصی پریشان بھی تھی۔ میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ اسے پکڑ لو اور گھسیٹ کر کار تک لے جاؤ۔ "اگر یہ تمہاری بیٹی ہوتی تو تم اب تک اسے قتل کر چکے ہوتے۔ کسی میز کے گرد بیٹھ کر اس کی واپسی کے بارے میں مذاکرات نہ کرتے رہتے۔"

مصطفےٰ نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ عدیلہ بضد تھی کہ وہ گھر نہیں جائے گی۔ "مجھے ایک ایرانی لڑکے سے پیار ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس ہی رہوں گی۔ تم مجھے روک نہیں سکتیں۔"

میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں مصطفےٰ بول اٹھا: "سنو، میں کہتا ہوں اسے دائی عائشہ کی نگرانی میں ایرانی لڑکے کے پاس کیوں نہ بھیج دیا جائے۔" اب میں مصطفےٰ کو دیکھتی رہ گئی یہ ناقابل یقین تجویز تھی۔ مصطفےٰ کے مزاج کے بالکل برعکس۔ میں نے بھڑک اٹھی: "اس طرح کی تو بات بھی تمہیں نہیں کرنی چاہیے۔ عدیلہ کو گھر جانا پڑے گا۔ اور کوئی حل نہیں۔"

عدیلہ اور بھی اکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے لابی میں میرا اور اپنا تماشا بنا لیا۔ میں نے اس تماشے میں مزید رنگ اس طرح بھرا کہ اسے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگی۔ لیکن میری حالت ایسی نہ تھی کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکتی۔ عدیلہ نے میری مزاحمت کرتے ہوئے بڑے زور سے ہاتھ پاؤں چلانے اور قفتان کا پیچھے سے گلا پھاڑ دیا۔ یہ سب کچھ پارک لین میں، بلٹن کی لابی میں ہو رہا تھا۔

مجھے زور آزمائی ترک کرنی پڑی۔ مصطفےٰ تقریباً ہاتھ پہ ہاتھ دھرے تماشا دیکھتا رہا۔ ہم نے طے کیا اور عدیلہ نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی کہ ہم رات ہوٹل میں گزاریں گے تاکہ کسی فیصلے پہ پہنچ سکیں۔ میں نے عدیلہ کو رات بھر کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

میں نے ہوٹل کے ایکسچینج کے ذریعے امی سے بات کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ عدیلہ میرے ساتھ ہے اور ہم ہوٹل میں ہیں۔ عدیلہ دوڑ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ اپنا اطمینان کرنا چاہ رہی تھی کہ میں امی کو ہمارا اتا پتا تو نہیں بتا رہی۔ میں نے امی کو یہ بھی بتایا کہ ہم رات ہوٹل میں گزارنے کی سوچ رہے ہیں تاکہ بات چیت کے ذریعے عدیلہ کو گھر چھوڑنے کا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کر سکیں۔

مصطفےٰ کمرہ بُک کرانے چلا گیا۔ ریسیپشن پر نجیب اللہ بھی اس سے آ ملا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر پہنچے۔ عدیلہ اور میں، نصیبہ کے ساتھ بستر پر سوئے مصطفےٰ اور دائی عائشہ فرش پر لیٹ گئے۔

اگلے دن علی الصبح دیکھتی کیا ہوں کہ امی سنو کے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ وہ رات بھر سراغ رسانی میں مصروف رہی تھیں۔ انہوں نے ہر ہوٹل فون کیا اور وہاں کے سیکورٹی افسروں کے پاس ایک نابالغ مفرور لڑکی کے بارے میں شکایت درج کرائی۔ بالآخر انہیں پتہ چلا کہ یہ والا کمرہ پچھلی صبح "تہمینہ خان" کے نام بُک کرایا گیا تھا۔ جس مرد نے کمرہ بُک کرایا تھا وہ کوئی "مسٹر نجیب اللہ" تھا۔ کمرہ پورے دن استعمال میں رہا تھا۔ کمرے میں لنچ اور چائے منگائی گئی تھی۔

امی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئیں مصطفےٰ باہر چلا گیا۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت کھسیانا نظر آ رہا ہے جیسے اس کے دل میں چور ہو۔ سارا معما حل ہو گیا۔ میرے حواس جاتے رہے لیکن جو کچھ اب مجھ پر آئینہ ہو چکا تھا میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مختلف تصویریں تیزی سے میرے ذہن سے گزریں کس طرح انہوں نے صبح ساتھ گزاری ہو گی۔ وائن کی وہ بوتلیں۔ عدیلہ کا مجھے فون کرنا۔ جب اس نے فون کیا تو کیا مصطفےٰ اس کے پاس تھا؟ کیا وہ مل کر ہمارا مذاق اڑا رہے تھے؟ یہ کس طرح کا ذہن ہے جو ایسی لمبی چوڑی بوجھ بجھول کا تانا بانا بن سکتا ہے؟ میں اسی بستر پر سوتی رہی تھی۔ انہیں چادروں پر۔ میرا جی متلانے لگا۔

ہم ہوٹل سے رخصت ہوئے۔ عدیلہ نے ہمیں تنگ کرنے کے لیے اپنی فتنہ پردازی جاری رکھی۔ ضد کرنے لگی کہ میں تو تہمینہ کے گھر جاؤں گی۔ جب امی نے سمجھا بجھا کر اسے میرے ساتھ جانے سے باز رکھنا چاہا تو وہ ہم دونوں میں پھوٹ ڈالنے پر اتر آئی۔ "میں تہمینہ کے پاس کیوں نہیں ٹھہر سکتی؟ اگر میں رات کو روبینہ کے پاس رہ سکتی ہوں تو تہمینہ کے پاس بھی رات کو رہ سکتی ہوں۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ میں نے تہمینہ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے اور تہمینہ کو ایک دوسرے سے قریب ہوتے نہیں

دیکھ سکتے"۔ اب وہ میری دوست بنی تھی اور امی کی دشمن۔ امی اب مخالفین کی صف میں شامل تھیں۔ ایک طرف عدیلہ تھی اور میں، دوسری طرف امی۔

امی نے کہا کہ میں عدیلہ کو ساتھ لے جاؤں۔ مصطفےٰ، دن بھر مزے اڑانے کے بعد لورپول جا چکا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ سے بات کروں لیکن اس نے خواب آور گولیاں کھا کر ایسی لمبی تانی کہ دن بھر سوئی رہی۔ مجھے اضطراب کے عالم میں نیند کہاں آتی مصطفےٰ اسی شام لوٹ آیا۔ عدیلہ جاگ گئی۔

مصطفےٰ نے آ کر مجھ سے کہا کہ عدیلہ اس کے ساتھ اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے اس کی تھوڑی سی خبر لینی چاہیے۔ اسے کچھ تمیز سکھانی پڑے گی۔ اس لیے اگر تھوڑی دیر تم ہمیں تنہا چھوڑ دو تو ہم دو دو باتیں کر لیں۔" "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میری موجودگی میں بات کیوں نہیں کر سکتی؟ آخر میری بہن ہے۔ اسے ڈر کس بات کا ہے"۔ "اسے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں۔ تم اس کے مسائل سے اپنی امی کو آگاہ کر دینا۔ ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی سے بات کرے جس پر اسے اعتبار ہو، جو بڑی عمر کا ہو"۔ میں نے حسب معمول ہتھیار ڈال دیے۔ عدیلہ اور مصطفےٰ کو راز و نیاز کے لیے میرے اپنے گھر میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ انھیں تخلیہ فراہم کرنے پر میں مجبور تھی۔ میں یہ ماننا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ میری سوچنے کی صلاحیت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ تمام تار مصطفےٰ ہلا رہا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر میرے تمام تار الجھا دیے ہیں۔ تاکہ میں کسی بے صرف کٹھ پتلی کی طرح لٹکی رہوں۔

امی، قرآن ہاتھ میں لیے، غصے میں کھولتی ہوئی آئیں۔ انھوں نے مصطفےٰ پر الزام لگایا کہ اس نے ان کی نابالغ لڑکی کو برباد کر دیا ہے۔ "تم مکار اور خبیث آدمی ہو۔ تخریب تمہاری فطرت میں داخل ہے۔ میں تمھیں خبردار کرتی ہوں کہ ہمارے خاندان کی عزت سے مت کھیلو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹی کو فی الفور میرے پاس بھیج دو۔ میں اسے تمہارے گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔"

مصطفےٰ پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا کہ اس کے کردار کی ایسی تیسی کی جا رہی ہے۔ "آپ کو کیا پتا؟ میں نے اس خاندان کی عزت کی حفاظت کی ہے۔" منو نے بات کاٹ کر مصطفےٰ پر الزام لگانا شروع کیا کہ وہ ایک نابالغ لڑکی کا اخلاق بگاڑتا رہا ہے۔ منو نے نہایت بد تمیزی سے گفتگو کی۔ میں مصطفےٰ کی حمایت کرنے اٹھ کھڑی ہوئی، محض اس لیے کہ ایسا کرنا اب میری جبلت کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے منو سے کہا کہ وہ میرے گھر سے نکل جائے کیونکہ اسے میرے شوہر کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امی عدیلہ کو

گھسیٹ کر کار تک لے گئیں اور وہ تینوں رخصت ہوئیں۔

میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ حقیقت کیا ہے۔ مجھے اپنے ارد گرد صرف فریب کا جال نظر آ رہا تھا۔ میں نے مصطفےٰ کو بٹھا کر بات کی۔ اس کی منت سماجت کی کہ میرے شبہات دُور کر دے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کا دفاع صرف اسی صورت میں کر سکتی ہوں کہ مجھے حقائق کا علم ہو۔ اس اثناء میں مصطفےٰ ایک نیا سکرپٹ تیار کر چکا تھا۔ اس گھریلو داستان میں، جو ابھی جاری تھی،، ایک نیا پیچ ڈالا گیا۔ "منو ٹھیک کہتی تھی۔ اس دن میں نے عدیلہ کو سکول سے پک کیا تھا۔ منو نے ضرور ہمیں دیکھ لیا ہو گا۔ میں کسی کو بتانا نہ چاہتا تھا کہ میں کس لیے عدیلہ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس لیے میں نے منو کی بات جھٹلا دی۔ عدیلہ کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ اسی ایرانی لڑکے سے۔ میں حمل ضائع کرانے کے لیے اسے ایک کلینک لے گیا تھا۔ میں تمہارے خاندان کی عزت کا تحفظ کر رہا تھا۔ اس کے بدلے مجھے نابالغ لڑکی پھنسانے والے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عجیب دنیا ہے جہاں نیکی کرنے کی بھی سزا ملتی ہے۔"

اپنے میاں کی بے گناہی کے اس تازہ ثبوت سے لیس ہو کر میں امی کے پاس پہنچی۔ جو کچھ مصطفےٰ نے کہا تھا ان کے گوش گزار کیا۔ امی کو اس کہانی پر یقین نہ آیا۔ انھوں نے ثبوت طلب کیا۔ کہنے لگیں کہ انھیں اسقاط پر خرچ ہونے والی رقم کی رسید لا کر دکھائی جائے ایسی کوئی رسید مصطفےٰ کے پاس نہ تھی۔ امی نے جاننا چاہا کہ حمل کہاں ضائع کرایا گیا تھا۔ مصطفےٰ نے مجھے بتایا ہی نہ تھا۔ اس کی کہانی میں پھر جھول پڑنے لگے۔ وہ اپنی بے گناہی پر ضرورت سے زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ وہ اس وقت تک مجرم تھا جب تک اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دے۔ بارِ ثبوت اس کے ذمے تھا۔ اس کا دفاع بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔

ان صبر آزما حالات میں میری بیٹی نشا پیدا ہوئی۔ ایک بار پھر میں بالکل اکیلی تھی اور عین اس وقت اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی تھی جب مجھے ان کے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ مصطفےٰ میرے پاس تھا۔

بچہ جننے کی دردیں اپنی جگہ، احساسِ جرم کی ٹیسوں نے بھی میرے اعصاب کا ناس مار دیا۔ میں نے خودکشی کی جو کوشش کی تھی وہ میرے ذہن پر سوار تھی۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ میرا بچہ نارمل نہ ہو گا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ میری خود غرضی کو معاف فرما دے۔ وضعِ حمل کے دوران اس امکان نے پورے وقت مجھے عذاب میں مبتلا رکھا کہ میں غیر نارمل بچے کو جنم دے سکتی ہوں۔ پیدائش کے ذرا دیر بعد مجھے وھیل چیئر میں اپنی بچی کے پاس لے جایا گیا۔ میرا دل ڈر کے مارے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بچی پر نظر پڑتے ہی میری تمام پریشانیاں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس پر مجھے

پیار آیا۔ میں نے گلے سے لاکٹ اتارا جس پر اللہ کا نام درج تھا اور بچی کے گلے میں ڈال دیا تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ والد صاحب نے ایک کنگن بھجوایا جس پر دعا لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے یا میری بچی کو دیکھنے نہیں آئے۔ ان کی یہ ادا میرے دل کو لگی۔ ان کی دعائیں میرے ساتھ تھیں۔

بچی کے پیدا ہونے کے دو گھنٹے بعد مصطفےٰ کمرے میں آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے بشرے پر طیش اور تناؤ کے اثار تھے۔ اس کا یہ موڈ ایسا تھا جس سے مجھے خاصا خوف آتا تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ "مصطفےٰ، تم نے میری زندگی تباہ و برباد کر دی ہے۔ میں یہاں ہسپتال میں بالکل اکیلی پڑی ہوں۔ تم نے سازباز اور توڑ جوڑ سے کام لے کر آفت برپا کی ہے۔ تم کسی ایسی بوڑھی کمینی گنوار عورت کی طرح ہو جو ادھر کی بات اُدھر لگا کر اور خاندانوں میں پھوٹ ڈلوا کر اپنا الو سیدھا کرتی ہے۔ تم نے مجھے میرے خاندان سے جدا کر دیا ہے۔ میری تین بہنیں ہیں۔ ایک بھائی ہے۔ والدین ہیں۔ وہ سب کہاں ہیں؟ آج وہ میرے پاس کیوں نہیں؟ اس بارے میں سوچو تو سہی۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ سوچو"

مصطفےٰ نے جوں جوں میرا طول طویل گلہ شکوہ سنا اس کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی۔ اس نے اٹھ کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس شخص نے، جس کی بچی کو میں نے دو گھنٹے پہلے جنم دیا تھا۔ مجھے گھسیٹ کو دوبارہ پہلی سی اذیت میں لا ڈالا۔ اسی اذیت میں جس میں تھوڑی سی کمی واقع ہو چلی تھی۔ مجھے مارپیٹ اور نیلو نیل کر کے وہ اپنے بیٹے بلال کو لینے ہوائی اڈے چلا گیا۔ وہاں لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا کہ حدیقہ اور بلال بالکل ہم عمر تھے۔ یہ سوچتے ہی میرا جی اوپر تلے ہونے لگا۔

میں ہسپتال میں مقیم رہی۔ شفایاب ہوتی اور سوچتی رہی۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مصطفےٰ کے بے وجہ اضطراب سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے سے ذرا پہلے مصطفےٰ نے مجھے ایک بہت قیمتی سفید کشمیرا کوٹ خرید کر دیا۔ بچی کو لیے ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت میں یہی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ مصطفےٰ میری زندگی کو تہ و بالا تو کر ہی چکا تھا۔ اب یہ کوٹ دے کر گویا میرے آنسو پونچھے گئے تھے۔

ہم ارگلی لین میں ایک چھوٹے سے کاٹیج میں اٹھ آئے جو میرے والدین کے گھر کے بہت قریب تھا۔ لیکن فاصلہ تو اضافی شے ہے۔ بہت پاس ہو کر بھی آدمی دور ہو سکتا ہے۔ اور بہت دور ہو کر بھی پاس۔ میرے والدین ہم سے کھچے کھچے رہے۔ ایک بار بھی ملنے نہ آئے۔

تین مہینے بعد میری سالگرہ پر والد صاحب نے مجھے مبارک باد دینے کے لیے فون

کیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد گھر والوں کے ساتھ یہ میرا پہلا رابطہ تھا۔ وہ دوبارہ ہماری طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے اس سہارے کی ضرورت تھی والد صاحب نے پوچھا کہ مجھے سالگرہ کے تحفے میں کیا چاہیے۔ "آپ سے ملنا" میں نے بلک کر کہا۔ "آج رات آ جاؤ" انھوں نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں نے مصطفےٰ کو بتایا۔ وہ بڑی خوشی سے والدین کے پاس چلنے کو تیار ہو گیا۔ ہم وہاں پہنچے۔ جب ہم سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے بالائی حصے کی طرف جا رہے تھے تو ہمیں حدیقہ ملی جو نیچے جا رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ اس بات کا اشارہ ہو کہ میرا عروج اور اس کا زوال شروع ہے۔ مصطفےٰ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے اوپر چلا آیا۔ یوں میری خاندانی زندگی دوبارہ شروع ہوئی۔ پہلے پہل تعلقات ذرا اٹک اٹک کر آگے بڑھے۔ رفتہ رفتہ ان میں زیادہ ترتیب آ گئی۔

مصطفےٰ کو ہر وقت میری پڑی رہتی۔ اس ختم نہ ہونے والے خبط نے عجیب مسخ شدہ صورتیں اختیار کر لیں۔ اپنے والدین سے میرے تعلقات کے بارے میں اس کا حاسدانہ رویہ بالکل واضح تھا۔ وہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی چین نہ لینے دیتا۔ جب بھی مجھے۔ان کے ساتھ بیٹھے یا مذاق کرتے دیکھتا اس کا مزاج برہم ہو جاتا۔ پھر وہ ایسی بحث کے لیے، جو مارپیٹ پر ختم ہو، کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا۔ میری قوت ارادی کو پاش پاش کرنے کے لیے اس نے ایک حیرت انگیز طریقہ وضع کیا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کرتا جیسے میں کوئی ملزم ہوں اور کٹہرے میں کھڑی ہوں۔ مجھ سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دی جاتیں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ ہوتیں۔ الزامات کا یہ پیچ در پیچ سلسلہ مجھے تھکا دیتا۔ ہم رات کو جونہی اپنے کمرے میں قدم رکھتے یہ سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس وقت تک جاری رہتا جب تک دن کی روشنی پردوں سے چھن چھن کر اندر نہ آنے لگتی۔ وقتاً فوقتاً وہ مجھے کوئی نکتہ سمجھانے کے لیے گھونسوں اور جوتوں سے کام لیتا۔ وہ خود میرے ہی کہے ہوئے لفظوں کو چن چن کر میرے منہ پر دے مارتا یہاں تک کہ آخر کار میری باتوں میں کسی قسم کا منطقی ربط نہ رہتا۔ میں گڑگڑا کر کہتی کہ بس کرو۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی۔ میں صرف اتنا چاہتی کہ یہ اذیت ختم ہو۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کی جیت قریب ہے وہ سوال اور جرح جاری رکھتا۔ "کیا تمہیں سچ مچ افسوس ہے؟" "ہاں" "کیا تمہیں سچے دل سے افسوس ہے؟" "ہاں - ہاں" "تمہارا لہجہ درست نہیں۔ معلوم نہیں ہو رہا کہ تمہیں افسوس ہے"۔ "مصطفےٰ، میں تھک چکی ہوں یقین کرو، مجھے افسوس ہے"۔ "لیکن درحقیقت تم یہ محسوس نہیں کر رہیں کہ تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔" "لیکن میں محسوس کر رہی ہوں۔ محسوس کر رہی ہوں۔" "دو گھنٹے پہلے تم اپنے موقف کی وضاحت کر رہی تھیں، لہٰذا

صفائی پیش کرنے میں مصروف تھیں" کہ تم اپنے کیے کا جواز پیش کر سکتی ہو۔ اب بھی تمہارا یہی خیال ہے--------" "میرا خیال تھا----" خیال تھا، خیال تھا۔ تم سمجھتی تھیں" "نہیں۔ تم نے ثابت کر دیا کہ میں غلطی پر تھی۔" "کیا تم میرے دلائل کی پوری طرح قائل ہو چکی ہو؟" "ہاں مصطفےٰ" "تو اس سے پہلے تم اس کے برعکس کیوں سوچتی رہیں؟ یہ گستاخی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم میری بیوی ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے سوا تمہاری کوئی زندگی نہیں؟-----"

صرف اس جرح سے جان بچانے کے لیے میں اس کوشش میں لگی رہتی کہ اس کے کہے کو جھٹلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسے معلوم تھا کہ میں آزاد رہنا، اپنی مرضی پر چلنا چاہتی ہوں۔ لگتا تھا کہ اسے میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے میں لطف آتا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہمارے تعلقات صرف انہیں بحث مباحثوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ مصطفےٰ کو مجھ سے جو بھی کہنا ہوتا انہیں لڑائی جھگڑوں کی زبانی کہتا۔ ان زبانی جھڑپوں کی مدد سے، جو راتوں کا معمول بن چکی تھیں۔ میری آزادی کو لگام دی جا رہی تھی۔ ان کے ذریعے مجھے اپنے قریبی ماحول سے الگ تھلگ کر دینا بھی مقصود تھا۔ میں ریگِ رواں پر عمارت کھڑی کرنے میں مصروف تھی۔

اپنے تعلقات کو لیپاپوتی کر کے چھپانے کی تمام تر ذمے داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ میں ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی جو مستقل جھوٹ تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اگر میں اپنی تذلیل کا عالم میں چرچا کروں گی تو رسوائی میری ہو گی۔ میں سمجھتی تھی کہ مصطفےٰ میں اتنی طاقت ہے کہ لوگ اس کے کہنے پر میری طرف انگلیاں اٹھانے لگیں گے۔ میں مجرم قرار پاؤں گی اور اس کے دامن پر چھینٹ تک نہ پڑے گی۔ جس معاشرے میں مردوں کو غلبہ حاصل ہو اس پر صرف اس لیے آنچ نہیں آتی کہ مرد کھل کر مرد کا ساتھ دیتے ہیں۔ عورت ہر طرف سے زد میں ہوتی ہے۔ گھر کی چار دیواری کے اندر کوئی بھی خرابی واقع ہو مرد حقائق کو توڑ مروڑ کر ہمیشہ ایسا رنگ دے سکتا ہے کہ بدنامی صرف بیوی کے حصے میں آتی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان ہندسوں کی ترتیب کسی پر ظاہر نہ کروں گی جن کی مدد سے میرے ذہن کی آہنی تجوری کھل سکتی ہو۔

اب میری دونوں بچیاں میری دنیا تھیں۔ مجھے انہیں ان کے باپ سے بچانا پڑتا۔ مصطفےٰ ان سے پیار بھی کرتا، ان کے ساتھ کھیلتا بھی لیکن صرف ایک حد تک۔ جونہی ان کی توجہ بٹ جاتی یا وہ اس کے لاڈ پیار کا جواب پیار سے دینا چھوڑ دیتیں تو اس پر اضطراب طاری ہونے لگتا۔ ان کے رونے دھونے کی وہ تاب نہ لا سکتا تھا۔ میں نے بچیوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ رونے سے باز رہیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے سمندر کو مٹھی میں بند کرنے

کی کوشش کی جائے۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ میں پہلے سے اندازہ لگا لیتی کہ ان کے لیے کب کیا کرنا ہو گا۔ میں چوبیس گھنٹے چوکس رہتی اور ان کی طفلانہ ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہمہ تن مستعد۔ اس دوڑاک کی طرح، جسے کسی مارا تھون دوڑ میں جھونک دیا گیا ہو، دن ڈوبنے تک میں تھک کر نڈھال ہو چکی ہوتی۔

اسے بچیوں کی ضرورت تھی تو صرف اس لیے کہ ان سے اپنی پدرانہ جبلتوں کو سہارا دے سکے۔ ایک بار وہ غسل خانے میں تھا۔ نصیبہ اس کے پاس تھی۔ شیو کرتے وقت اس نے ڈیڑھ سال کی بچی کو ببل باتھ میں بٹھا دیا۔ بچی چھپا چھپ کرتی رہی لیکن تھوڑی دیر بعد پانی اس کے لیے عجوبہ نہ رہا اور بلبلے بھی اس کا دل موہ لینے میں ناکام ہو گئے۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں دوڑی دوڑی گئی تاکہ اسے غسل خانے سے لے آؤں۔ "بہتر ہے اسے باہر لے جاؤں۔ تھک گئی ہے۔" "نہیں" وہ ریزر ہاتھ میں لیے بولا۔ "اسے یہیں رہنے دو۔" "لیکن وہ تھک گئی ہے۔" "تم اسے باہر نہیں لے جا سکتیں۔ میں اسے ببل باتھ میں ٹھہرے رہنے کا حکم دے چکا ہوں۔" "حکم دے چکے؟ لیکن، مصطفےٰ، وہ تو صرف ڈیڑھ برس کی ہے۔" "پھر کیا ہوا؟ جب تک میں کوئی اور فیصلہ نہ کروں اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ جہاں بٹھایا ہے وہیں تمیز سے بیٹھی رہے۔"

نصیبہ نے اس بے رحمانہ فرمان کا بڑا برا مانا۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں وہاں سراسیمہ کھڑی تھی۔ میرا کچھ بس نہ چل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کو کتنا غصہ آ رہا ہے۔ اس کی بیٹی کی یہ مجال کہ حکم نہ مانے! میں نے بچی کو تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی جو گلے کا پورا زور لگا کر اپنا عندیہ ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے پانی کی چھپکوں سے اس کا دل بہلانا چاہا لیکن بچی وہی کرتی رہی جو اس کی سمجھ میں آیا۔ مصطفےٰ دھمکی بھرے انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ مصطفےٰ نے روتی دہاڑتی بچی کو پکڑ کر اس کا سر پانی میں ڈبو دیا۔ ننھے ننھے بلبلے اٹھ کر اوپر آنے لگے۔ اس نے بچی کا سر اسی طرح ڈبوئے رکھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے مزہ چکھانے کا تہیہ کر چکا ہے۔ میں نے منت کی کہ نصیبہ کو چھوڑ دو۔ مصطفےٰ نے میری ایک نہ سنی اور بچی کا سر اتنی دیر تک ڈبوئے رکھا کہ مجھے لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ بچی کی سکت جواب دینے کو ہے تو اسے چھوڑ دیا۔ میں نے جھٹ پٹ اسے ببل باتھ سے نکالا۔ وہ کھانسنے اور پانی اگلنے لگی۔ اس کی آنکھیں ڈر کے مارے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ میری بچی کو ایک روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا تھا مگر اس کی جان بچ گئی تھی۔ مصطفےٰ کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اس قدر سوڈی معلوم ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر باہر چلی گئی۔

نصیبہ کو پانی سے ہول آنے لگا۔ اسے نہلانا عذاب ہو گیا۔ اس کے ننھے ننھے ذہن

میں غسل خانہ عقوبت خانے کا روپ دھار چکا تھا۔ جب نہانے کا وقت آتا تو وہ خوف زدہ ہو کر بے اختیار چیخیں مارنے لگتی۔ ڈوب جانے کے اس خوف پر قابو پانے میں اسے خاصا عرصہ لگا۔

اس سانحے کے بعد میں بچیوں کو مصطفےٰ کے ساتھ اکیلے باہر بھیجتے ہوئے ڈرنے لگی۔ پارک میں تھوڑی دیر کی یہ چہل قدمیاں اچانک جہنم کی سیر میں بھی تبدیل ہو سکتی تھیں۔ اس کی شخصیت کبھی فرشتہ صفت نظر آتی تھی، کبھی ابلیس۔ اس وجہ سے وہ قابِ اعت نہ رہا تھا۔ شخصیت کے اس ستم کا اس نے ایک اور ہی مصرف نکالا۔ اس سے مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کا کام لیا گیا۔ وہ مجھے شکنجے میں لیے رہتا۔ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ اورویل کے ناول "۱۹۸۴ء" کا "بڑا بھائی" معلوم ہونے لگا۔ دور رہ کر بھی مجھ پر نظر جمائے رکھتا۔ جب کسی کو یہ پتہ چلے کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے تو اس کا رویہ اوٹ پٹانگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسے اپنا فطری رویہ بناوٹی اور اکھڑا اکھڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ مصطفےٰ مجھے تلملاتے کسمساتے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا تھا۔

اسے امریکہ جانا پڑا۔ وہ منہ اندھیرے مجھے فون کرتا اور اس بات کو بالکل بھلا دیتا کہ امریکہ اور انگلینڈ کے وقت میں کتنا فرق ہے۔ اگر میں نیند کے خمار میں کھوئی ہوتی تو وہ جھنجھلانے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے فون کے انتظار میں جاگتی رہا کروں۔ "تم جاگ رہی ہو؟" "ہاں"۔ "لہجہ تو نندا سا ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو؟"۔

لیجیے، مصطفےٰ کو برتری حاصل! اس نے ہزاروں میل دور سے مجھے لتاڑنا شروع کر دیا۔ مجھ سے توقع یہ کی جاتی تھی کہ وہ موجود نہ بھی ہو تو بھی ایسے کام کرتی رہوں جن سے اس کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہو۔ فرض کر لیا گیا تھا کہ میں اس کی کمی محسوس کروں گی۔ اس کے بیرونی ملکوں کے مختصر دورے میرے لیے کبھی ستانے کے مواقع ثابت نہ ہوتے۔ میں ہر وقت حاضر خدمت رہتی اور خوف زدہ بھی کہ کہیں کسی بات پر وہ ناراض نہ ہو جائے۔

جب وہ امریکہ گیا ہوا تھا۔ تو ایک روز میں اور عدیلہ اور زرینہ دکانوں کا چکر لگانے اور چند ایک چیزیں خریدنے برنیٹ کراس گئے۔ میں بحراوقیانوس کے اس پار سے گھر سے باہر جانے کی "اجازت" حاصل کر چکی تھی۔

ہم نے خوب مزے کیے۔ جب میں نے چند ایک رسالے خریدے تو بچیوں سے کہا کہ مصطفےٰ کو رسالوں کا نہ بتائیں۔ یہ واحد مطالعاتی مواد تھا جس پر میرے لیے توجہ مرکوز کرنا آسان تھا اور مصطفےٰ کی رائے میں یہ وقت اور روپے دونوں کا زیاں تھا۔ ہم سکول کی ایسی کم سن طالبات کی طرح گھر لوٹے جو مل جل کر کوئی "مفسدانہ" راز دل میں چھپائے

ہوئے ہوں۔

اگلے دن مصطفےٰ کا فون آیا۔ وہ خاصا ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے تفصیل سے بتایا جائے کہ ہم کیا کرتے رہے تھے۔ زیادہ برمحل یہ سوال تھا کہ ہم نے خریدا کیا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا"۔ تم نے اور کیا خریدا؟" اس کے لہجے میں وہ انداز تھا جو کسی پر فوقیت حاصل کر لینے کا غماز ہوتا ہے۔ "کچھ نہیں" میں جھوٹ بولی" میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم نے اور کیا خریدا۔ مجھے جواب دو۔ سچ سچ۔ اور کیا خریدا؟۔ ہیں؟" "کچھ نہیں" میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ میں جان گئی کہ اسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ "مجھے معلوم ہے تم نے کچھ اور بھی خریدا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم نے جو خریدا تھا۔" یہ سن کر میں سہم گئی۔ پھر اس نے خباثت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے ہمیشہ پتہ چل جائے گا۔ تم نے حکم عدولی کی ہے تم نے چند رسالے خریدے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ خریدے ہیں نا؟ چلو، اب بک بھی دو۔ خریدے ہیں نا؟۔

مجھے اعتراف کرتے ہی بنی۔ اس نے مجھے گالیاں دیں۔ میرے چھکے چھوٹ گئے میں کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسے ہمیشہ پتہ چل جایا کرے گا۔ بیشتر اوقات، میں اسکی تابڑ توڑ جرح کے دباؤ کی تاب نہ لا سکوں گی۔ وہ آپ ہی مشتغیث تھا، آپ ہی استغاثے کا وکیل، آپ ہی منصف، آپ ہی جیوری، بہرحال، اس معاملے کی حد تک مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس میرے "جرم" کی ایک چشم دید گواہ بھی موجود تھی۔ عدیلہ۔

ہم خاصے لوگوں کو کھانے پر گھر بلانے لگے۔ پرانے ساتھی اور پاکستان سے آنے والے دوست ہمارے ہاں آ نکلتے۔ رفیع رضا اور ان کی بیگم روز میری باقاعدگی سے ہم سے ملنے آتے۔ انہیں احساس تھا کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔ ہماری ملاقات لینڈریونانٹ اور صبیحہ سے بھی ہوئی اور یہ ملاقات رفتہ رفتہ گہرے مراسم میں تبدیل ہو گئی۔ لینڈریو "دی اکونومسٹ" کے مدیر تھے ور ان کی بیگم صبیحہ کا تعلق پاکستان سے تھا۔

مصطفیٰ کو کھانا پکانے سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ طباخ اعظم تھا اور میری اور دائی کی حیثیت کچے کی نوکرانیوں کی سی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے سارے کام ہم انجام دیں جن میں ہاتھ خراب ہوتے ہوں یا جان کھپانی پڑتی ہو۔ دائی چیزوں کو تراشنے، چھیلنے اور کاٹنے میں لگی رہتی۔ طباخ اعظم ایک سے ایک محیرالعقول کھانا تیار کرنے میں مست رہتا۔ کوڑا کرکٹ ہٹانا، برتن دھونا اور صفائی کرنا ہمیشہ میرے ذمے ہوتا۔ اس دوران میں تناؤ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا۔ کام میں معمولی سا بگاڑ بھی مصطفےٰ کی برداشت سے باہر تھا۔ اگر کھانے کی ترکیب کا کوئی جز موجود نہ ہوتا یا ہم دونوں میں سے کوئی اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے میں ناکام ہو جاتا تو وہ آپے سے باہر ہونے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ضرورت کی تمام

چیزوں کا گھر میں ڈھیر لگا رہے وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا مافی الضمیر ازخود سمجھ جایا کروں اور اسی مناسبت سے اس کے احکام بجا لانے کے لیے خود کو تیار رکھوں۔ اگر ہم اس کے معیار پر پورے نہ اترتے تو باورچی خانہ "ولاتی کیمپ" بن جاتا۔ کھانا تیار کرنے کے ان مواقع پر بڑے بڑے چاقوؤں کے آس پاس پڑے ہونے سے ماحول میں دہشت کچھ اور بھی زیادہ پھیل جاتی۔ ہمارا خون خشک ہوتا رہتا۔ بیچاری دائی عائشہ کی شامت بھی ہوتی۔ وہ نوکرانی ہی تو تھی۔ اس کے ساتھ مصطفےٰ کا تشدد آمیز برتاؤ شدت اور تواتر کے اعتبار سے، میری اور اس کی گپ سے مختلف تھا۔ یہ آقا اور باندی کا رشتہ تھا۔ دائی عائشہ کو بے دردی سے مارتے پیٹتے ہوئے اسے اپنی حرکت کا کوئی جواز پیش نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکتی تھی۔ پیدائشی باندی جو ٹھہری۔ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ مجھے کس طرح آہستہ آہستہ ایک بے زبان اور فرماں بردار غلام میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ آس لگائے رکھتی کہ مجھ میں اتنی اخلاقی گراوٹ کبھی نہ آئے گی کہ میری اور دائی عائشہ کی سطح میں کوئی فرق نہ رہے۔ میں آزاد پیدا ہوئی تھی۔ مصطفےٰ مجھے زنجیریں پہننے پر اکسا رہا تھا۔

میں نے اپنے سوتیلے بیٹے، بلال، کو سیپ سٹیڈ کے ایک ٹیوٹوریل سکول میں داخل کرا دیا۔ میں مصر تھی کہ اسے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے ایک قریبی حلیف، چوہدری حنیف، ہمارے ہاں مقیم تھے۔ انہوں نے لونگ روم میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ ان کا سامان پورے کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ جب ہم کسی کی دعوت کرتے تو چوہدری صاحب کو بے ٹھکانا ہونا پڑتا۔ میں اسی عارضی بیڈ روم کو بار بار لونگ روم میں بدلتی رہتی۔ مکان کی ظاہری وضع کو دیدہ زیب بنانا ضروری تھا۔ میڈیا کے لوگ، مقتدر سیاست دان اور پاکستان سے باہر مقیم پرانے دوست ہر وقت ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہمیں دیواروں پر پینٹ کرانے کا مقدور تو تھا نہیں، اس لیے میں نے دیواروں کو دھونے پر اکتفا کیا۔ "سرف اور پانی" کے ایک پچارے کے بعد گھر کا حلیہ بہتر ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ قیدی بالآخر اپنے یکسانیت کے مارے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کا غصہ دھیما پڑتا جاتا ہے۔ حواس کند پڑنے لگتے ہیں، جوش و جذبے پر پہیہ پھرتا جاتا ہے۔ مجھ پر بھی اسی طرح کی علامات ایک ساتھ طاری تھیں۔ قیدی کی طرح میں بھی آزادی کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ ہم دونوں جس آزادی سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ وہ بس آزادی کے خواب دیکھنے تک محدود تھی۔ میں ان بھولے ہوئے مزوں کا خواب دیکھتی کہ میں فلم دیکھنے گئی ہوں اور پوپ کارن کا پیکٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے ہرگز مان کر ہی نہ دیا کہ میرے خواب کبھی سچ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہر امکان کی راہ میں

حقیقت سنگین دیوار بن کر کھڑی تھی۔ میں چوری چھپے یہ امید کرنے لگی کہ مصطفےٰ مر جائے گا۔ میری نجات کی واحد صورت یہی تھی۔ میں سہم گئی کہ وہ کسی نہ کسی طرح معلوم کرے گا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں نے ان خطرناک خیالوں کو جھٹ پٹ لپیٹ لپاٹ کر چھپا لیا۔

طلاق تو سرے سے ممکن ہی نہیں تھی۔ طلاق کی صورت میں میں بچوں سے بچھڑ جاتی۔ اس کی دشمنی الگ مول لینی پڑتی۔ مجھ میں اس سے ٹکر لینے کا بوتا نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ والدین کی طرف سے مجھے کوئی سہارا نہ ملے گا۔ مصطفےٰ اس کا پکا بندوبست کر چکا تھا کہ میرے اور والدین کے تعلقات متضاد کیفیتوں سے عبارت رہیں۔ وہ ان کے خلاف میرے ذہن میں زہر گھولتا رہتا۔

وہ بڑا بدزبان تھا۔ کسی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے منہ سے زہر جھڑتا رہتا۔ اس کے پاس انتہائی گندی گالیوں کا ایسا ذخیرہ تھا جنہیں سن کر گشتیاں بھی شرما جائیں۔ وہ صرف زبان کے زور سے کسی شخص کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر میری بے عزتی کی جائے تو مجھے کتنا برا لگتا ہے اور یہ کہ مجھے اپنی آن کتنی عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ زبانی وار وہاں کرتا جہاں وار کرنا غیر شریفانہ فعل ہے اور اس کی ایسی تمام باتیں جنسی اشاروں کنایوں سے خالی نہ ہوتیں۔ کسی کو بخشا نہ جاتا۔ مائیں، بہنیں، بھائی، بیٹے، خالائیں، ممانیاں وغیرہ سب اس کی رسواکن باتوں کا نشانہ بنتیں۔ وہ کسی چیز کی تقدیس کا قائل نہ تھا۔ صرف مغلظات پر یقین رکھتا تھا۔ میں خود کو اپنے ہی دوزخ میں رہنے سہنے کا عادی بنا رہی تھی کہ حدیقہ نے دوبارہ سر اٹھایا۔ میرے کرب کا توازن بگڑ گیا۔

مصطفےٰ نچلی منزل میں ورزش کر رہا تھا۔ فون بجا۔ اس نے فون اٹھایا۔ میں نے بالائی منزل پر نصب ایکس ٹینشن سے کان لگا دیے۔ حدیقہ بول رہی تھی: "کیا تمہیں مجھ سے پیار ہے؟ بولو۔ کیا تمہیں مجھ سے پیار ہے؟" مصطفےٰ کی آواز مجھ تک پہنچی۔ "اتنا زیادہ کہ تمہیں کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا"۔

میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، بت بنی ہوئی۔ جو شکوک تھے۔ جو بے یقینیاں تھیں، وہ سب آناً فاناً ناپید ہو گئیں۔ میں نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ فون ہمیشہ ہی ان کا بیری ثابت ہو گا۔ بعد میں، خاصی دیر بعد، میں نیچے آئی۔ مجھ پر اب تک سکتے کا عالم تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کانوں سنی پر یقین لے آؤں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں گندگی میں لتھڑی ہوئی ہوں، برتی جا چکی ہوں۔ میں اب بھی اس سے دوبدو ہونے کے لیے خود کو تیار نہ پا رہی تھی۔ میں اب بھی کسی نہ کسی تنکے کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ کس تنکے کا؟ میرے ذہن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

فون دوبارہ بجا۔ مصطفے نے کسی سے بات کی۔ فون کرنے والے سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے پاسپورٹ کا بندوبست کردے گا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

دوبارہ فون بجا۔ دائی عائشہ نے فون اٹھایا۔ کہنے لگی کہ چوہدری حنیف صاحب ہیں۔ اور فون مصطفے کو تھما دیا۔ میں اوپر چلی گئی۔ ایکس ٹینشن اٹھا کر سننے لگی۔ دل کو پتھر کر لیا۔ اس بار بھی عدیلہ بات کر رہی تھی۔ "میں تمہیں پاسپورٹ بنوا دوں گا۔ فکر مت کرو۔ یہ کام کروا کے رہوں گا۔ لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔" عدیلہ بضد تھی۔ "جلدی سے بنوا دو۔ تمہارے بغیر جینا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ ابھی میں تمہارے ساتھ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ صرف تمہارے ساتھ"۔ میں اب بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کر پا رہی تھی۔ میرا جی متلانے لگا۔

اس سہ پہر ہم دونوں میرے والدین کے ہاں گئے۔ غصے اور دکھ کی وجہ سے میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ اگر مصطفے کو میری کیفیت کا احساس تھا تو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے ایک گھریلو کانفرنس بلائی۔ امی اور عدیلہ کو لے کر میں امی کے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں نے امی سے کہا۔ "مصطفے نے مجھے عدیلہ کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح یہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اسے دق کرتی ہے۔ وہ تنگ آ چکا ہے۔ عدیلہ میری شادی کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ میرے میاں سے پینگیں بڑھانے میں لگی ہوئی ہے۔ وہ اس سے پہلو بچا رہا ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ یہ سب عدیلہ کا قصور ہے۔ یہ میری بہن ہے۔ مصطفے نے کہا ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو قابو میں رکھیں۔ یہ لڑکی شائستگی کی تمام حدیں پھلانگ چکی ہے۔" عدیلہ نے میری کہانی کو درست ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ غصے سے تلملا اٹھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ جو تہمت لگائی ہے اس کا کوئی ثبوت بھی پیش کیا جائے۔ "مصطفے صاحب یہ سب کبھی نہیں کہہ سکتے۔ ان سے بولو کہ یہاں آ کے میرے روبرو ان باتوں کا اقرار کریں۔ جب تک وہ نہ آئیں گے میں اپنی صفائی میں ایک حرف بھی نہیں کہوں گی۔ اس معاملے کا ان سے بھی تعلق ہے۔ آئیں اور سامنے آ کر مجھ سے بات کریں"۔ اسے پورا یقین تھا کہ میرے پاس چال چلنے کے لیے پتّے ہیں ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ مصطفے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے بس میں ہے۔

امی نے اسے اخلاقیات پر ایک لیکچر دیا اور کہا کہ اپنی ان طفلانہ چھلوں سے باز آ جائے۔ اگر اس کے والد کو پتہ چل گیا تو وہ اسے جان سے مار دیں گے۔ میں نے کہا "عدیلہ، میں پہلے ہی بہت سے مسائل میں گھری ہوئی ہوں۔ تم ہو کہ حالات کو اور بگاڑ رہی ہو۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم اپنی زندگی کے ایسے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ جو دشوار بھی ہے اور تذبذب آمیز بھی۔ ہم اکھڑے ہوئے لوگ ہیں؛ جلاوطنی کے دن کاٹ

رہے ہیں۔ تم ہماری زندگیوں کو عذاب بنانے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟ میں بے بس ہو گئی ہوں"۔ "میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تم مصطفے صاحب کو اندر کیوں نہیں بلا لیتیں؟ ہاتھ کے ہاتھ پتہ چل جائے گا کہ معاملہ اصل میں ہے کیا"۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ سراپا یقین تھی۔ مجھے پسپا ہونا پڑا۔

جب ہم گھر لوٹے تو میں نے مصطفے کو ٹیلی فون پر ہونے والی اس بات چیت کے بارے میں بتایا جو میرے سننے میں آئی تھی اور یہ بھی کہ کس طرح میں نے اس پر حرف نہ آنے دیا تھا۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔ اس کے بعد اس پر سراسر جنون طاری ہو گیا۔ اسے اپنے حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی دونالی بندوق اٹھا کر اس کے کندے سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں گر پڑی۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پے درپے مجھ پر ضربیں لگائیں۔ میرے سر میں زخم آ گیا۔ جب خون بہنے لگا تو اس نے ہاتھ روکا۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے کہا "ابھی اسی لمحے اپنی امی کو فون کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تم پاگل ہو۔ انہیں بتاؤ کہ یہ ساری باتیں تم نے دل سے گھڑی ہیں۔ فون اٹھاؤ" وہ دہاڑا۔ "میں...... میں یہ نہیں کر سکتی۔ انہیں میری بات کا ہرگز یقین نہ آئے گا۔ میں اپنا بیان کیسے بدلوں۔ انہیں شبہ ہو جائے گا کہ......" وہ پھر مجھے مارنے لگا۔ "کھڑی ہو جاؤ، کتیا کمینی کی"۔ میں بڑی مشکل سے اٹھی۔ "اپنے کپڑے اتار۔ ایک تار بھی بدن پر نہ رہے۔ اتار کپڑے"۔ میں کانپنے لگی۔ اس نے میری بانہہ اس طرح مروڑی جیسے بانہہ نہ ہو پیچ کش ہو وہ بیٹھا مجھے کپڑے اتارتے دیکھتا رہا۔ اب میں بالکل ننگ دھڑنگ لونگ روم کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ میرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس سے بڑی تذلیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دائی اور بلال کمرے کے باہر میری دونوں بہنوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

مصطفے نے میرا جائزہ لیا۔ سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ وہ مجھے ننگا کر کے میرے ذہن میں زبردستی داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں خود کو بے بس اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ مجھ پر مکمل مایوسی کا عالم تھا۔ میں جس غصے میں گرفتار تھی اس کی وجہ سے میرا یہ احساس دو چند ہو گیا تھا کہ میں باقی دنیا سے کٹ چکی ہوں۔ میں خود کو ڈھانپنا چاہتی تھی۔ اس آدمی کے سامنے جس کی زبان "شرم" اور "حیا" کی فضیلت کا پرچار کرتے نہ تھکتی تھی۔ اب اس نے مجھے اپنا ہی تماشا بنا چھوڑا تھا۔ "پلیز، مصطفے مجھے کپڑے تو پہننے دو۔" "فون اٹھاؤ۔ اپنی امی سے بات کرو۔ پھر ہم دیکھیں گے"۔ "میں کپڑے پہنے بغیر فون نہیں کر سکتی۔" اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میرے پورے خاندان کو دھن کر رکھ دیا۔ میرے حواس اردگرد پھیلے ہوئے خلا میں گم ہو گئے۔ میں جدھر ہاتھ پھیلاتی کچھ ہاتھ نہ آتا۔

میں بڑی مشکل سے کھڑی تھی۔ میرے گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے اور میرے ہاتھ اور بانہیں مجھے ڈھانپنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ میں چاہتی تھی مجھے کوئی سہارا مل جائے۔ کسی بھی چیز کا سہارا، جسے تھام کر کھڑی رہوں۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھکنے کی کوشش کی۔ مصطفےٰ نے مجھے یہ بھی نہ کرنے دیا۔ میں اپنی جگہ سے ہلتی تو وہ چنگھاڑ کر اچھل کھڑا ہوتا۔ میں اللہ کے حضور میں دعا کرتی رہی، گڑگڑاتی رہی۔

بالآخر میں ڈھے گئی۔ میں نے سوچنے کی کوشش بھی ترک کر دی۔ "ٹھیک ہے، میں فون کیے دیتی ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے کچھ پہننے تو دو"۔ میں نے اس حالت میں کپڑے پہنے کہ میرا جسم وجان ابھی تک شرم کے احساس سے تپ رہا تھا۔ میں نے فون کیا۔ میری باتوں میں ربط نہ تھا۔ کچھ کا کچھ کہہ گئی۔ امی کو بتانا تو یہ تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا سب جھوٹ تھا لیکن کہہ یہ دیا کہ سب سچ تھا۔ درحقیقت اس وقت میرے لیے غلط اور صحیح کی تمیز مٹ چکی تھی۔

مصطفےٰ نے میرے ہاتھ سے فون چھین لیا۔ اسے بند کرنے کے بعد وہ مجھے اور بھی شدومد سے پیٹنے لگا۔ میں نے کہا کہ "مجھے معاف کر دو۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔" میں نے امی سے وہی کہہ دیا جو وہ مجھ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ میں رو رہی تھی۔ مصطفےٰ من مانی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اس کی خوشی کا اوچھاپن چھپائے نہ چھپتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے تہمینہ درانی کی آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ اس کے چہرے سے خباثت عیاں تھی۔ مجھے اس کے خدوخال اب زیادہ واضح طور پر یاد آ جاتے ہیں۔ حالانکہ اتنی مدت گزر چکی ہے۔ اس وقت تو وہ مجھے دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ محض ایسی شے تھا جس سے، میں جانتی تھی، مجھے ڈرنا چاہیے۔ اور جس کا حکم کسی معقول وجہ کے بغیر بجالانا پڑے گا۔ "ہاں جی، تہمینہ کی حالت بالکل ٹھیک نہیں۔ وہ پاگل ہو چلی ہے۔" اس نے اشارتاً جتایا کہ میں بچپن میں گردن توڑ بخار میں مبتلا رہ چکی ہوں۔ اسے پتہ تھا۔ کہ میرے باطیانہ رویے کو امی بچپن کے اسی عارضے کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ "بیٹھے بٹھائے فرض کر لیتی ہے کہ یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے۔ خیالی واقعات کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ ہر کسی کے بارے میں واہیات قسم کی کہانیاں گھڑ لیتی ہے اور پھر خود ہی انہیں سچ سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے سب کی جان عذاب میں ہے لیکن زیادہ تکلیف خود اسے پہنچتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ میں گم ہو کر اس طرح سسکیاں بھرنے اور رونے لگتی ہے کہ اسے تسلی دینا ممکن نہیں رہتا۔ میں بڑے تحمل سے اس کی یہ حرکات برداشت کرتا رہتا ہوں۔ آج اس نے جو کچھ کیا اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ مجھے روزانہ کس عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ موصوفہ کو مظلوم بننے کا بڑا شوق ہے"۔

برسوں بعد میں نے نواب پور کی عورتوں کے بارے میں پڑھا جنہیں بعض جاگیرداروں نے نواب پور کے شہر میں ننگا گھمایا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہو گا۔ اس بات کو یاد کر کے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

مصطفےٰ کی اقدار اور ظاہری امیج محض منافقانہ لبادہ تھی۔ یہ تھا وہ شخص جو ہمیشہ ارفع و اعلیٰ الفاظ میں عورت کی حرمت کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اگر میں غسل خانے میں سے کسی ملازم کی بات کا جواب دے دیتی تو اسے پریشانی لاحق ہو جاتی تھی؛ جو مجھے یہ تعلیم دیتا رہتا تھا کہ میرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور اُٹھنے بیٹھنے کے آداب کیا ہونے چاہئیں۔ جس کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت اگر مردانہ محفل میں بیٹھے تو اس کا جسم اچھی طرح ڈھکا ہونا چاہیے اور اسے نظریں نیچی رکھنی چاہئیں۔ یہ شخص رنگا سیار تھا۔ اس نے اپنی ہی بیوی کو، جو اس کی بچوں کی ماں بھی تھی، بے ستر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اب مزے سے بیٹھا اس بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔ کہ میرا ذہنی توازن درست ہے یا بگڑ چکا ہے۔

اپنے شوہر کو اپنے دوستوں اور خاندان کی نظر میں پذیرفتہ بنانا میرے لیے انتہائی دشوار کام ثابت ہوا تھا۔ لوگ مصطفےٰ سے بہت بچ کے رہتے تھے۔ یہ مشہور ہو چکا تھا کہ وہ عورتوں کا بڑا رسیا ہے اور اس معاملے میں اسے کسی قسم کا اخلاقی پس وپیش نہیں۔ وہ جہاں بھی جاتا، اس کی عورت بازی کا ڈھنڈورا وہاں پہلے پٹا ہوتا۔ میں نے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہہ کر اس کی شہرت کو بدلا۔ میری خواہش تھی کہ ہر کوئی اس پر اعتبار کرے، اس پر تکیہ کرے۔ میں نے (پی-آر) PUBLIC RELATIONING کا بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن میں جھوٹ بولتی رہی تھی۔ ستم ظریفی یہ کہ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ مصطفےٰ کی ہوس اگر ایک دفعہ بیدار ہو جائے تو پھر کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ میرا اپنا گھر خود میری سگی بہنوں کے لیے محفوظ نہ تھا۔

عدیلہ کے فون آتے رہے۔ ایک بار بہت رات گئے اس نے فون کیا تو بالکل بوکھلائی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ پریشان نظر آنے لگا۔ "تمہاری بہن بالکل پاگل ہے۔ گھر سے دوبارہ بھاگ جانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ میری پارٹی کے ایک کارکن پر، جس کا نام نعیم ہے، عاشق ہو گئی ہے۔ اس کی ذہنی حالت درست نہیں۔"

میری بات سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا مانوں، کیا نہ مانوں، اسی فکر میں الجھی رہی کہ یہ بات امی تک پہنچاؤں کہ نہ پہنچاؤں۔ اگلی صبح مصطفےٰ نے مجھے جانے تو دیا مگر تاکید کی کہ میں دائی عائشہ کو ساتھ لے جاؤں۔ میں جا کے عدیلہ سے دوبدو ہوئی۔ بظاہر وہ کوئی خاص فکرمند نظر نہ آئی۔ اس کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی محض جھوٹ موٹ کا ڈراوا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ دائی عائشہ نے زیرِ لب

عدیلہ سے کچھ کہا۔ ہم واپس آ گئے۔

اگلی صبح ہمارے پاس سپین سے فون کال آئی۔ امی بول رہی تھیں۔ ان کا پارا چڑھا ہوا تھا اور وہ مصطفےٰ کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ غیظ و غضب کے اس اچانک اظہار پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ بات کیا ہے۔ عدیلہ نے فون سنبھالا اور نپے تلے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ میرے شوہر سے عشق لڑاتی رہی ہے۔ "مجھے اس کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ یہ بات میں تمہیں سہیلی کے طور پر بتا رہی ہوں۔ بہن کی حیثیت سے نہیں۔ تہمینہ، مصطفےٰ کو تم سے نفرت ہے۔ کون ہے جسے تم سے نفرت نہیں۔ امی بھی تم سے نفرت کرتی ہیں۔ تم میں ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو اس سے پہلے کہ مصطفےٰ صاحب مجھے نکال باہر کرتے میں خود انہیں چھوڑ دیتی"۔

میں نے فون واپس چونگے پر دے مارا۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ امی نے اپنا حوصلہ مجتمع کیا اور عدیلہ سے کہا کہ مجھ سے بات کرے۔ میرے لیے تفصیلات جاننا ضروری ہو گیا تھا۔ عدیلہ نے ہر چیز بالکل کھول کر بیان کر دی۔ "ملاقاتوں کا انتظام بلال کے ذمے ہے۔ وہ ہمارا بچولیا ہے۔ وہی ویسٹ لاج پارک ہوٹل میں ہمارے لیے کمرہ بک کراتا ہے۔ کل رات تمہاری آنکھوں کے آگے دائی نے مجھے ایک پیغام پہنچایا۔ مصطفےٰ نے کہلوایا تھا کہ اگر میرا سپین جانا ہو تو رابطے کا کوئی نمبر چھوڑ جاؤں۔ میں اسے چھوڑ کر آنا نہ چاہتی تھی۔ دائی کو یہ ساری باتیں پہلے دن سے پتہ ہیں۔ اس سے پوچھ لو۔"

میں نے بلال اور دائی کو بلایا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ اس معاملہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ امی سے بات کریں اور اُنہیں بتا دیں کہ یہ ساری باتیں عدیلہ نے آپ گھڑی ہیں۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے شبہات کی اب تقریباً پوری طرح تصدیق ہو گئی۔

مصطفےٰ گھر آیا میں نے اسے یہ بات بتائی۔ وہ دہل گیا۔ اس نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ میں نے کہا کہ وہ امی کو فون کر کے عدیلہ کو بے نقاب کر دے۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔

عدیلہ نے ہمیں فون کیا اور بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگی کہ اس کی مصطفےٰ سے بات کرائی جائے۔ مجھے اپنے پر قابو نہ رہا۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی کام نہیں کہ میرے شوہر کو فون کرتی پھرے۔ یہ سن کر وہ بکنے جھکنے لگی۔ میں نے فون چونگے پر پٹخ دیا۔

پھر میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ عدیلہ کو فون کرو اور کہو کہ وہ باز آ جائے۔ اس نے

فون کیا۔ میں ایکس ٹینشن اٹھا کر سننے لگی۔ مصطفےٰ نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ تم میرے لیے بہن کی طرح ہو۔ تمہیں اس طرح کی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ تم اپنے رویے سے بہت سے لوگوں کو دکھ پہنچا رہی ہو۔"

وہ میری طرف مڑا۔ سمجھ رہا تھا کہ اس کی گلو خلاصی ہو گئی۔ "تمہیں زیادہ سختی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ عدیلہ نے ہمارا گھر برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔" میں بولی "تہمینہ، تمہاری بہن کے دماغ میں فتور آ چکا ہے۔ اگر میں اس پر گرجتا برستا تو وہ خود کشی کر لیتی۔ میں یہ خون سر پر لینے کو تیار نہیں"

پھر اس نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ یہ سارا قصہ عدیلہ کے خبط ذہن کی اختراع ہے۔ مجھے اس کے ایک حرف پر بھی یقین نہ آیا۔ لیکن میں اسے اپنی اصلاح کرنے کا ایک اور موقع دینے پر آمادہ تھی۔ میں جھوٹ پر یقین کر کے جیے جانے کو تیار تھی۔

امی اور میں نے ایک دوسرے سے تمام تعلقات ختم کر لیے۔ میں نے کہا کہ اگر امی میری بہن بد چلن ہے تو پھر میرے میاں کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے دوبارہ اپنے خاندان سے رشتہ توڑ لیا۔ اس قطع تعلق سے پیدا ہونے والے خلا کو صبیحہ اور اینڈریو نے پر کیا۔ صبیحہ نے میرے کنبے کی جگہ سنبھال لی اور اینڈریو کی ذات میرے حق میں استقامت کا ستون ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجبور کیا کہ میں اپنے ذہن سے دوبارہ کام لوں میرے ذہن کو، جو مرجھا تھا، بچا لیا۔ اس نے میرے دکھ کو سمجھا اور مجھے اپنی زندگی کے حوالے سے مثبت انداز میں سوچنے پر اکسایا۔ صبیحہ، میں اسے پکڑ نہ پائی اگر وہ صرف اپنے کیے کا اعتراف کر لیتا تو ہم اپنی زندگیاں ازسر نو شروع کر سکتے تھے۔ میں اسے معاف کر دیتی۔ اب میں معاف نہیں کر سکتی۔ بھول نہیں سکتی۔ ہمارے تعلقات کے آگے بہت بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ بنیادیں ہل چکی ہیں۔ مجھے اس پر بھروسا نہیں رہا۔ بہت سی رسوا کن باتیں ہو چکی ہیں جن پر ہم نے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ کاش مجھے پتہ چلے کہ حقیقت کیا ہے؟ وہ تو کبھی اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا۔" وہ بہت کائیاں تھا۔ ایسے نشان مٹا دیتا تھا جن سے اس کا کھوج لگ سکتا تھا۔ اس کی ALIBIS پر کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ اس کی استادیوں کی وجہ سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ عدیلہ صرف ہماری شادی کا ستیاناس کرنے کے لیے جھوٹ بولتی رہی تھی۔ عدیلہ مجھ سے حسد کرتی تھی۔

اس روح فرسا واقعے کے ہو چکنے کے بعد جو دن آئے میں ان کے دوران حاملہ ہو گئی۔ صبیحہ اور اینڈریو کے ساتھ بات چیت نے میرے ذہن کے خلیوں میں، جن پر مسکن ادویات کا خمار چڑھا ہوا تھا، ازسر نو جان ڈال دی۔ میں نے اپنی صورت حال کا تجزیہ شروع

کر دیا اور یہ جائزہ لینے لگی کہ کون کون سی راہِ عمل میرے لیے کُھلی ہے۔ ان خیالی تصویروں میں، جو میں پینٹ کرتی رہتی تھی۔ دھندلے سرمئی رنگ کی جگہ کالے رنگ نے لے لی۔ میں نے دوبارہ اپنی آواز کو پا لیا جسے دبا دیا گیا تھا۔ میں مصطفےٰ کو پلٹ کر جواب دینے لگی۔ تشدد کے خوف کے باوجود میں اس پر جرح کرنے سے باز نہ آتی۔ میرے اس نو یافتہ اعتماد کا جواب مصطفےٰ نے یہ دیا کہ مجھے پہلے سے زیادہ تواتر سے اور زیادہ شدت سے زدوکوب کرنے لگا۔ دم لینے کی مہلت تک نہ ملتی۔ میرے بدن پر ہر وقت نیل پڑے رہتے۔ ہر وقت گالیاں کھانی پڑتیں۔ لیکن میں نے بھی چپ سادھ لینے سے انکار کر دیا۔ میری آرا اس پر گراں گزرتی تھیں۔ میں اپنے خیالات کا زیادہ سے زیادہ اظہار کرنے لگی۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ اس کی ذات، اس کے دوستوں، اس کے پس منظر کے بارے میں میری کیا رائے تھی اور ہمارے تعلقات میں کس چیز کی کمی آ گئی تھی۔ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اس کے اصولوں کے مطابق زندگی تو گزار سکتی ہوں لیکن اس کی من مانیوں سے نباہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنی جس بلاجواز بالادستی کی بنیاد اس نے دہشت اور خوف پر رکھی تھی میں اسے نکتہ چینی کا نشانہ بنانے لگی۔

مجھ میں جو تبدیلی آئی اس کی رفتار سست سہی لیکن تھی وہ مستحکم۔ میرے بتدریج نشوونما کا عمل جاری تھا۔ میں اب وہ ڈرپوک، مسکین اور منکسرمزاج چھوٹی لڑکی نہ رہی تھی۔ جس سے اس نے شادی کی تھی۔ میں عورت کا روپ اختیار کر رہی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میری بات سنی جانی چاہیے تاکہ اسے پتہ تو چلے کہ وہ کہاں غلطی پر ہے۔ میں سرتابی تو نہ کر سکتی تھی۔ اس کا حکم بجا لانے پر مجبور تھی لیکن میری اطاعت میں ایک طرح کا فرق آ گیا تھا۔ میرے تیوروں سے ظاہر ہوتا کہ میں اس کے کہے پر طوعاً و کرہاً عمل کر رہی ہوں۔ میں نے ایک ایسا انداز اپنا لیا تھا جس سے سرکشی اور اختلاف کی بو آتی تھی۔ مصطفےٰ تبدیلی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے آزمودہ داؤ پیچ بے اثر ثابت ہونے لگے۔ وہ اپنی چالوں گھاتوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اور اسے میری نیم دلی سے نمٹنے کے لیے نئی تدبیریں وضع کرنی پڑیں۔ وہ سمجھ گیا کہ مارپیٹ کا اب مجھ پر پہلا سا اثر نہ ہو گا۔ کہ میں زدوکوب کی عادی ہو چکی ہوں۔ اس نے اپنی توجہ، کلی طور پر، میرے ذہن پر مرکوز کر دی۔ وہ مجھے ذہنی طور پر ڈرانے دھمکانے لگا۔ مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتی ہوں تو سوچتی رہ جاتی ہوں کہ کون سی تدبیر زیادہ موثر تھی۔ مارپیٹ یا وہ اذیت جو میرے ذہن کو پہنچائی جاتی تھی۔

اس کے موڈ میں تبدیلی ہمیشہ اچانک واقع ہوتی میری ٹھکائی کے بعد وہ میرے سامنے ناک رگڑنے لگتا۔ زاروقطار روتا، میرا جی منتیں کرنے لگتا۔ انجام کار اسے اس قدر پیچ طرز

عمل سے باز رکھنے کے لیے مجھے ہی کہنا پڑتا کہ بس بہت ہو گیا، مجھے بخشو۔ جتنی نفرت مجھے اس کی ظالمانہ شخصیت سے تھی اتنا ہی اس کا عاجزانہ روپ زہر لگتا تھا۔ میں گڑبڑا کر رہ جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم مان جائیں اور پچھلی بدمزگیوں کو بھلا دیں۔ لیکن پچھلی باتوں کو بھلانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ ہر بار مجھے جو اذیت برداشت کرنی پڑتی وہ پچھلی اذیتوں سے مختلف ہوتی اور ہر بار میری ذات کا کچھ حصہ ختم ہو جاتا۔ نتیجتاً ہم ان لڑائیوں کے حوالے سے جھگڑتے رہتے تھے جو ادھوری رہ گئی تھیں۔ یہ ایک مشتعل کرنے والا عمل تھا جو ہمیں چوٹ لگا کر رہتا۔ بعض اوقات ان لڑائیوں پر نشہ آور چیزوں کے ٹیکوں کا گمان ہوتا۔ ہم لڑنے جھگڑنے کے تقریباً اسی طرح عادی ہو چکے تھے جس طرح نشئی ہیروئن وغیرہ کے۔ خاندان والوں سے کٹ کر میرا اپنے گھر کی حالت سدھارنے کا جوش غلو کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔

دو سال گزر گئے۔ زروینہ کی شادی کا وقت آ پہنچا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھی۔ اس کی خوشی میری خوشی تھی۔ اس کا دولہا اور تمام سسرالی عزیز لاہور سے آ گئے۔ مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔ شادی کی تقریب میں میری موجودگی امی کو منظور نہ تھی گھر میں کوئی میرا نام تک نہ لیتا تھا۔ اس بات سے مجھے دکھ پہنچا۔ یوں لگا جیسے میرا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود مجھے قربان کر دیا گیا ہو۔ ایک بار پھر مجھ پر عیاں ہوا کہ مصطفےٰ کی دخل اندازی نے ہمارے گھرانے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں امی کا ردعمل اور کچھ ہو ہی نہ سکتا تھا۔ میں انہیں معاف کر سکتی تھی۔

ان دنوں مصطفےٰ انگلینڈ سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ میرا ساتواں مہینہ تھا۔ میں نے چشم تصور میں زروینہ، اس کے عروسی جوڑے، اس کے شوہر ریاض اور ان تمام چھوٹی چھوٹی رسموں کو دیکھا جن سے دھیرے دھیرے شادی کا سماں بندھتا ہے۔ میں وہاں جانے، ناچنے، گانے اور زروینہ کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے مچل رہی تھی۔ محروم رہ جانے کا دکھ کیا کم تھا کہ اتنے میں فون بار بار، ڈرانے والے انداز میں بجنا شروع ہو گیا۔ میں فون اٹھاتی۔ دوسری طرف کوئی بھی نہ ہوتا۔ گانے اور ہنسنے کی آوازیں آتیں۔ میں کان لگا کر سنتی۔ شادی کے گیت، ڈھولکی کی جانی پہچانی تھاپ، تال کو قائم رکھنے کے لیے رو پہلے چمچے کی لگک سے سنائی دینے والی جھنکار۔ یہ زروینہ کی شادی ہو رہی تھی۔ سب لوگ اُدھر جمع ہنس رہے تھے۔ گا رہے تھے، جشن منا رہے تھے۔ پھر فون بند ہو جاتا۔

یہ ایک شیطانی کھیل بن گیا کوئی میرے ذہن سے چھیڑ خانی میں مصروف تھا، میرے دُکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہا تھا۔ اس طرح کے فون برابر آتے رہے۔ میں انہیں سن سن کر روتی رہی۔ میری تنہائی کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ذہن کو عذاب دینے کے بڑے

پُرکار طریقے مجھ پر آزمائے جا رہے تھے۔ جب فون بجتا، میں ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

میں نے اس تکلیف دہ ذہنی کھیل کے بارے میں صبیحہ سے بات کی۔ ایک عجیب وغریب صورتِ حال نے مجھے دق کر رکھا تھا۔ عدیلہ دوبارہ ہماری زندگیوں میں مخل ہو رہی تھی۔ صبیحہ نے میرے خدشات سے اتفاق نہ کیا۔ مصطفٰے لوٹ آیا۔ جب میں نے ان فون کالوں کا اس سے ذکر کیا تو یوں لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ میرے ذہن کو گاہے گاہے بھٹک جانے اور دور کی کوڑی لانے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس نے تحائف اور ملبوسات کے ذریعے، جو وہ بیرونی دورے سے لایا تھا، میری توجہ بٹانی چاہی۔ اسے میرے لیے تحائف لانے کا بڑا شوق تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے، مادی ضرورتوں کی حد تک مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے دی ہو۔

میں نے ایک سہیلی کو خفیہ مبصر کے طور پر، شادی پر بھیجا۔ اس نے آ کر جو روداد بیان کی اس کے سہارے میں بھی، گویا غائبانہ، زروینہ کی شادی میں شریک ہو گئی۔ وہ زروینہ کی پولرائیڈ تصویریں بھی اتار کر لائی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ میکے سے رخصت ہوتے وقت وہ کیسی لگ رہی تھی۔ زروینہ کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، جیسے کسی منی ایچر پینٹنگ میں جان پڑ گئی ہو میں نے اسی سہیلی کی زبانی زروینہ کو پیغام بھجوایا۔ میں اپنی بہن کو بتانا چاہتی تھی کہ میں موجود نہ سہی پھر بھی اس کی بالغ زندگی کے آغاز کے موقع پر اس کے ساتھ ہوں، اس سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ اسے خوش وخرم دیکھنے کے لیے دعاگو رہوں گی۔ زروینہ یہ سن کر رو دی۔

گونگے فون آتے رہے۔ فون کرنے والا صرف مصطفٰے سے بات کرتا۔ ہمارے پاس میاں ساجد پرویز اور ان کے بڑے بھائی میاں ریاض ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلال اور دائی عائشہ بھی ہمارے پاس مقیم تھے۔ ان فونوں سے میرا ناک میں دم آ گیا۔ تقریباً ہر آدھ گھنٹے بعد فون آ جاتا۔ میں مصطفٰے سے جھگڑتی۔ یہ سارا معاملہ مجھے بچگانہ اور خام کارانہ معلوم ہوتا۔ میں نے مصطفٰے سے کہا کہ اس کی عمر کے آدمی کو اس طرح کے فون سننا زیب نہیں دیتا۔ "اگر اس طرح کے فون آتے ہی ہیں۔ تو پھر میرے پاس آنے چاہئیں۔ تم اب بزرگ ہو گئے ہو۔ بزرگ ہونے کا ثبوت دو۔"

مصطفٰے کوئی وضاحت پیش کرنے کے بجائے میرے بے بنیاد حسد پر ہنستا رہتا۔ پھر اچانک اس نے یہ کہہ کر مجھ پر بجلی گرا دی کہ بھارتی فلمی دنیا کی حسینہ، لاکھوں دلوں کی دھڑکن، زینت امان اس پر مرمٹی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مصطفٰے نے مجھے بتایا، اور اس کا احساس تفاخر چھپائے نہ چھپتا تھا، کہ وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اسے تنگ کر رہی ہے۔ کہنے لگا کہ یہ تمام فون زینت امان کی طرف سے آتے ہیں اور یہ کہ وہ

اس عورت سے بالکل بیزار ہو چکا ہے۔

زینت امان سے ہونے والی بات چیت سے یہ تاثر بالکل نہ ملتا تھا کہ مصطفٰے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک بار میں کمرے میں آ نکلی تو اتفاقاً معاملے کا ذرا سا حصہ میرے کان میں بھی پڑ گیا۔ "اگر اس شخص نے دوبارہ تمہاری طرف دیکھا تو میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تو گویا یہ اس سے پیچھا چھڑایا جا رہا ہے۔ کیوں؟ لہجہ تو کسی جلے بھنے عاشق سے زیادہ ملتا تھا" میں نے بدتمیزی سے کہا۔ "مجھے پتہ تھا کہ تم ادھر پاس ہی موجود ہو۔ میں نے تمہاری آہٹ سن لی تھی۔ میں صرف تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ فون پر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ادھر آؤ۔" بانہیں پھیلی ہوئیں۔ چہرے پر مسکراہٹ۔ جیسے کسی لمبی جھپٹ کے بعد تنے ہوئے ذہن کے بل کھلتے جا رہے ہوں، جیسے وہ کسی غصے کو ٹھنڈا کرنے پر مسرور ہو۔

کوئی دو گھنٹے بعد خباثت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے وہ مجھے بتانے لگا کہ زینت امان نے اس کی زندگی حرام کر دی ہے۔ "جواب میں میری طرف سے انکار سننا اسے منظور نہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں؟" میں نے جل کر کہا۔ "مصطفٰے، عزت اسی میں ہے کہ تم اپنا قول نباہو یا اس سے نباہو یا مجھ سے۔ اگر تمہارے نزدیک میری، ہماری دو بچیوں کی یا اپنے اس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے، کوئی اہمیت نہیں تو پھر میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں ہمیں چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تم نے زینت امان سے جو قول قرار کیا ہے وہ اس عہد وپیمان سے زیادہ قابلِ تعظیم ہے جو تم نے مجھ سے کیا تھا تو اس کے پاس چلے جاؤ۔ کسی کے ساتھ تو وفا کرو۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم میں وفاداری کا کچھ احساس تو پیدا ہو۔ کسی سے وفاداری کا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ کوئی اور عورت ہی سہی۔" "میں تمہیں یا بچیوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ان سے محبت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔"

پہلے اس نے کچل کر مجھے پلپ میں تبدیل کر دیا اور اب اسی پلپ سے میں ازسرِ نو گھڑی جا رہی تھی۔ اس مستقل گھڑنت اور توڑ پھوڑ، توڑ پھوڑ اور گھڑنت سے میری جان آدھی رہ گئی۔ جو دراڑیں پڑ چکی تھیں انہیں لفظوں سے ڈھانپنا چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔ مصطفٰے نے فیصلہ کیا کہ زینت امان کو بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

اس رات ہم ایک پب گئے۔ مصطفٰے کہنے لگا کہ اس نے زینت امان سے ملنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ کار میں پب آئے گی اور مصطفٰے پب سے باہر اس سے ملے گا۔ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی۔ اس نے مجھ سے اور ساجد سے ساتھ چلنے کو کہا۔ مصطفٰے نے

ہمیں پب میں چھوڑا اور اپنی دوست کی راہ دیکھنے باہر جا کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس شام میں اپنے حواس کھو بیٹھوں گی۔ میں نے جلدی میری منگائی اور اس میں ڈھیروں کے حساب سے ٹباسکو اور ووسٹر ساس ڈال کر واڈکا کری بنانے میں مصروف ہو گئی۔ یہ مشروب تیار کر کے میں نے غٹاغٹ پی لیا۔ ساجد میرے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آئے۔ وہ میری برداشت کی حد سے حیران رہ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے خود بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ میں مصطفے کے ساتھ کیوں نباہ کیے جا رہی ہوں۔ "جب سے میری مصطفے سے شادی ہوئی ہے میں زندہ درگور ہوں"۔

میں انتظار کرتی رہوں کہ دیکھوں ان دونوں کی گفت و شنید کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ زندگی میری، فیصلہ غیروں کے ہاتھ میں۔ مصطفے اکیلا لوٹا۔ ان دونوں میں چیخ پکار ہو گئی تھی اور وہ چلی گئی تھی۔ مصطفے بہت دہلا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے نہ تو کچھ بتایا نہ کھل کر باتیں کیں۔ وہ خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس رات وہ کسی ہونے سے ڈرے بچے کی طرح مجھ سے چمٹا رہا۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں مجھ سے باتیں کیں: "تم شاید مجھے چھوڑ جاؤ۔ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ میں بڑا بیہودہ شوہر ثابت ہوا ہوں۔ تم سے زیادہ بردبار بیوی مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے کس طرح اور کیوں میرا اتنا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔ جن وجوہ کی بنا پر تم نے مجھ سے شادی کی تھی وہ سب دھری کی دھری رہ گئیں۔ میری وجہ سے تمہیں جلاوطنی میں دکھ جھیلنے پڑے۔ میں نے تمہیں اپنے کمپلیکس، اپنے اندیشے اور مسائل برداشت کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے اپنے تمام بوجھ تم پر لاد دیے۔ تم انہیں باوقار انداز میں اٹھاتی رہیں۔ میری جو بھی محرومیاں تھیں ان کا بدلا میں نے تم سے لیا۔ پتہ نہیں تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکتا۔ میں جانتا ہوں تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ اسلام آباد میں جو گھر ہے وہ تم لے لو۔ بچوں کے ساتھ وہاں چلی جاؤ اور معاف کر دینے کی کوشش کرنا۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔"

جذبات میرے تھے مگر اس کی زبانی ادا ہوئے تھے۔ البتہ اس چھوٹی سی تقریر کا آخری حصہ غیر متوقع تھا۔ وہ سو گیا۔ فون بجا۔ مصطفے جھٹ اٹھ بیٹھا۔ اس نے پنجابی میں بات کی۔ کہنے لگا کہ وہ فون کرنے والے کا مسئلہ صبح کو حل کر دے گا۔ اس نے مخاطب ہونے والے یا والی کو تاکید کی کہ اسے صبح گیارہ بجے فون کیا جائے۔

میں پریشان ہوئی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ فون کس کا تھا۔ "یہ زینت امان کی ماں تھی۔ کہہ رہی تھی کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کروں ورنہ وہ میرے رومانس کی خبر "جنگ" لندن میں چھپوا دیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میری سیاسی

موت واقع ہو جائے گی۔" "میرا خیال ہے کہ اس صورت میں تمہیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میرا بھی خیال ہے کہ شادی کرنی ہی پڑے گی"۔ اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔ جب وہ پڑ کر سو گیا تو میں نے نیچے جا کر اپنی دوست، منیزہ بصیر، کو فون کیا جو بمبئی کے فلمی سین سے بہت باخبر رہتی تھی۔ "کیا زینت امان لندن میں ہے؟" "نہیں بمبئی میں ہے۔ کسی فلم میں کام کر رہی ہے۔ درحقیقت کئی فلموں میں کام کر رہی ہے"۔ "یہ بتاؤ کیا اس کی ماں کو پنجابی آتی ہے؟" "مجھے اس میں شک ہے۔ وہ جرمن عورت ہے۔ اگر مجھے غلط یاد نہیں تو اس کا نام ہانتز ہے۔ یہ یقیناً کوئی شریفانہ پنجابی نام نہیں۔ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟" "کبھی بتاؤں گی تمہیں۔" میں نے فون رکھ دیا۔

میں آ کر بستر میں لیٹ گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں اللہ سے دعا مانگی۔ مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ زینت امان ہمارے گھر آئی ہے۔ وہ اندر آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کے بعد عدیلہ اور میری نانی اماں نمودار ہوئیں۔ جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا گھر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا اور گوشت پوست جلنے کی سرانجد آنے لگی۔

میں جاگی تو مجھے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب پھر عدیلہ کی حرکتیں ہوں؟ ہماری آخری مڈھ بھیڑ کو، جو بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی، ڈھائی سال گزر چکے تھے۔ کیا وہ کسی بدروح کی طرح مجھے دوبارہ ستانے آ گئی ہے؟ کیا وہ ابھی تک منتظر پر موجود ہے؟ کیا مصطفے اتنا احسان فراموش ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کی حمایت کی تھی۔ اپنے خاندان سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ کیا وہ اب بھی عدیلہ سے ملتا رہتا ہے؟ کیا میری بالکل کوئی حیثیت نہیں؟

اس خواب کے اثرات مجھ پر مسلط رہے لیکن میں نے کسی سے بات نہیں کی۔ اگلی صبح دیکھتی کیا ہوں کہ نانی اماں چلی آ رہی ہیں۔ وہ پاکستان سے زروینہ کی شادی میں شریک ہونے آئی تھیں۔ اور انگلینڈ آنے کے بعد انہوں نے پہلی بار میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ پہلے وہ خواب اور پھر ان کی آمد اسے اتفاق نہیں کچھ اور کہنا چاہیے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ کیوں آئی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس رات فون انہوں نے کیا تھا۔ مصطفے اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے اس کے دل میں چور ہے۔

نانی اماں رونے لگیں۔ انہوں نے مجھے وہ ساری طولانی داستان سنائی جو میرے والدین کے گھر میں جاری تھی۔ عدیلہ نے امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ مصطفے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مصطفے اور عدیلہ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے۔ اس

نے مصطفے کو الٹی میٹم دیا کہ اب شادی ہو جانی چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ مصطفے مجھے طلاق دے دے۔ عدیلہ کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔ اپنے کہے کی صداقت ثابت کرنے کے لیے اس نے مصطفے کو فون کیا اور پوچھا کہ اس کے کیا ارادے ہیں۔ امی سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ ایکس ٹینشن پر مصطفے کا جواب سنتی رہیں۔ مصطفے نے عدیلہ سے شادی کرنے کی قسم کھائی۔ اس نے کچھ مہلت مانگی۔ بہانہ یہ بنایا کہ میرے حمل کی وجہ سے تاخیر ناگزیر ہے۔ کہنے لگا کہ اسلام میں حاملہ بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں۔ علاوہ ازیں، دو سگی بہنوں سے ایک ساتھ شادی کرنا حرام ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ قرآن میں اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ دو بہنوں سے بیک وقت تعلقات رکھے جائیں۔ اگر یہ ساری باتیں منظر عام پر آگئیں تو اس کا سیاسی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اس نے عدیلہ کی منت کی کہ وہ اس سلسلے میں احتیاط سے کام لے۔ احتیاط کا صلہ یہ ملے گا کہ وہ جلد ہی اس سے شادی کر لے گا۔

نانی اماں کے آنسو بہتے رہے۔ میری نہ ختم ہونے والی اذیت ان کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھ سے خفا بھی تھیں اور اس بیمار آدمی کو خاندان میں جگہ دینے کی ذمے دار مجھے قرار دیتی تھیں۔ اس نے خاندان کی عزت آبرو کو اپنے وحشیانہ پن اور بہیمیت کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے ذرا بھی رو رعایت نہ کی۔ مجھے کھری سنائیں۔

تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تمہاری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے مصطفے سے شادی کی تھی۔ اس نے تمہیں برباد کر دیا۔ تمہاری بہن کمسن ہے۔ اس کی کسی بھلے مانس سے شادی ہو جائے گی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگے گی اور اس خبیث آدمی کو بھول جائے گی۔ عدیلہ کو ہرگز مصطفے کے ہتھے نہ چڑھنے دینا۔ تم پر فرض ہے کہ باقی ماندہ زندگی اس مقصد کے لیے قربان کر دو۔ تم مصطفے سے کبھی الگ نہ ہونا۔ وہ عدیلہ کو نہیں چھوڑے گا۔ خاندان کی عزت بچانے میں تمہیں ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ تمہارے والدین کا کہنا ہے کہ اگر تم نے مصطفے کو چھوڑا تو ان کے پاس واپس جانے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔

ان کی باتیں سن کر میرا اندر سُونا ہو گیا۔ مجھے نظر آنے لگا کہ میرے مستقبل میں اجاڑ پن کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے پھر اوروں کی خاطر سولی چڑھنا پڑے گا۔ مجھے اس خاندان کی ڈھال بننا ہوگا۔ جس نے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بہن کی خاطر دکھ سہنا ہوگا جس نے میرے ساتھ فریب کیا تھا۔ مجھے بڑی چترائی سے دوبارہ اس ماحول کا حصہ بننا تھا۔ جو محرمات کے ساتھ بدکاری کے جرم سے آلودہ تھا۔

میں نے نیچے جا کر مصطفے سے بات کی۔ میں بالکل پُرسکون تھی۔ وہ کسی بھکاری کی طرح میرے قدموں میں گر گیا اور منت کرنے لگا کہ ایک بار اور اس کے کشکول میں سمائی

کا کوئی روکھا سوکھا ٹکڑا ڈال دوں۔ اس نے گڑگڑا کر کہا کہ میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں۔ "میں تم سے وہ سلوک کروں گا جو کسی ملکہ سے کیا جاتا ہے۔ میں آئندہ تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میرا وعدہ۔ میں تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ میں تمہارا حکم مانوں گا۔ جو تمہاری مرضی ہو وہی کرنا۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

کسی درندہ صفت آدمی کو، کسی بے رحم بلائے بد کو، پٹ جانے کے بعد، قابل رحم اور قدموں میں لوٹنے والے آدم میں بدلتے دیکھنا بجائے خود ایک روح فرسا تجربہ ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ کایا پلٹ تھوڑی دیر کے لیے ہے۔ اس کے باوجود میں نے وہی کیا جو مشہور ہے۔ کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"۔

میں مصطفے کو ساتھ لے کر نانی اماں کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اپنے الٹی میٹم کا اعلان کیا۔ کہنے لگیں کہ میری ماں کے لیے اب مزید صبر سے کام لینا ممکن نہیں۔ "اس خاندان کی گردن پر ایک تلوار جھول رہی ہے۔ اب اس تلوار کو گردن پر گرانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ خونریز کارروائی ہو ہی جائے۔ ہم عدیلہ کو گھر سے نکال دیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو تو اسے اپنے گھر لے آؤ۔" مجھے پتہ تھا کہ نانی اماں یہ باتیں صرف اثر ڈالنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ تاکہ انہیں سن کر اس شخص کا سر شرم سے جھک جائے۔ مصطفے کے رد عمل سے ان تمام باتوں کی نفی ہو گئی جو اس نے چند قابل رحم لمحات پہلے مجھ سے کہی تھیں۔ "بہت خوب۔ اگر آپ کا فیصلہ یہی ہے۔ بہت خوب۔ میں جا کر عدیلہ کو اپنے گھر لے آتا ہوں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ جب تک تہمینہ میرے گھر میں موجود ہے میں عدیلہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا"۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی شے چھٹ سے ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں گرتی جا رہی ہوں، بھانبڑوں سے بھرے گڑھے میں گرنے والی ہوں۔ میری بیتی زندگی کے لمحات کوندے کی طرح میرے سامنے سے گزرے تذلیل میں شرابور شبیہیں۔ مکمل لاچارگی۔ یہ ایک عظیم طغیانی تھی۔ میں کارٹونوں میں بنی ہوئی کسی صورت کے مانند مشینی انداز میں ایک ڈگر پر چلی جا رہی تھی، آگے ہی آگے، یہاں تک کہ اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کہاں پہ چل رہی ہوں۔ اور اس کے بعد میرا نیچے جا گرنا۔ میرا اعصابی نظام جو گھس پس کر تار تار ہو چکا تھا بالآخر پرخچوں کا ایک گٹھڑ بن کر ڈھیر ہو گیا۔ میرے آنسو تھمے بغیر بہتے رہے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں آنسو بہا رہی ہوں۔ یہ ۱۹۸۱ء تھا۔ میں نے اس شخص سے ۱۹۷۶ء میں شادی کی تھی۔ پانچ سال میرے پاس سے گزر گئے تھے۔ میرا اعصابی بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے وقت لگا۔ اس عمل میں ایک لمحے کی بھی ڈھیل کبھی نہ ملی۔ میں حیران ہوں کہ بریک ڈاؤن پہلے کیوں نہ ہو گیا۔

نانی اماں چلی گئیں۔ اُنہیں جا کے امی کے پاس رہنا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ امی کی آنکھوں کا ابھی ابھی موتیا بند کے لیے آپریشن ہوا ہے۔ جب سے یہ معاملہ نئے سرے سے شروع ہوا تھا۔ انہوں نے دن رات رو رو کر آنکھوں کا ناس کر لیا تھا۔ ہم سبھی صیدزیوں تھے۔ اس ایک شخص نے ہم سب کو توڑ پھوڑ کر اور ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

مصطفےٰ نے عدیلہ کو فون کیا۔ میں سنتی رہی۔ اس بے ربطی کے عالم میں بھی جو مجھ پر طاری تھا میں سمجھ گئی کہ عدیلہ کے ساتھ اس کی گفتگو کا نچوڑ کیا ہے۔ "تہمینہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی ہے۔ تمہاری امی پر ان تمام باتوں کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ ممکن ہے وہ صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں۔ ہمیں ان سب لوگوں کی خاطر یہ سارا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔"

مجھ پر اور زیادہ دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ معاملہ ختم کوئی نہیں ہوا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اسے جاری رکھنے کے لیے یہ وقت موزوں نہ تھا۔ ساجد اور میاں ریاض نے میری چیخیں سنیں۔ انہوں نے تسلی دینے کی مقدور بھر کوشش کی اور مجھے ویلیم کھانے کو دی۔ ان کے قائد کی شخصیت ان کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ انہیں اچھا نہیں لگا۔

یہ نومبر کی یکم تاریخ تھی۔ اس دن اینڈریو کی سال گرہ تھی۔ ہم ان کے گھر ڈنر پر مدعو تھے۔ میرے لیے جانا ممکن نہ تھا۔ مصطفےٰ مصر تھا کہ میں ساتھ چلوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ آزردہ ہو کر اکیلا چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو۔ اسے توقع تھی کہ سب کچھ نارمل ہو چکا ہو گا۔ میں نے پہلی بار اسے اپنے پاس سے پرے دھکیل دیا۔ میرے انکار پر وہ آگ بگولا ہو کر اٹھا اور مجھے مارنے پیٹنے لگا۔ وہ بربریت کی تمام حدیں عبور کر گیا۔ میرا چہرہ زخمی ہو گیا۔ میرے ہونٹ کٹ گئے۔ بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے۔ وہ مجھے لاتیں مارتا رہا۔ کمرے میں ادھر سے اٹھا اُدھر پھونکتا رہا۔ اس پر خون خوار موڈ سوار تھا۔ اس نے مجھ پر غصہ اتارنا ہی تھا۔ وہ میرے خاندان کی وجہ سے سخت سے بھنایا ہوا تھا۔ مجھے کسی صورت میں سر اٹھانے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ میری طرف سے سرکشی کی ہر ممکنہ کوشش کو کچل دینا ضروری تھا۔ میری یہ مجال کیسے ہوئی کہ اس کی بات نہ مانوں۔ میں تو محض گوشت کا لوتھڑا تھی جسے اس نے اپنی بیوی بنا کر شرف عطا کیا تھا۔ میرے اندرونی اور بیرونی زخم ابھی تازہ تھے۔ اس رات ہمیں ہسپتال جانا پڑا۔ مجھے ٹانکے لگے مجھے تھوڑا سا مرہم ذہن پر لگانے کے لیے بھی درکار تھا لیکن یہ ایسی چیز ہے جو بازار سے نہیں ملتی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ آدمی کی اپنی ذات ہی اس کے حق میں مسیحا ہے۔ اپنے درد

کی دوا مجھے خود ہی کرنی ہوگی۔

مصطفےٰ نے پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جنہیں سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ لفظ جنہیں اتنی بار ناجائز استعمال کیا جا چکا تھا، کہ وہ اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے۔ "تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں عدیلہ کی خاطر تمہیں چھوڑ دوں گا۔ وہ عورت جس نے اپنے بہنوئی تک کو نہیں چھوڑا۔ میں تمہیں ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ تم غیر معمولی عورت ہو۔ عدیلہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا تم سے موازنہ کیا جائے۔"

ہم میں سے کسی کو منتخب کرنے والا وہ کون ہوتا تھا؟ میں نے اس شخص کو یہ استحقاق کیوں دیا کہ وہ مجھے یا عدیلہ میں سے کسی کو چن لے؟ اسے یہ پوزیشن کیوں حاصل ہو گئی؟ کیسے حاصل ہو گئی؟ ہم اس کے سامنے قطار باندھے کیوں کھڑی تھیں؟ ہم کسی دکان کی کھڑکی میں شیلف پر اس انتظار میں کیوں بیٹھی تھیں کہ خریدار ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرے؟

میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس خفت کی شدت میں کچھ کمی آنی چاہیے۔ جو مجھے اپنی چھوٹی بہن کے روبرو اٹھانی پڑی تھی۔ میں نے مصطفےٰ سے نپے تلے لہجے میں کہا جس میں دھمکی بھی شامل تھی۔ "مصطفےٰ، عدیلہ کو فون کرو۔ اسے صاف صاف بتا دو کہ تم مجھ سے اور بچیوں سے محبت کرتے ہو۔ اس سے کہو کہ ہماری زندگیوں سے نکل جائے۔ اس نے ہماری زندگیاں اجاڑ کر رکھ دی ہیں۔ تمہیں اس سے کہنا پڑے گا کہ دفان ہو جائے۔ ابھی ابھی۔" مصطفےٰ نے انکار کر دیا۔ بلاتامل۔ "اگر یہ بات ہے تو مجھے میرے والد کے گھر چھوڑ آؤ۔" وہ کہنے لگا کہ تم جا سکتی ہو۔

وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب جا رہا تھا۔ اس نے مجھے گھر اتار دیا۔ میری بچیوں کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہ ملی۔ میں انہیں چھوڑ کر چلی آئی۔

میں نے گھر میں قدم رکھا۔ مجھے وہاں ملازمہ کھڑی نظر آئی وہ عدیلہ کی بھیدی تھی۔ میرے شوہر کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرنے میں وہ عدیلہ کی مدد کرتی رہی تھی۔ یہ گھر اب میرے والد کا گھر نہ تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا۔ وہاں ماضی کے بہت زیادہ کھٹکنے آسیب موجود تھے۔ میرا ذہن یادوں کی ریل پیل کو جذب نہ کر پایا۔ یہ میرا گھر نہ تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں سے وہ دوسری عورت آئی تھی۔ بدقسمتی سے اور کوئی جگہ نہ تھی جہاں میں جا سکتی۔

اس بڑے گھر میں، کمرے کمرے، میں نے جو کہ چُور چُور اور لٹی پٹی تھی، ایک فیصلہ کیا۔ میں لوٹ کر یہاں نہیں آ سکتی۔ مجھے اپنے بچوں کے پاس واپس جانا ہو گا۔ میں بے وجود ہو چکی تھی۔ مجھ پر لازم تھا کہ اپنی جگہ ڈٹی رہوں اور شکستوں سے چُور اپنی زندگی کو ریزہ ریزہ جوڑ کر ازسرِ نو صحیح سالم بناؤں۔ میں نے فون اٹھایا۔ مصطفےٰ سے بات کی۔ میں نے اس سے کہا کہ آ کے مجھے لے جائے۔ میں اپنے پاؤں چل کر جہنم لوٹ آئی۔ کہتے ہیں کہ آگ پاک کر دیتی ہے۔ میں غلام بن کر رہنے کے باوجود خود کو عجب انداز میں پاک صاف محسوس کرنے لگی۔

میں مصطفےٰ سے کھنچی کھنچی رہی۔ میری بار پر اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ اوپر میرے کمرے میں آ کر مجھ سے کہتا کہ اگر میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہاں ہوں تو مجھے چاہیے کہ اس تمام واقعے کو بھول جاؤں۔ میں کفارے کے طور پر اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتی رہی۔ برف کی سل بنی میں اسے سہتی گئی۔ میری نظر میں وہ عدیلہ کا میاں تھا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی۔ اس نے میرے رویے میں تبدیلی کا نوٹس تک نہ لیا۔

جب وہ میرے بستر سے اٹھ جاتا تو میں غسل کرتی اور نیچے جا کر جانماز پر جا بیٹھتی۔ میں قرآن شریف پڑھتی اور روتی رہتی۔ کلام پاک کے صفحوں پر لکھا ہوا ہر مقدس لفظ میرے آنسوؤں سے تربتر ہو گیا۔ میں اس وقت تک اگلا لفظ نہ پڑھتی جب تک پچھلے لفظ پر میرا آنسو نہ ٹپک چکتا۔ دکھ کے ان کھاری قطروں سے میں نے وضو کیا۔ میں نے اللہ سے فریاد کی۔ میں تائید ایزدی کے لیے تڑپ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ میں شکستہ حال، ہر رات، یہ آس لگائے مصلے پر بیٹھی رہتی کہ کبھی تو اللہ کی مجھ پر نظر ہو گی اور مجھے اس کرب سے چھٹکارا مل جائے گا۔

پورا پندرھواڑہ گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی تبدیلی آنے کو ہے۔ مجھے درد شروع ہو گئیں۔ مصطفےٰ مجھے نیشنل ہیلتھ ہاسپٹل چھوڑ آیا۔ میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ وہ باہر انتظار نہ کرے۔ وہ کہنے لگا کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کے خیال میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ساری لے دے اور دوڑ دھوپ مغربی تصور تھا۔ وہ مجھے یہ بتاتے کبھی نہ تھکتا کہ اس کے گاؤں میں عورتیں کھیتوں میں بچے جنتیں اور بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد دوبارہ کام میں لگ جاتیں۔ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ حمل کے دوران یا وضع حمل کے بعد عورتوں کے ناز اٹھائے جائیں۔ مجھے آرام پہنچانے کے لیے وہ مال خرچنے پر راضی نہ تھا۔

میں نے جب اس سے چلے جانے کو کہا کہ تو میں خوف زدہ تو بہت ہوئی مگر یہ مجھے بالکل گوارا نہ تھا کہ وہ میرے پہلو میں موجود رہے۔ میں چاہتی تھی کہ اس بار جب میں بچہ جنوں تو مصطفےٰ کا سایہ تک ہم دونوں پر نہ پڑے۔ میں ابھی ویٹنگ روم میں تھی۔ مجھے درد

اپنے چاروں بچوں کے ساتھ

بیوی کا ساتھ جس نے میری زندگی بدل دی

لگ گئے۔ میں تکلیف کے مارے چیخنے لگی۔ رنگ دار نرسوں نے میری چیخ پکار کو ہسٹیریا پر محمول کیا۔ وہاں کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ میں چیختی رہی۔ سب کی نظروں میں تماشا بن گئی۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں اعصابی بریک ڈاؤن کا شکار ہوں۔ انہوں نے اوپرے انداز میں گھرک کر کہا۔ "یہ فضول ہائے وائے بند کرو۔ ورنہ تمہیں گھر چلتا کر دیں گے"۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میرے بچہ ہونے والا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔"

دردوں کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا جسم اندر سے کٹا جا رہا ہو۔ میں چیختی رہی۔ میرے ساتھ بیٹھی ایک خاتون نے پوچھا کہ کیا یہ میرا پہلا بچہ ہے؟ یہ سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ میں چوتھے بچے کو جنم دینے والی ہوں۔

وضع حمل کی ان کرب ناک ساعتوں کے دوران مجھے اپنے خاندان کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے مصطفےٰ کا خیال چھوڑ دیا۔ اپنے تمام دوستوں سے بے نیاز ہو گئی۔ میں نے اللہ سے رجوع کیا۔ رسول اللہؐ کا دامن تھام لیا۔ میں نے رسول اللہؐ کی صاحب زادی، بی بی فاطمہؓ اور ان کے شوہر، حضرت علیؓ کا سہارا چاہا۔ میں نے گڑگڑا کر ان سے کہا کہ آئیں اور میرے پاس رہیں اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ میری دعا قبول ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی معجزے کا ظہور ہوا ہو۔ کمرے میں ہر طرف سکون چھا گیا۔ مجھے محسوس ہوا وہ میرے پاس تھے۔ میرے لیے وہی میرا خاندان ہیں۔ اللہ نے انہیں بھیجا ہے۔ میں نے بلاشک وشبہ یہ محسوس کیا کہ حضرت علیؓ اور فاطمہ میرے پاس موجود ہیں۔ میرا پہلا بیٹا نیشنل ہیلتھ سروس کے لیبر روم میں پیدا ہوا۔ میں نے اس کا نام علی رکھا۔

جب ڈاکٹر آیا بچہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کو مطلع کر دیا جائے۔ میں نے کہا نہیں۔ مصطفےٰ دو گھنٹے بعد یوگا کی ورزشوں سے فارغ ہو کر آیا۔ نصیبہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ یہ دیکھ کر جھوم اٹھا کہ میں نے بیٹے اور وارث کو جنم دیا ہے۔ میں حیران ہوئی کہ کس کا وارث کیسا وارث؟

صبیحہ نے میرے کیوبیکل میں خاصا وقت میرے ساتھ گزارا۔ میرا بھائی عاصم بھی میری خبر گیری کے لیے آیا۔ یہ دیکھ کر اسے صدمہ پہنچا کہ میں نیشنل ہیلتھ کلینک میں پڑی ہوں۔ اس نے مصطفےٰ سے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ "مجھے کراہت آ رہی ہے۔ یہ توقع نہ تھی کہ میری بہن کو آپ کے ہاتھوں اس طرح دکھ اٹھانا پڑے گا۔ وہ یہاں پر کیوں ہے؟ اگر آپ بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے شکار کھیلنے جا سکتے ہیں اور مہنگی مہنگی شرابیں خرید سکتے ہیں تو اپنی بیگم کے لیے کمرہ کیوں نہیں لے سکتے؟"

اس زچگی کے بعد مجھ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میرا تجسس پھر سے بیدار ہو گیا۔ میں نے ارد گرد دیکھنا شروع کر دیا لوگوں کی باتیں کان لگا کر سننے لگی۔ میرے آس پاس عام

میری کامیاب بھوک ہڑتال کے بعد جیل میں ایک ملاقات

عورتیں تھیں۔ وہی عورتیں جو ہمیں سڑکوں پر یا ان کاؤنٹروں کے پیچھے نظر آتی ہیں جہاں عطر فروخت ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ بڑے امیرانہ بوتیکوں میں کام کرتی ہیں اور "مادام کی ضرورتیں" پوری کرنے کے لیے بھی جاتی ہیں۔ یکایک وہ میری سہیلیاں بن گئیں۔ ہمارے درمیان رشتہ ہمارے ابھرے ہوئے پیٹوں کے حوالے سے قائم ہوا۔ جو جو ہم پر بیت چکی تھی اس کا موازنہ کیا گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانیاں سنائیں مجھے پتا چلا کہ بیری کی بسیار نوشی ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ سڈ کا باس بڑا ہولناک ہے۔ نینسی کے پاس نیا فریج اور ڈافنے کے پاس نئی واشنگ مشین ہے اور یہ کہ باٹر پر جیز والے پاگی کس طرح ٹروڈی کا رنگین ٹی وی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کیوں کہ فرینک اس کی قسطیں بروقت ادا نہ کر سکا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے المیے میری نظروں میں گھومنے لگے۔ ان کی خوشیاں میری خوشیاں بن گئیں۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ معاشرے میں کس کی کیا حیثیت ہے۔

میں گھر لوٹ آئی میں مصطفےٰ سے کٹ چکی تھی۔ میں اپنی ذات میں گم رہنے لگی۔ میری اولاد میرے لیے توانائی کا سرچشمہ بن گئی۔ میں مصطفےٰ اور اس کی بدمزاجی سے بساط بھر بچتی پھرتی۔ میرے لیے وہ مر چکا تھا۔ ہمارے تعلقات کا وہ دور ختم ہو گیا تھا جس میں میری ایک ایک حرکت، میرا اٹھنا بیٹھنا سب اس کے تابع تھا۔

ہم مل ہل میں ایک خوبصورت مکان میں منتقل ہو گئے۔ مصطفےٰ نے کتے پالنے کی ٹھانی کہ یہ اس کا پرانا مشغلہ تھا۔ اب ہم معاشرے میں روبہ ترقی تھے اور ان مرعوب کن لمبے چوڑے ناموں سے ہمارا اڑوس پڑوس اٹا پڑا تھا ہمارے لیے انہیں جیسے ٹھاٹ باٹ سے رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ کتے رکھنے کے اس خبط نے ہمیں پورے انگلینڈ کا چکر لگوا دیا۔ مصطفےٰ نے آئرش وولف ہاؤنڈ خریدنے کے لیے سکاٹ لینڈ اور ویلز کا سفر کیا۔

باقی تمام باتوں کی طرح اس خبط کی تہ میں بھی ملکیت کی ہوس کارفرما تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے پاس بہت سے کتے ہوں۔ کتا کتنا ہی انوکھا ہو وہ جلد ہی اس سے بیزار ہو جاتا۔ اگر کسی کتے کی دم ٹیڑھی ہوتی تو وہ اس کے شجرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچتا۔ اگر کوئی کتا اس کا کہا نہ مانتا تو اس کا صبر جواب دے جاتا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ کتوں کے پچھلے مالک ان کی کس طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔ یا انہیں چاق وچوبند رکھنے کے لیے دوڑانے ٹہلانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ جب ان کتوں میں سے کوئی سست پڑ جاتا یا زخمی ہو جاتا تو وہ آر ایس پی سی اے (حیوانوں کے ساتھ بے رحمی کے انسداد کے لیے شاہی انجمن) والوں کو بلاتا اور کہتا کہ کتے کو لے جائیں۔ مصطفےٰ کے اس نئے شوق نے میری مت مار دی۔ ہمارے پاس صرف اتنی رقم

تھی کہ ہم بمشکل گزر بسر کر سکتے تھے اور وہ تھا کہ سب کچھ ان کتوں پر لٹائے جا رہا تھا۔ ان میں سے ہر کتا دو سو تین سو پاؤنڈ کا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر بھی بہت خرچ ہوتا تھا۔ گھر میں ادھرمی کی بو بسی رہتی۔ مجھے جو فرصت ملتی وہ زیادہ تر ان کتوں کی نذر ہو جاتی۔ میں اکثر ان کے بارے میں فکرمند رہتی۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کتنا غیر محفوظ اور درماندہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے پاس ایک گریٹ ڈین پلا تھا۔ میں اس کے کوٹھل میں ہیٹر جلا چھوڑ دیتی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ سردی سے اکڑ کر مر جائے گا۔ مصطفےٰ ہیٹر کو بجھا دیتا۔ اس کے بعد وہ جا کے ایک پوری عمر کا رہوڈیشین رج بیک خرید لایا۔

علی کی پیدائش کے بعد میں جھپ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ڈر ڈر کر نہیں جینا۔ جو غفلت مجھ پر طاری تھی میں اسے جھٹک کر پرے کر چکی تھی۔ اپنے پہلے بیٹے کو دودھ پلاتے وقت مجھے روحانی سکون کا احساس ہوتا جو تثلیث میں نے سہی تھی اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے خدا سے قریب تر کر دیا تھا اور مکمل طمانیت کا احساس ہر دکھ پر غالب آ چکا تھا۔

میں اپنے ماضی، اپنی شادی کا تجزیہ کرنے بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ کیا بیتی تھی؟ میں اتنی خوف زدہ کیوں رہتی تھی؟ جو بے عزتی اور تذلیل میرے حصے میں آتی تھی اس کے بارے میرا ردعمل کسی نارمل انسان جیسا کیوں نہیں تھا؟ میں سمجھ گئی کہ میرے شوہر نے مجھے ڈرا دھمکا کر میرے حوصلے اور جوش کو کچل دیا تھا۔ اس نے ہر بات کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے اپنے دوستوں اور اپنے خاندان سے میرے مراسم شدید کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ اس نے مجھے لے جا کر ایک بھول بھلیاں میں کھڑا کر دیا۔ مجھے اس سے باہر نکلنے کی ترکیب معلوم نہ تھی۔ میں الکسائی الکسائی اس بھول بھلیاں میں ماری ماری پھرتی رہی یہاں تک کہ میں نے اپنے مقدر سے سمجھوتا کر لیا۔ میں آپ ہی معما بن کر چیستان بن کر رہ گئی۔ جب وہ کہتا کہ ہماری شادی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے تو اس کے پاس سب سے قوی دلیل یہ ہوتی کہ میں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے اتنا کچھ سہنے کے بجائے (اور کچھ میں ہی جانتی تھی کہ میں کیا کیا سہتی رہی تھی) اسے چھوڑ کیوں نہ دیا، اپنے مصائب کم کیوں نہ کر لیے۔ اس نے میرے تمام سہارے مجھ سے چھین لیے تھے اور میری طنابیں اس طرح کس دی تھیں کہ میں اس کے جزیرے سے، جہاں صرف اس کا بہیمانہ حکم چلتا تھا، کہیں جا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں مصالحت پر اتر آئی تھی۔ اس نے مجھے ذہنی طور تھکا دیا تھا۔ مجھ پر تھکاوٹ اتنی غالب تھی کہ بات کرنے کو بھی نہ چاہتا تھا۔

وہ کبھی ایک انتہا کو چھو لیتا، کبھی دوسری کو۔ اس بنا پر اس کی حقیقی شخصیت کو فوکس میں لانا مشکل تھا۔ اس کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو اتنے جان دار تھے کہ ان پر یقین لانا ہی پڑتا تھا۔ وہ یا تو غضب ناک روپ میں سامنے آتا یا شرمسار روپ میں۔ مجھے اس کے پہلے روپ سے ڈر لگتا اور دوسرے روپ پر ترس آتا۔ میرا ردعمل کبھی اتنا تیز رفتار ہوتا ہی نہ تھا کہ اس کی شخصیت کی سیمابی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکتا۔ کبھی وہ مجھ سے ایسا سلوک کرتا جیسے میں کوئی نافرمان بچی ہوں اور اس کے بعد مجھے ماں کا روپ عطا کر دیتا جس کے پاس بیٹے کی بے راہ روی کو معاف کر دینے کے سوا چارہ نہ ہو۔ اس نے بارہا مجھ سے استدعا کی کہ میں اس کے ساتھ اس طرح پیش آؤں جیسے وہ میرا بیٹا ہو۔ اس کی بے پناہ اداسی میرے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہتی اور جواباً میں وہی کرتی جو وہ چاہتا۔

میں اس کے مرض کی تشخیص کر چکی تھی اب میں نے اس کی دوا تلاش کرنے کی ٹھانی۔ میں نے بات تقدیر پر نہیں چھوڑی بلکہ سرگرمی سے ایک طریق علاج پر عمل در آمد کرنے لگی۔ وہ میرا مریض بن گیا اور میں اس کی نفسیاتی معالج۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرح بچے سے دودھ چھڑایا جاتا ہے۔ اس طرح میں اس سے بری عادتیں چھڑا دوں گی۔ مسئلہ بہت بڑا اور قابو میں نہ آنے والا سہی لیکن ایک تو مجھ پر اصلاح کا جوش سوار تھا اور دوسرے میری اپنی انا کا سوال تھا۔ مسئلے کو دیکھ کر میدان چھوڑ کر بھاگ جانا اور شکست قبول کر لینا بھلا میرے جوش اور انا کو کب گوارا ہو سکتا تھا۔

بچوں کے ساتھ اس کا برتاؤ دیکھ کر امید کی کچھ جھلک نظر آنے لگی تھی۔ دیوانگی کے ان دوروں کا اعادہ نہ ہوا تھا جن کا نصیبہ کو ابتدا میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ لحاظ رکھنے اور پیار کرنے والا باپ بن گیا تھا۔ پہلے سے زیادہ متوازن، پہلے سے زیادہ بردبار۔ میں نے اس تنکے کا سہارا لیا۔ شاید یہ وہی تنکا ہو گا جس کے لادے جانے سے اونٹ کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میری اپنی شخصیت میں تبدیلی آنی ضروری ہے۔ میری پچھلی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ میں اس کی باقی بیویوں سے کسی طرح مختلف ثابت نہ ہوئی تھی۔ میں اطاعت گزار اور ناتواں بن کر رہ گئی تھی۔ دیکھنے کی بات تو آخر یہی تھی کہ وہ اپنی ہر پچھلی بیوی کو دھتا بتا چکا تھا۔ میں نے طے کیا کہ میں اپنی صواب دید کے مطابق اس سے نمٹوں گی۔ میں روز روز کی اس مجنونانہ جھک جھک کو ترک کر کے اس سے کھلم کھلا جنگ کرنا چاہتی تھی۔ سر تسلیم خم کیے رکھنا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اتنی زیادہ اس کے زیر اثر نہ رہوں۔ مجھے کوئی ایسی چال چلنی تھی کہ اگلی بار لڑائی اس کے علاقے میں لڑی جائے۔

دیکھ کر میں پھولی نہ سما رہی تھی کہ میرا ذہن پھر سے چونچال اور فعال ہو گیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جمود کا جو گرد و غبار میرے ارد گرد تھا وہ اڑ کر دور ہونے لگا ہے۔ یہ خدا کا نیا کرم میرے حال پر تھا۔ لگتا تھا کہ علی اس خوش گوار اور حیرت ناک تبدیلی کا نقیب بن کر آیا ہے۔ اللہ نے میری اضطراب آمیز آہ و زاری سن لی تھی۔ اس نے میری خاطر ایک معجزہ کر دکھایا میں دوبارہ جی اٹھی۔

ہم بل بل میں اپنی کاٹیج کے کچن میں تھے۔ مصطفےٰ چاہتا تھا کہ ہم کہیں باہر چلیں۔ میں اس پر راضی نہ تھی۔ میں ابھی علی کو دودھ پلا رہی تھی اور اسے لے کر ٹھنڈ میں باہر نکلنا نہ چاہتی تھی۔ مصطفےٰ حسب سابق اڑ گیا کہ اس کی بات مانی جائے۔ میں نے مزاحمت کی۔ اس نے مجھے میرے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور میرا رخ اپنی طرف گھماتے ہوئے اپنی پسندیدہ دھمکی دہرائی۔ "تمہاری ساری ہڈیاں پسلیاں توڑ دوں گا۔" میں سٹوو کے پاس کھڑی بچوں کے لیے کھانا گرم کر رہی تھی۔ میں نے کھانے سے بھرا برتن اٹھایا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی اور اس پر دے مارا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نہ صرف اس کے اوسان خطا ہو گئے بلکہ وہ بری طرح جھلس بھی گیا۔ جب صدمے کا اثر کچھ کم ہوا تو اس نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ "اگر اب کے تم نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا تو میں چاقو اٹھا کے تمہیں جان سے مار دوں گی۔" میرے لہجے میں زور بھی تھا اور اعتماد بھی۔ دل رکھنے کی خاطر جھک جانے کے دن گزر چکے تھے۔ میں نے جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اسے جلے ہوئے پر لگانے کے لیے برنول دی۔ مرہم لگاتے ہوئے وہ بڑبڑا کر دھمکیاں دیتا رہا لیکن خوف زدہ اور شکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔ "مصطفےٰ میں نے بہت برداشت کر لیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں برداشت کیے جاؤں۔ میرا تمہارا تعلق اختیاری ہے۔ ہم نے اپنی خوشی سے یہ تعلق قائم کیا ہے۔ میں تمہاری بہن یا ماں نہیں۔ تمہاری بیوی ہوں۔ میرا تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ ہم نے مل کر زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا۔ جب میرا جی چاہے گا میں اس عہد نامے کو پھاڑ کر پھونک دوں گی۔ کان کھول کر سن لو۔ میری عزت کرنا سیکھو اور شکر کرو کہ میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے اس بیگار کیمپ میں رہنے کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے طور طریق کی اصلاح کرو اور ہماری زندگیوں کو اس قابل بناؤ کہ جینے کا کچھ مزہ بھی آئے ورنہ میں چلی۔"

وہ سنتا رہا۔ اس کے بعد پرانے جانے پہچانے مصطفےٰ نے دوبارہ سر اٹھایا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی بالادستی کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میرے برق رفتار حملے کے اثرات زائل ہونے لگے تھے۔ "اگر تم نے کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کا سوچا تو میں تمہیں

بخشوں گا نہیں۔ میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھونک دوں گا۔ تمہیں اپاہج کر دوں گا۔ اپنے بچے تم سے چھین کر لے جاؤں گا۔ میں تمہیں تمہاری خوبصورتی سے یوں محروم کر سکتا ہوں۔" اس نے گھمنڈمی انداز میں چٹکی بجائی۔ میں ڈر گئی۔ یہ کوئی خالی خولی دھمکی نہ تھی۔ لیکن میں ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹی۔ میں اس کے ساتھ باہر نہ جانے کے فیصلے پر قائم رہی۔

اس رات وہ ڈٹر کھا کے لوٹا۔ اس نے محسوس کیا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد میں کمزور پڑ چکی ہوں۔ وہ اندھیرے میں ہمیشہ مجھ پر غالب آ جاتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ رات اس کی حلیف ہے۔ ادھر سورج ڈوبا، ادھر میں نے خود کو زیادہ غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ ایسا نفسیاتی مسئلہ تھا جس سے میں ابھی تک نمٹ نہ سکی تھی۔

اس رات اس نے مجھے بڑی بے دردی سے مارا۔ میں نے بھی جواباً اس کی ٹھکائی کی۔ میں اس کے گھونسوں لاتوں کے سامنے نہ تو دبکی نہ سمٹ کر گٹھری بنی۔ میں اس کی توڑ دھنائی کے سامنے ڈٹی رہی اور اپنی پوری طاقت سے جوابی حملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا قہر شدید تر ہوتا گیا۔ وہ غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے اتنا مارا کہ میں ہوش میں نہ رہی۔ تب اس نے ہاتھ روکا۔ وہ مجھے تقریباً موت کے کنارے پہنچا چکا تھا۔ چند منٹ اور مارتا تو شاید میرے قتل کی نوبت آ جاتی۔ وہ رک گیا۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے کوس رہا تھا۔ میری مزاحمت سے خوف کھا کر وہ میرے پاس سے کھسک گیا۔ کھڑا دیکھتا رہا کہ میں کس طرح گرتی پڑتی بستر کی
طرف جا رہی ہوں۔ میں نے جس نظر سے اسے دیکھا اس میں صرف تحقیر ہی تحقیر تھی۔ میں رو تک نہ رہی تھی۔ جتنی بھی ہمت مجھ سے بن پڑی میں اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی بستر میں جا لیٹی، کروٹ لی اور سو گئی۔ میرا یہ سارا رویہ میرے اس کردار کے بالکل الٹ تھا جس کا وہ عادی تھا۔ اس نے میری طرف رخ نہ کیا۔

اس رات کے بعد سے ہماری دھینگا مشتی کا طرز بدل گیا۔ میں اس کی مارپیٹ سے نہ صرف خود کو بچاتی بلکہ اسے مارتی بھی جاتی۔ کسی عورت کو آج تک مصطفےٰ کھر کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ میں اسے مارتی، کھسوٹتی اور بال کھینچ لیتی۔ اپنا پورا زور لگا کر اسے لاتیں مارتی اور دھکے دیتی۔ مصطفےٰ کو پتہ تھا کہ صورت حال جتنے ظلم و ستم کی متقاضی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ظلم و ستم ڈھاتا رہا تھا اور اسی وجہ سے اس کی جارحانہ چالیں بے اثر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اب یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ میرا ردعمل کیا ہو گا۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ وہ اپنے ذہن میں مجھے دہشت زدہ کرنے کے نئے منصوبوں پر کام کر رہا ہے۔

میری بے اعتنائی اس کے حق میں عذاب بن گئی۔ میں نہ تو منہ پھلا کر بیٹھی رہتی۔ نہ یہ چاہتی کہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔ میں مکمل طور پر خود کو الگ تھلگ کر چکی تھی۔ میری دل جمعی سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے دیکھا کہ میں نے رونا دھونا چھوڑ دیا تھا۔ علی کی ولادت کے بعد دکھ درد کے تمام سوتے خشک ہو کر رہ گئے تھے۔ مصطفےٰ نے مجھے مارنا پیٹنا چھوڑ دیا۔ مجھ میں جو نئی نئی اکڑ آ گئی تھی اس سے جھنجھلا کر وہ مجھے مارنے کے لیے اٹھتا۔ میں اونچی آواز میں کہتی۔ "بیوقوف مت بنو۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ بیٹھ جاتا۔ رفتہ رفتہ ان لیوروں تک رسائی ہو رہی تھی جن کی مدد سے کسی دوسرے پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ ٹھکائی کی تمہید کے طور پر وہ مجھ سے کھڑے ہو جانے کو کہتا۔ میں ڈھیٹ بنی، بے پروا سی، اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ ہاتھ سینے پر باندھے۔ "احمق نہ بنو، مصطفےٰ۔ بڑی عمر کا ہونے کا ثبوت دو۔ مجھے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے کسی بالغ آدمی کی طرح بات کرو۔ میں تمہارا مفہوم بہتر طور پر سمجھ سکوں گی۔"

وہ میرے سامنے سے ٹل جاتا۔ میرے غالب آ جانے والے طنطنے سے ٹکرا کر اسے پیچھے ہٹنا پڑتا۔ میں ماں کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ لیکن اس معاف کر دینے والی، رقت آمیز اور جذباتیت میں ڈوبی ماں کا روپ نہیں جسے ہمارے فکشن اور سنیما نے مقبولِ عوام کر دیا ہے۔ میں کٹھور اور سخت گیر ماں تھی۔ کالی ماتا۔ ماں دیوی۔ تباہی کی دیوی، میں مصطفےٰ کو اپنے نئے خدوخال دکھا رہی تھی۔ اور اس کا جوابی رویہ اس لاڈپیار سے بگڑے بچوگڑے کا سا تھا جسے کسی صابر ماں نے، اس کی حرکتوں سے بالکل زچ ہو کر، جھاڑ تو پلائی ہو مگر اوپر سے۔

میں اس کے سامنے جھجکے بغیر ڈٹی رہی تو اس کی گالیاں بکتے رہنے کی عادت بے جان ہو کر رہ گئی۔ ماضی میں اس کی ہر گالی ٹھیک نشانے پر لگتی تھی اور اس کا بڑی دیر تک مجھ پر اثر رہتا تھا۔ اب میں اس کی بدزبانی کو محض ایک پاگل آدمی کا ہذیان اور چیخم دھاڑ سمجھ کر خاطر میں نہ لاتی۔ جب اس کی واہی تباہی ختم ہو جاتی تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ "تم کوئی خاص اچھے تو نہیں لگ رہے تھے۔ ایسی زبان استعمال کرتے ہوئے تم بہت واہیات معلوم ہوتے ہو۔ گفتگو کا یہ انداز تمہارے شایانِ شان نہیں۔ اس سے تمہارے خاندانی پس منظر پر حرف آتا ہے۔"

اس کی طرف سے برسنے والے زبانی تیر تکوں گولی چھروں سے بالکل بے نیاز ہو کر میں اپنے کام میں مشغول رہتی۔ یہ دیکھ کر وہ جھلا اٹھتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ میری بے اعتنائی کا کیا توڑ کرے۔ اس کی باتیں سننے میں کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس پر اور

بھی زیادہ آزردگی چھا گئی۔ ماضی میں میرے آنسوؤں، میرے دلائل اور میری منت سماجت سے اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی بے محل مردانگی کے زبردست کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہو۔ میرے سکوت نے اسے برباد کر ڈالا۔

وہ اپنی فاضل توانائی کو کہیں نہ کہیں صرف کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جس بورے پر وہ کے بازی کی مشق کیا کرتا تھا وہ الٹ کر اس کے منہ پر آ لگا تھا۔ جسے تختۂ مشق بنایا جاتا تھا وہ اس کے ہاتھ سے کوڑا چھین چکی تھی۔ اپنے اندر بھری ہوئی کروی کو دور کرنے کے لیے وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ یہی وہ دن تھے جب اسے کتے پالنے کا شوق چرایا۔

گریٹ ڈین پلے کو دیوقامت رہوڈیشین رج بیک کے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا گیا۔ پلے کی ہڈیاں ابھی نرم تھیں۔ وہ اتنے بڑے کتے کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئیں۔ مصطفےٰ نے اسے بھی آر ایس پی سی اے کے سپرد کر دیا۔

اس کی جگہ ایک بل ٹیریر نے سنبھالی۔ وہ کوئی معمولی بل ٹیریر نہ تھا۔ عالی نسب بھی تھا اور زبردست چیمپین بھی۔ اسے کوئی خطاب بھی مل چکا تھا۔ جب اس کے نرالے پن سے جی بھر گیا تو اس کی بھی چھٹی ہو گئی۔ اس کے بعد مصطفےٰ چھ آئرش وولف ہاؤنڈ خرید لایا۔ ان کتوں کو حاصل کرنے کے لیے مصطفےٰ اور اس کی بیگم صاحبہ کو جا کے انٹرویو دینا پڑا۔ میں نے پہلے اپنی عالی نسبی کا ثبوت فراہم کیا۔ تب کہیں کتوں کے مالک نوازشِ خصوصی فرما کر کتے ہمارے ہاتھ بیچنے پر آمادہ ہوئے۔ میرے زرق برق ریشمی کپڑوں کا ان پر کوئی رعب نہ پڑ سکا۔ کسی طرف سے لگتا ہی نہ تھا۔ کہ مجھے کتوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ مزید یہ کہ مجھے کوئی غیر ضروری ذمے داری قبول کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ مجھے کتوں سے ڈر لگتا اور میں ان سے پرے پرے رہتی کیونکہ وہ ناپاک تھے اور میں ٹھہری نمازی۔ چند ایک کتے مصطفےٰ میری وجہ سے خریدنے میں ناکام رہا کیونکہ میں ضرورت سے زیادہ "میم صاحب" نظر آ رہی تھی۔ جو مالک زیادہ سادہ لوح واقع ہوئے تھے میں انہیں خبردار کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے کتے ہمیں نہ دیں۔ مصطفےٰ بہت جلد کتوں سے اکتا جاتا اور ان کی دیکھ بھال کی تمام ذمے داری میرے کندھوں پر ڈال دیتا۔ وہ ان کے ساتھ اس طرح پیش آتا جیسے وہ دیسی کتے ہوں۔ وہ انہیں باہر ٹھنڈے میں رہنے دیتا اور ان کے ساتھ محبت یا شفقت کا سلوک کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ ان کتوں کو صرف اپنے ارد گرد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان میں شکاری کتوں کے شوقین حضرات کی خاص الخاص ٹولی کو اس پر رشک آ رہا ہو گا۔ ممتاز بھٹو کے پاس تقریباً ساٹھ شکاری کتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصطفےٰ اپنے کتوں کو پاکستان بھجوانے کی سوچنے لگا۔ اس کا یہ خیال مجھے خارج از امکان نظر آیا۔ لیکن جو خیالی پلاؤ وہ پکاتا رہتا تھا میں اس کھنڈت نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

بھی تو تھا کہ کتوں کی وجہ سے اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ اب اس کے ذہن پر پھر یہ صرف میں سوار نہ رہتی تھی۔

اس کا طرز عمل ہندوستان میں مقیم کسی ایسے انگریز جیسا تھا جو دھوپ سے بچاؤ کا ہیٹ پہنے بغیر جون کی جھلستی سہ پہر میں گھر سے نکل پڑا ہو۔ وہ اپنے ویلنگٹن بوٹ ڈاٹ کر کتوں کو ٹہلانے لے جاتا۔ دائی عائشہ کو بھی تین کتے گھمانے پھرانے لے جانا پڑتا۔ وہ شلوار کے پائنچے گم بوٹوں میں اڑسے چل دیتی۔ کتے بیچاری کو گھسیٹے لیے جاتے یہاں تک کہ ایسا لگتا جیسے وہ اسے ٹہلانے لے جا رہے ہوں۔ وہ بہت ناراض تھی کہ ناپاک جانور کو ہاتھ لگانا پڑتا ہے اور اس دن کو کوستی اور جھینکتی رہتی جب اسے زندگی میں پہلی بار کتوں سے واسطہ پڑا۔ ظاہر ہے، وہ یہ خیال رکھتی تھی کہ اس کا واویلا مصطفےٰ کے کان میں نہ پڑے۔ میں اپنے بچوں میں منہمک تھی۔ ہم سب مل کر کھیلتے اور ٹی وی دیکھتے۔ میں نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ بہتر لباس پہننے لگی اور پھر سے وہی پرانی تہمینہ بن گئی۔ یہ وہ دن تھے جب ہمیں نسبتاً زیادہ آرام نصیب تھا۔

ہم نے ایک بار پھر گھر بدلا۔ اب کے ہم برونڈز بیری پارک میں ایک بڑے سارے مکان میں منتقل ہوئے۔ مجھ میں کچھ کچھ خصلت کسی فوجی کی بیوی کی پیدا ہو گئی تھی۔ میں سامان باندھنے اور کھولنے میں ماہر ہو چکی تھی۔ میرا مزاج سیلانی نہیں۔ اس لیے جو کچھ میں نے سیکھا طبیعت پر جبر کر کے سیکھا۔ لیکن یہ سارا کام کرتے ہوئے میں نہ تو کبھی بڑبڑائی نہ شاکی ہوئی۔

نیا مکان بہت ہی طویل و عریض تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی عرب شیخ کے الف لیلوی خواب کو کھلی چھٹی مل گئی ہو۔ یہ مکان ہمیں سیٹھ عابد نے دیا تھا۔ اس میں چھ سونے کے کمرے اور چھ غسل خانے تھے جو انگلستان کے حساب سے عیش و آرام کی انتہا تھی۔ مکان کی وسعت مجھے اچھی لگی۔ وہاں نہ تو یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم دڑبوں میں بند ہیں۔ نہ یہ کہ ایک دوسرے کے سر پر سوار ہیں۔ ہم وہاں اس طرح رہ سکتے تھے کہ ایک دوسرے کا ساتھ بھی ہے اور سب اپنی اپنی جگہ خوش بھی ہیں۔ ہمارے بیشتر مہمان جا چکے تھے۔ بلال بھی گھر پر نہ رہتا تھا اب اس نے اپنے دوستوں کے پاس ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ہم نے طے کیا کہ پاکستان سے اپنے باورچی کو بلا لیا جائے۔

برونڈز بیری پارک میں ہم لوگوں کو خاصا مدعو کرتے رہے۔ ہم نے بڑی اعلےٰ تکلے والی ضیافتوں کا اہتمام کیا جن کے لیے ہمیں پرتکلف لباس پہننے پڑتے اور پروٹوکول کو ملحوظ رکھنا ہوتا۔ میں چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے مہمانوں میں گھوم پھر کر متواضع میزبان خاتون کا کردار بھرپور انداز میں ادا کرتی۔ ہمارے مہمانوں کی فہرست میں

پیپلز پارٹی کے اہل دانش اور اہل تابش کے نام، جنھیں بڑی سوجھ بوجھ سے چنا جاتا، جابجا نظر آتے۔ ہماری دعوتوں میں شو بزنس کی شہرہ آفاق شخصیتیں بھی موجود ہوتیں اور سیاسی لحاظ سے بھاری بھر کم افراد بھی۔

مصطفےٰ نے میری بدلی ہوئی شخصیت سے سمجھوتا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جس طرح وہ میری ٹھکائی کرتا ہے اسی طرح میں بھی اس سے بدلہ لیتی ہوں۔ لہٰذا اسے اپنے تشدد میں اضافہ کرنا ہو گا۔ یہ بہت خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا تشدد پہلے ہی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مزید درندگی کا ثبوت دیا گیا تو ممکن ہے میری موت واقع ہو جائے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ جو موڈ مجھ پر اب طاری ہے اس کے زیر اثر مجھے اس کے بہیمانہ رویے کو بے نقاب کرنے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس طرح کے انکشاف سے اس کے سیاسی کیریر کو بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی بیوی خود ہی دنیا کو اپنی چوٹیں اور نیل دکھانے پر اتر آئے تو اخباروں کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ یہ خطرہ مول لینے کو وہ تیار نہ تھا۔ وہ بے بس ہو چکا تھا۔

کتے اچانک غائب ہو گئے۔ مصطفےٰ نے ان میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اب اس نے کنیریاں اور فنچیں جمع کرنی شروع کیں۔ دیکھتے دیکھتے اس قسم کی سیکڑوں چڑیاں اکٹھی ہو گئیں۔ جن پنجروں میں یہ چڑیاں ہمارے پاس آئیں وہ بہت بد شکل تھے۔ میں نے فی الفور ان کے بجائے پیتل کے آرائشی پنجرے منگائے۔ چڑیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ان کو رکھنے کے لیے کوئی نئی جگہ ڈھونڈنی پڑی۔ مصطفےٰ نے کھانے کے کمرے کو چڑیا خانے میں بدل دیا۔ پنجروں کے مقابلے میں انھیں بہت کھلی جگہ ملی تو چڑیاں خوشی خوشی ادھر اُدھر اڑنے لگیں۔ قالین، فرش، کھانے کی میز، غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ان کی بیٹیں نظر نہ آتی ہوں۔ شوق وہ پالتا تھا اور ہر بار گھر کی صفائی میرے حصے میں آتی تھی۔ چوں کہ کھانے کا کمرا دعوتوں کے لیے مخصوص تھا اس لیے چڑیوں کو دوبارہ ان کے پنجروں میں پہنچانا پڑتا۔ یہ روز کا معمول بن گیا۔ مصطفےٰ اور دائی عائشہ چکر پر چکر کاٹتی چڑیوں کو پکڑنے کے لیے گھنٹوں لگے رہتے۔ میں حیران پریشان ہو کر انھیں دیکھا کرتی۔ اگلی صبح پرندوں کو دوبارہ کھانے کے کمرے میں لا کر چھوڑ دیا جاتا جو ان کا بڑا پنجرہ بن چکا تھا۔ مجھے مصطفےٰ کے دم خم پر اور اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ اسے اپنا قیمتی وقت یوں ضائع کرنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ ہم نے برونڈز بیری پارک میں آٹھ مہینے ان چڑیوں کو پکڑنے اور کھانے کے کمرے میں لا چھوڑنے میں گزارے۔ آخر ایک دن مصطفےٰ نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ اور بڑے شکاری پرندے انھیں چٹ کر گئے۔

یکایک ہمیرے پاس ڈھیر ساری دولت آ گئی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ

رقم آئی کہاں سے ہے۔ ہم نے کوئی ایسا مکان ڈھونڈنا شروع کیا جسے خریدا جا سکے۔ مکان میری مرضی سے خریدا جانا تھا۔ مصطفےٰ گھریلو امور کے قلم دان سے میرے حق میں دست بردار ہو چکا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میرا ذوق اچھا ہے۔ اس کی واحد شرط یہ تھی کہ مکان دیہی علاقے میں ہونا چاہیے۔ ہمیں مغربی سسکس میں بیرنز میر میں ایک خوبصورت مکان ملا۔ میں دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی۔ ساتھ میں گیارہ ایکڑ جن کی ہریاول اتنی ہری کہ کیا کہوں۔

مصطفےٰ نے وہ گھر مشترکہ ملکیت کی بنیاد پر خریدا۔ اس وقت اس نے مجھ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمہیں کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ تمہارے سوا میں کسی عورت کو بیوی تسلیم نہیں کر سکتا۔" بالآخر مجھے تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ یوں لگا جیسے ہم کسی ڈراؤنے خواب سے نکل کر سہانے خواب میں قدم رکھ چکے ہوں۔ یہ پہلا گھر تھا جسے میں اپنا کہہ سکتی تھی۔ مصطفےٰ نے کبھی کوئی جاگیر اپنی کسی بیوی کے نام نہیں کی تھی۔ وہ ٹوک انداز میں کہتا تھا کہ اسے کبھی یقین ہی نہ ہوتا کہ ان کے ساتھ شادی کتنی دیر چلے گی۔ جب ہم بیرنز میر منتقل ہوئے تو مصطفےٰ نے عہد کیا کہ وہ خود کو بہتر شوہر ثابت کر کے دکھائے گا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ آیندہ کبھی نہ تو مجھے مارے گا۔ نہ گالیاں دے گا۔

وہ جب آپے سے باہر ہوتا تو مجھے گالیاں دینے پر اتر آتا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ جسمانی تشدد سے تو باز آ سکتا ہے لیکن منہ کو لگام دینا اس کے بس میں نہیں۔ جو چوٹیں روح کو لگتی ہیں، جو نیل روح پر پڑتے ہیں انہیں کون دکھا سکتا ہے۔ اب اس کے تشدد کا نشانہ دائی عائشہ بننے لگی جو اس کے نزدیک زر خرید باندی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ کس منہ سے مزاحمت کرتی۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ گھونسوں پر گھونسے کھاتی رہے۔ مجھے اس پر رحم آتا اور میں اسے بچانے کی کوشش کرتی۔ میں جانتی تھا کہ مصطفےٰ کی نظر میں وہ تھونڈ کی عوض ہے۔ اپنے اندر بھرے ہوئے مایوسانہ غصے کو اس نے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پر تو نکالنا تھا۔

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اندرونی، ڈیزائن کے لیے خداداد صلاحیت کی مالک ہوں۔ میں نے تمام کھڑکیوں کو اس طرح اب وہ لان، جو کہیں سے ذرا سے اونچے اور کہیں سے ذرا سے نیچے تھے، چوکھٹوں میں سما گئے۔ فطرت آرٹ کی نقل کرنے لگی۔ ہر کمرے سے ہمیں خوش نما منظر دکھائی دیتا۔ گھر کو ڈیزائن اس انداز سے کیا گیا کہ آپ کو یہ محسوس ہوتا جیسے کسی بنے سنورے باغ میں بیٹھے ہوں۔ اپنی تخلیقی استعداد کو بروئے کار لانے کا یہ زبردست موقع تھا۔ میں نے گھر کی آرائش و زیبائش پر خاصا وقت صرف کیا، یہاں تک کہ

وہ کمالِ فن کا نمونہ بن گیا۔ منتقل ہونے کے بعد پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ مرغیوں کے لیے ڈربا بنایا۔ ڈربا بھونڈا تھا۔ ضروری معلوم ہوا کہ وہ لان، ندی اور خود مکان کے سہانے گرد وپیش میں ابھرا نہ دکھائی دے۔ چنانچہ میں نے اسے پہاڑی پر ایک درخت کی اوٹ میں بنوایا تاکہ ہمیں نظر نہ آیا کرے۔ بے صبح سویرے پہاڑی پر چڑھتے اور انڈے اکٹھے کرتے۔ انہیں فطرت کے ساتھ صحیح معنی میں تھوڑی بہت میل جول کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ اب انڈے ٹیٹرا پیک میں نہ آتے تھے۔ انڈے دینا مرغیوں کا کام تھا۔

تالاب میں ہم نے کینیڈا کے ہنس پالے۔ ہر شام وہ مٹکتے ہوئے ہمارے اگلے دروازے تک آ کر اس وقت تک ہونق ہونق شور مچاتے رہتے جب تک انہیں کچھ کھانے کو نہ دیا جاتا۔ ان کی مدد سے گھڑیاں ملائی جا سکتی تھیں۔ ہر صبح دس بجے وہ صحت بنانے کے لیے ہوا خوری کرنے نکلتے۔ تالاب سے باہر آ کر مٹکتے مٹکاتے پہاڑی پر چڑھتے۔ اور وہاں بیٹھے دھوپ سینکتے رہتے۔ گھنٹے بھر بعد سب اٹھ کھڑے ہوتے اور پہاڑی سے اتر کر تالاب میں آ جاتے۔ شام کو وہ قطار باندھ کر چلتے ہوئے مکان کے اگلے لان میں آتے اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور جب تک انہیں راتب نہ دیا جاتا اس وقت تک لان میں بطخا چال چلتے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔

اس دیہی ماحول کے سکھ چین میں خلل ڈالنے کے لیے دو کتے بھی ہمارے پاس آ موجود ہوئے۔ برونو نامی ایک لیبرا ڈور اور ایک انگلش سپر نگر ٹوبی۔ میں نے محسوس کیا کہ کتے محبت کے بھوکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح مصطفےٰ ان سے کھچا کھچا رہا۔ نمازی ہونے کے باوجود میں کتوں کو تھپکے اور پچکارے بغیر نہ رہ سکی۔ انہیں گیرج میں جگہ ملی تھی۔ میں اس بارے میں فکر مند رہتی کہ گیرج میں ان پر جانے کیا گزر رہی ہو گی۔ کبھی کبھار آدھی رات گئے ایک پرانا فلوکاتی (ہاتھ کا بنا ہوا یونانی کمبل) اٹھا کر نکل پڑتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ انہیں گرم رکھ سکے گا۔ بالآخر اپنی بے خوابی کا علاج کرنے کی غرض سے میں نے ان کے لیے ایک کوٹل بنوا دیا۔

برونو کا ایک پلا تھا۔ میں اسے "ڈمبو" کہتی کیوں کہ وہ یوں لگتا جیسے آس پاس کے ماحول پر کوئی دھبا پڑا ہوا ہو۔ میں اسے انٹرنس ہال میں ایک پٹاری میں رکھتی۔ یہ ننھا سا جانور جاگیر پر اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ ایک روز بھٹک کر وہ سڑک پر جا نکلا۔ وہاں ایک کار نے اسے ٹکر مار دی اور وہ لنگڑاتا ہوا گھر لوٹا۔ مصطفےٰ چاہتا تھا کہ اس کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ میں نے مصطفےٰ کی تجویز ویٹو کر دی۔ ہم اسے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد ضروری دیکھ بھال میں کرتی رہی۔

مصطفےٰ کو ایسے کتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو۔ وہ چاہتا

تھا کہ اس کے پالتو جانور ہر لحاظ سے بے عیب ہوں۔ اس نے بیچارے پلے سے بے رخی برتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے کسی اور کے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جب ننھا ڈمبو اپنے نئے مالک کے ساتھ کار میں رخصت ہوا تو ہم سب نے بچشم نم اسے الوداع کہا۔

مصطفےٰ جب بھی دیکھتا کہ میں کتوں یا پرندوں کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہوں تو اس کے چہرے پر حیرانی چھا جاتی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ اسے کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا تھا کہ جانور بھی کسی طرح کے رحم دلانہ سلوک کے مستحق ہیں۔ اس کی نظر میں کتے تو خالصتاً ایسی مخلوق تھے جس سے صرف کام لیا جاتا ہے۔ اور ان کا فرض بس اتنا تھا کہ مالک کا حکم پوری وفا داری سے بجا لایا کریں۔

اس کے بعد اس نے مجھے ایک واقعہ سنایا جسے یاد کر کے میرے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مصطفےٰ کی جوانی کے دن تھے۔ بظاہر وہ تیتر کا شکار کھیلنے نکلا تھا۔ شکار اٹھا کر لانے والے ایک کتے کو بھیجا گیا کہ وہ ایک مرے ہوئے پرندے کو اٹھا لائے اور اپنے آقا کے قدموں میں ڈال دے۔ اس بار کتے کے دل میں آئی کہ کچھ کھلنڈرا پن، تھوڑی سی دل لگی کرنی چاہیے۔ وہ مردہ پرندے کو جبڑوں میں دبا کر چمپت ہو گیا۔ مصطفےٰ غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے اپنے گرگوں کو نافرمان کتے کے تعاقب میں روانہ کیا۔ "اسے ڈھونڈو اور پکڑ کر گاؤں لے آؤ۔" وہ دھول اڑاتا ہوا کار میں رخصت ہوا۔ لگتا تھا جیسے اس کا سارا غصہ دائیں پاؤں میں سما گیا ہے جس سے وہ ایکسلریٹر کو، زور زور دبا کر، سزا دے رہا ہے۔

گرگوں نے کتے کو ڈھونڈ نکالا اور کچے راستوں پر گھسیٹتے ہوئے گاؤں لے آئے۔ لمبے تعاقب کے بعد کتا پیاس کے مارے بے حال تھا۔ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ منہ کے گرد سفید جھاگ کی جھالر تنی تھی اور لعاب کے چند قطرے زبان سے پھسل کر نیچے گر رہے تھے۔ اس پر خوف طاری تھا۔ لگتا تھا کہ اسے پتہ چل گیا ہے کہ کیا ہولناک عذاب اس کا منتظر ہے۔ مصطفےٰ باہر آیا۔ آگ بگولا بنا ہوا۔ کتے کو گھسیٹ کر سامنے لایا گیا۔ کتے نے اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے پھیلا دیں اور خود کو پیچھے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ سزا سے بچنے کے لیے وہ آخری بار رہا سہا زور لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈر کے مارے باہر ابل آئی تھیں۔ لیکن بہ ہر گز، اور ہرگز اپنی الگ ہیبت رکھتا تھا۔ اسے کھینچ کر وہاں لایا گیا جہاں مصطفےٰ کھڑا تھا۔ کتے کو زبردستی نیچے بٹھا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے حکم دیا کہ اس کی چاروں ٹانگیں ملا کر باندھ دی جائیں۔ کتے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ رحم کا طالب ہوا۔ اپنے مالک کی طرف نظر کی، ملتجیانہ انداز میں۔ اپنے کیے پر تقریباً شرمسار ہو کر۔ مصطفےٰ کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہ دے سکا کہ سامنے سرکشی کی ایک علامت ہے۔ مصطفےٰ کو ایک ہی

قانون کا پتہ تھا اور اسی کے مطابق سزا دینا چاہتا تھا اور وہ قانون تھا: تشدد۔

اس نے حکم دیا کہ کتے کو کوڑے اور ڈنڈے لگائے جائیں۔ گرگے زمین پر چت پڑے کتے کے گرد جمع ہو گئے، جو یہ سمجھ کر کہ اس پر برا وقت آیا ہی چاہتا ہے رو اور چلا رہا تھا۔ گرگوں کے ہاتھ میں چمڑے کے کوڑے اور بانس تھے۔ کتے کے جسم پر تابڑ توڑ برسنے شروع ہوئے۔ وہ کرب کے مارے تڑپتا رہا۔ اس کی چیخوں سے کوٹ اور کے ارد گرد کا سکوت چھلنی ہو گیا۔ اس کا جسم شاید ذہن کی منت کرتا رہا کہ ہار مان لے۔ ذہن نے ہار مان کر نہ دی۔ کم از کم پینتالیس منٹ تک تو نہیں مانی۔ آخر کار کتے کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور اسے ہوش نہ رہا۔

مصطفےٰ کو فوراً کتے پر ترس آ گیا۔ اس نے اپنے ایک گرگے سے کہا کہ کتے کو لے جائے اور اس کی دوا دارو کرے۔ کتے کی طرف سے منہ پھیر کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کے اندر چلا گیا۔ اب اچانک وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔

یہ واقعہ سن کر مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ مصطفےٰ کے غیر معقول تشدد کا نشانہ کوئی بے زبان جانور بھی بن سکتا ہے جس کے لیے اپنی صفائی میں کچھ کہنا، کوئی بہانہ تراشنا یا اپنی حرکتوں کا کوئی عذر پیش کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ مصطفےٰ کی نظر میں کتے کا رویہ نافرمانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ کھر سے ٹکر لینے کی جرات کی تھی۔ اگر کوئی کتا بھی خاک سے سر اٹھاتا تو اسے فضا سے بغاوت کی بو آنے لگتی۔ مصطفےٰ صرف خوف کے زور پر حکومت کر سکتا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس شخص میں تو کتے تک کی نافرمانی برداشت کرنے کی تاب نہیں، ہم تو انسان ہیں۔ ہمیں تک اپنے اضطراری افعال اور عقل و فہم کے باوجود اس کے احکام کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ ہم بھی نہ تو اس سے یہ پوچھ سکتے تھے کہ ہمیں کیوں سزا دی جا رہی ہے نہ کوئی عذر پیش کر سکتے تھے۔ اس کی بیہودہ من مانیوں نے انسانوں اور حیوانوں دونوں کو یکساں طور پر اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔

میرے لیے یہ سارا واقعہ مصطفےٰ کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک اور سفر کے مانند تھا۔ کیا مصطفےٰ کھر سچ مچ یہ سمجھتا تھا کہ کتے نے جان بوجھ کر اس کی بے عزتی کی تھی؟ کیا اس کا واقعی یہ خیال تھا کہ کتا سمجھ سکتا تھا کہ اسے اتنے بہیمانہ انداز میں کیوں پیٹا جا رہا ہے؟ کیا اس شخص کے ذہن میں اس حقیقت کا کوئی تصور نہیں کہ سزا ہمیشہ جرم کے تناسب سے ملنی چاہیے؟ اور کتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ سمجھ سکتا تھا کہ اسے بے دردی سے کیوں مارا جا رہا ہے؟ یا اس کے چھوٹے سے ذہن نے بس اتنا سمجھا کہ یہ جفا کار آمروں کے بہیمانہ رویے کا ایک نمونہ ہے؟ اگر وہ معافی مانگ سکتا تو کیا معافی مانگتا؟ لیکن کس بات کی معافی؟ زندگی تو اپنی مرضی پر چلنے کا نام ہے۔ کیا اسے اپنی مرضی

کی زندگی گزارنے سے باز رکھا جا سکتا تھا۔؟ میں بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ کتے کا ذہن جن خیالات کی آماج گاہ بنا رہا ہو گا ان میں اور میرے خیالات میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اگلے روز میں نے اس واقعے کے حوالے سے مصطفےٰ سے بات کی۔ یہ واقعہ سن کر میری نیند حرام ہو گئی تھی۔ "مصطفےٰ، پتہ بھی ہے، میرے خیال میں تمھارے مسائل اور مصیبتیں اس بدسلوکی کا نتیجہ ہیں جو تم نے کتے کے ساتھ کی تھی۔ میں نے رات خواب میں دیکھا کہ کتے نے تمہیں بد دعا دی ہے۔ سوچو تو سہی۔ تمہیں کتے کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس سے زیادہ ہولناک بات سوچنے میں آ سکتی ہے کیا؟ خدا تم سے ناراض ہے۔"
اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہو گئے۔

چند روز بعد میرے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے کا وقت پھر آ پہنچا اور اس نے جھینپتے ہوئے بتایا کہ میرے کہے کا اس پر واقعی اثر ہوا ہے۔ "مجھے راتوں کو وہ کتا روتا اور بھونکتا سنائی دیتا ہے۔ بڑی خوفناک بھوں بھوں ہے۔ ہولناک اور روح فرسا عو عو ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ جانماز پر بیٹھے بیٹھے آخر میں ہوتا یہ ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہوں کہ اللہ مجھے بخش دے۔ آخر میں ہوتا یہ ہے کہ میں گڑگڑا گڑگڑا کر کتے سے معافی مانگنے لگتا ہوں۔"

میں حیران ہوں کہ اس کتے نے مصطفےٰ کو معاف کیا کہ نہیں۔

بلال کہیں سے مصطفےٰ کے لیے کبوتروں کا جوڑا لے آیا۔ مصطفےٰ کو وہ خوبصورت معلوم ہوئے اور انہیں ایک چھوٹی سی کابک میں رکھ لیا گیا۔ صاف ظاہر ہے مصطفےٰ کو معلوم نہ تھا کہ کبوتروں کی نسل تیزی سے بڑھتی ہے۔ جاڑے آنے تک ہمارے پاس تیرہ کبوتر ہو گئے۔ وہ رات کو مکان کی چھت پر بسیرا کرتے۔ احساس جرم کی ٹیسوں سے رات کو میری آنکھ کھل کھل جاتی۔ برف پڑتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ کبوتر سردی سے اکڑ کر مر جائیں گے۔ پریشان ہو کر میں مصطفےٰ کو اٹھا دیتی تنگ آ کر وہ گھر کے عملے کو جگاتا اور ایک زبردست تماشا شروع ہو جاتا۔

وہ اور حاجی، ہمارا ملازم، ٹارچ سے لیس ہو کر باہر ٹھنڈ میں نکل جاتے۔ میں باغ میں لگی ہوئی سرچ لائٹیں روشن کر دیتی۔ مصطفےٰ کبوتروں کو تلاش کرتا۔ جب ٹھیک ٹھیک پتہ چل جاتا کہ وہ کہاں پہ ہیں۔ تو میں روشنیاں بجھا دیتی اور وہ کسی شکرے کی طرح اندھیرے میں ان کو دبوچ لیتا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر ہاتھ تھوڑا سا بھی ادھر ادھر پڑا تو کبوتر اڑ جائے گا اور اندھوں کی طرح ہر طرف بھٹکتا پھرے گا۔ اس کا نشانہ بالکل ٹھیک ہونا چاہیے۔ جب پھسلواں ٹائلوں پر کھیلا جانے والا یہ خطرناک کھیل ختم ہو جاتا تو وہ کبوتروں کو گھر میں لا کر

غسل خانے کے ٹب میں چھوڑ دیتا۔ صبح ہونے پر کبوتروں کو غسل خانے سے رہائی ملتی۔ یہ روز کا معمول بن گیا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے ان کے لیے ڈربی کا بک نہ بنوادی۔ نہ تو میں یہ چاہتی تھی کہ کبوتر سردی سے مرجائیں۔ نہ یہ چاہتی تھی کہ ان کا پیچھا کرتے کرتے میرا میاں ٹانگوں سے پھسل کر نیچے آ گرے اور اپنی گردن تڑوا بیٹھے۔

ہم نے ہیزل میر میں بڑی ہوش ربا باربی کیو دعوتیں دیں۔ ان میں سے بہت سی دعوتوں میں سو سے زیادہ افراد کو مدعو کیا گیا۔ ہم باہر لان میں شامیانے لگوا دیتے اور کوئلوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے گڑھوں پر کھانا پکتا رہتا۔ مصطفےٰ کو بڑا زبردست بکاول سمجھا جانے لگا تھا۔ لوگ محض اس کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کی خاطر ہیزل میر کھچے چلے آتے تھے۔

ایک بار مصطفےٰ باربی کیو ضیافت کے لیے پچاس زندہ چوزے خرید لایا۔ وہ انہیں کو پڑھ پڑھ کر یکے بعد دیگرے ذبح کرتا گیا۔ وہ گردن کی رگ کاٹتا اور چوزے کو اٹھا کر دور پھینک دیتا۔ چوزہ انتہائی کرب کی حالت میں ادھر اُدھر اچھلتا اور مرنے سے پہلے بڑے ہولناک طریقے سے جھرجھری لیتا۔ میں مصطفےٰ سے کہتی رہی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے چوزوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ مصطفےٰ قہقہہ لگا کر مجھے سمجھاتا کہ مرتے دم چوزے کی آخری جھرجھری اس بات کی دلیل ہے کہ روح جسم کو خالی کر رہی ہے۔ میں نے چکن کھانا چھوڑ دیا۔

ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آتے جنہیں سوکھنے سے پہلے ٹاکیوں سے صاف کرنا پڑتا۔ پاتیو پر کسی قصاب خانے کا گمان ہوتا۔ وقت کم ہوتا اور کام زیادہ۔ ہم بچے کھچے پر اٹھانے، چپچپا خون صاف کرنے اور گوشت بنانے میں جتے رہتے تاکہ بروقت فارغ ہو جائیں۔ یہ تعین مصطفےٰ کرتا کہ کون سا کام کس طرح اور کب ہونا ہے اور کس کے ذمے ہو گا۔ ان دعوتوں میں اس کے پکائے ہوئے کھانوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ صرف کام کی نگرانی کرتا۔ ہر چیز کا انتظام مجھے کرنا پڑتا۔ کشن پھلا کر رکھنے، پھول سجانے، اچھی نظر کے لیے سنگھار کرنا اور دل موہ لینے والا انداز اپنانا۔ یہ سب میری ذمے داری تھی۔ مہمانوں کے آتے آتے میں تھک کر چور ہو چکی ہوتی۔ اپنی پوری طاقت کو بروئے کار لا کر میں مہمانوں کی ریل پیل میں ماری ماری پھرتی، ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی۔ جب دعوت ختم ہوتی تو ہمیں سونے کے کپڑے پہننا بھی دوبھر معلوم ہونے لگتا۔ ہم بستر پر جا گرتے اور صبح تک غافل سوتے رہتے۔ خدا کا شکر بجا لاتے کہ مہمان رخصت ہوئے۔ دعوتوں کے اس دور کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی۔ مہینے میں تین تین بار دعوتیں ہونے لگیں۔ مصطفےٰ کا یوگا اس کے بہت کام آیا۔ وہ لامحدود توانائی کا مالک تھا۔

اب جب کہ مارپٹائی اور لڑائی جھگڑے کچھ کچھ قصہ پارینہ بن گئے تھے۔ تو وہ اپنی توانائی ان مسل شغلوں میں صرف کر رہا تھا۔

مصطفےٰ نامعقولیت سے اب بھی باز نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ بعض حرکتیں صریحاً صرف مجھے کھجانے یا میرے توازن کو بگاڑنے کے لیے کرتا تھا۔ ایک شام ہم نے دلیپ کمار اور ان کی بیگم سائرہ کو ڈنر پر مدعو کیا۔ مصطفےٰ بالوں کو رنگ کر رہا تھا۔ میں نے سرسری طور پر اس سے کہا کہ وہ میرے سفید تولیے استعمال نہ کرے۔ میں نے برتنے کے لیے اسے رنگین تولیا لا دیا۔ اس نے مجھ پر نظر ڈالی، سفید تولیہ اٹھایا اور اس سے کام لینے لگا۔ وہ مجھے طیش دلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی۔ "مصطفےٰ، تم جان بوجھ کر یہ سب کچھ کر رہے ہو۔ ہمارا پورا دن بغیر کسی جھگڑے کے گزر گیا ہے۔ اب تمہیں جھگڑا کرنے کی سوجھی ہے۔ ہمارے مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے پریشان مت کرو۔" وہاں ایک جگ پڑا تھا۔ مصطفےٰ نے اسے اٹھا کر میری طرف پھینکا۔ میرے کندھے میں چوٹ آئی۔ میں غسل خانے سے نکل آئی اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے دروازے کو دھڑ دھڑایا اور دھمکی دی کہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میں اسے نظر انداز کر کے نیچے چلی گئی اور اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ مصطفےٰ کہاں ہے۔ میں نے کوئی بہانہ بنا دیا۔ میں انہیں یہ بتانے سے تو رہی کہ شیر پنجاب اوپر غسل خانے میں بند ہے۔

بیس منٹ بعد میں اوپر گئی۔ اس نے اپنے طیش پر اچھی طرح قابو پا لیا تھا لیکن اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ تھا۔ "اگر تم ایک بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صرف اتنا سمجھ سکو کہ میں یہاں تمہاری فضولیات برداشت کرنے کے لیے نہیں ہوں تو میں دروازہ کھول دوں گی۔" "ٹھیک ہے۔ مجھے باہر آنے دو۔" میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بنت تمتماتا ہوا باہر آیا۔ "ذرا یہ لوگ چلے جائیں۔ میں تمہیں مزہ چکھا کر چھوڑوں گا۔" ہم نیچے آئے اور ہم نے جس پائے کی اداکاری کی اس پر دلیپ کو بھی فخر ہوتا۔ دلیپ اور سائرہ بلاشبہ یہ تاثر لے کر رخصت ہوئے کہ ہم جیسے ایک دوسرے سے راضی خوشی میاں بیوی ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ انہیں کیا خبر کہ ان کا میزبان، بڑی نفاست کے ساتھ چھری سے روسٹ کے ٹکڑے کرتے وقت، قتل کی نیت باندھ رہا تھا۔

مصطفےٰ نے مجھ سے اوپر چلنے کو کہا لیکن میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ سزا پانے کے لیے بالائی منزل کا رخ کروں۔ میں نے نچلی منزل کے ایک کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ اپنے شکار کا دس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد وہ نیچے آیا۔ "تہمینہ، دروازہ کھول دو۔ تمہارا یہ رویہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں تمہیں ٹھیک بنا دوں گا۔" "مجھے پتہ ہے

کہ کمرے کے باہر ایک بیمار، جنونی آدمی موجود ہے۔ کیا تم واقعی یہ توقع رکھتے ہو کہ میں نہتی باہر آ کر خود کو اس کے حوالے کر دوں گی؟"

وہاں کھڑے کھڑے ہم عورتوں کے حقوق کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ ہمارے درمیان حائل دروازہ میری حفاظت کا ضامن تھا۔ چونکہ میں خود کو نسبتاً زیادہ محفوظ محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے بہت کھل کر باتیں کیں۔ آخر کار اسے صورت حال کی مضحکیت کا احساس ہو گیا۔ اس نے سپر ڈال دی۔ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی ہوں۔ شیر کو خود اسی کے بھٹ میں ناچ نچایا جا رہا تھا۔

بلی چوہے کا یہ کھیل جاری رہا۔ فرق یہ تھا کہ ہماری یہ چھیڑ چھاڑ ٹام اور جیری کے تعلقات سے زیادہ مشابہ تھی۔ نئے سرے سے زور میں آئے جیری کے ہاتھوں لیم ٹیم ٹام کی درگت بن رہی تھی۔ وہ مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اشتعال میں آنے سے انکار کر دیا۔ اس کی بدمزاجی غائب غلہ ہو گئی کیونکہ جس وجہ سے وہ بھاؤ کھاتا تھا میں نے اسے باقی ہی نہ رہنے دیا تھا۔ اسے میری عاجزانہ اطاعت گزاری پر غصہ آتا تھا۔

مصطفیٰ میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اسے محسوس کرنا قریب قریب ناممکن ہی سہی لیکن بہر طور پر یہ تھی تو تبدیلی۔ وہ اپنے آپ کو مجھ سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرنے لگا اور اس نے مجھ میں سیاسی سوجھ بوجھ ابھارنے کی کوشش شروع کر دی۔ میں بڑے شوق سے اس کی ان باتوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ ایک ایسا میدان عمل تھا جو واقعی مجھے بہت بھاتا تھا۔

بیرل میر ہمارے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ مصطفیٰ روزانہ سو صفحے اس طرح پڑھتا جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہو۔ میں کتابوں کی دکانوں کا جستہ جستہ جائزہ لیتی اور اس کے لیے وہ کتابیں لے آتی جو میرے خیال میں اسے پڑھنی چاہیے تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کن موضوعات سے دلچسپی ہے اور چاہتی تھی کہ جلاوطنی کے دوران میں وہ جتنی زیادہ باتیں اخذ کر سکتا ہے کر لے۔ وہ دراصل میرے خیال میں وطن واپسی سے پہلے غور وفکر اور تیاری کے دن تھے۔ مصطفیٰ صورت حال کا تجزیہ کرتا۔ وہ اکثر جی بھر کر اپنی کوتاہیوں کو آپ تنقید کا نشانہ بناتا اور ہمارے جاری سیاسی بحران کی وجوہ کا ژرف بینی سے جائزہ لیتا۔ میں متجسس رہتی۔ میں نے اس سے سیکھا۔ سیاست کے میدان میں اس کی آرا پر صاد کیا۔

جب ہم دوستوں اور حلیفوں کے درمیان ہوتے تو وہ پورا اعتماد ظاہر کرتا کہ اس کی بیوی نہ صرف اس کے مقاصد پر یقین رکھتی ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کا دفاع کرے گی۔ میں اپنی سیاسی زندگی کو اپنی نجی زندگی سے الگ تھلگ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

جن باتوں پر اسے پختہ یقین تھا میں بھی ان کی حمایت کرنے پر اتر آئی اور اس کے کیس کے حق میں مصطفیٰ ہی کی طرح یقین اور شدت کے ساتھ دلائل پیش کرنے لگی۔ میرے بہت سے دوستوں کو میری یہ کایا پلٹ یاد ہے۔ پہلے پہل انہوں نے مجھے ایک دبی دبی گھریلو خاتون کے روپ میں دیکھا جو بیشتر وقت چپ بیٹھی رہتی تھی اور پھر میں ان کے سامنے ایک جوشیلی اور باحوصلہ عورت بن کر آئی جس کی گفتگو میں "مصطفیٰ نے کہا" سے شروع ہونے والے جملے بار بار سننے کو ملتے۔ میں اس کا سیاسی دم چھلا بن گئی تھی۔

بیوی کی ٹھکائی کرنے کا اضطرار اب بھی اس پر کبھی کبھار غالب آ جاتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ وہ کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آنے میں اس لیے ذرا سی دیر ہو گئی کہ اس کے ٹریول ایجنٹ کا فون آ گیا تھا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ مصطفیٰ کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ ادھر مصطفیٰ بیٹھا پنچپنا رہا تھا۔ غصے کے مارے وہ پھٹ ہی پڑا۔ وہ اور کسی کا انتظار کرے۔ یہ اسے سخت ناگوار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ذرا سکون سے کام لو۔ ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے۔" اس نے الٹے ہاتھ سے مجھے طمانچہ مارا۔ میری آنکھ کے گرد فوراً نیل پڑ گیا۔ جس چھوٹی سی سیر پر ہم نکلنے والے تھے وہ دھری کی دھری رہ گئی۔

ہم اندر چلے آئے۔ مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ نیل چھپانے کے لیے کالی عینک لگائی جائے۔ میں نے عینک پہن لی۔ اس شام ہمارے کئی جاننے والے ملنے آئے تھے۔ علی کھود اور بلو تو میرے لیے اپنے گھر والوں کی طرح تھے۔ ان کے علاوہ رفیع کھیلو اور مسز جنوئے بھی تھیں۔ میں ڈنر میں شریک ہونے پہنچی تو کالی عینک کی وجہ سے بے تکی اور کچھ ہیبت ناک سی نظر آ رہی تھی۔ مصطفیٰ نروس تھا۔ اسے اب پتہ نہ چلتا تھا کہ میں اگلا قدم کیا اٹھاؤں گی۔ میں نے بیٹھنے کے بعد بڑے اطمینان سے کالی عینک اتار دی۔ میں چاہتی تھی کہ ایک بار مصطفیٰ بھی اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ میں چاہتی تھی کہ اس بار رسوائی میرے حصے میں نہ آئے۔ چھپ چھپ کر بیوی کو مارنے پیٹنے والے اس شخص کو بے نقاب کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

سب ہک دک رہ گئے۔ انہوں نے سٹپٹا کر مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "مصطفیٰ نے مجھے مارا" گلاس نیچے رکھ دیے گئے۔ حاضرین گلا صاف کرنے کی آوازیں نکالنے اور اپنی اپنی نشستوں پر کسمسانے لگے۔ مصطفیٰ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے بہانے لانے شروع کیے۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میرا رویہ نامعقول ہے، میں گستاخ ہوں۔ اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی دلیلیں دینے لگا۔ اتنے مشکل حالات کا سامنا ہے اور میں نے غیر معقول رویہ اپنا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتی ہوں۔ اس کے کہے پر کسی کو یقین نہ آیا۔

جو نقصان پہنچنا تھا۔ پہنچ گیا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کسی سے آنکھیں کیسے چار کرے۔

رات کو بعد میں وہ بیڈروم میں سے دو بدو ہوا۔ میرا رویہ وقار سے گرا ہوا ٹھہرایا گیا کہ میں دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے ڈھونگ رچاتی ہوں۔ ایسی عورت قرار دیا گیا جو بے شرم ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ آج تمہاری تذلیل ہوئی ہے۔ میری نہیں۔ تمہیں غصہ آنا ہی چاہیے کیوں کہ تمہیں اپنی حرکت کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑا۔ اگلی بار جب تم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس کی وجہ سے بعد میں تمہیں خفت اٹھانی پڑے تو پہلے سے یہ اطمینان کر لینا کہ تم رسوائی کی تاب لا سکو گے۔ اب میں تمہیں تحفظ نہیں دیا کروں گی۔ اگر میرے چہرے پر نیل پڑے ہوں گے یا مار کھا کھا کر میری صورت بگڑ گئی ہو گی تو میں اپنا منہ چھپاؤں گی نہیں۔ میں چاہوں گی کہ دوسروں کو میں ویسی ہی نظر آؤں جیسی کہ ہوں۔ مجھے منافق بن کر جینا منظور نہیں۔"

یہ صاف گوئی کا دور تھا۔ میرا ستارہ عروج پر تھا۔ میرے اعتماد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ مصطفےٰ نے میرے بڑھتے ہوئے اعتماد پر قدغن لگانی چاہی مگر ناکام رہا۔ ایک دن مدتوں بعد امی کا فون آیا۔ وہ مجھ سے فوراً ملنا چاہتی تھیں۔ ڈھائی سال کے وقفے کے بعد ان کے اس طرح اچانک نمودار ہونے کے بارے میں میرے جذبات ملے جلے تھے۔ میں نے مصطفےٰ سے معلوم کیا کہ کیا میں امی سے ملنے چلی جاؤں۔ مصطفےٰ نے اجازت دے دی۔

سب سے پہلے عدیلہ نے میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھ سے گلے ملنا چاہا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بہت مسکین بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پچھلی تمام حرکتوں کی مجھ سے معافی مانگی۔ مجھے بتایا کہ ضمیر پر بوجھ رہنے کی وجہ سے اسے بے خوابی کا مرض مستقل طور پر لاحق ہو چکا ہے۔ کہنے لگی کہ اب اس کی شادی کے پیغام آ رہے ہیں۔ لیکن جب تک میں ماضی میں ہونے والی تلخیوں کے حوالے سے اسے معاف نہیں کروں گی۔ وہ شادی نہیں کر سکے گی۔ "تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں شادی کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ میں نے تمہیں اتنا دکھ جو دیا ہے۔ قدرت مجھ سے انتقام لے کر رہے گی۔ مہربانی کر کے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" اس نے اپنے اخلاق سوز رویے کا ذمے دار مصطفےٰ کو ٹھہرانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے سامنے میرے شوہر کی برائی کبھی نہ کرنا۔ اگر تمہیں اپنے رویے کے بارے میں کچھ کہنا ہے تو میں سن لوں گی۔

اسے بیچ میں مت لاؤ۔" جب بھی کوئی مصطفےٰ کو برا بھلا کہتا تو میں، جیسے کسی اندرونی دباؤ سے مغلوب ہو کر، اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی۔ شخصیت کا یہ خاصہ مجھے امی سے ورثے میں ملا تھا۔

میں نے عدیلہ کو تہ دل سے معاف کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں مصطفےٰ کو معاف کرنے کے بعد اس کے ساتھ رہ سکتی ہوں تو پھر شریک جرم کے خلاف رنجش پالنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور مجھے یوں لگتا تھا کہ اب اپنی ازدواجی زندگی پوری طرح میری گرفت میں ہے۔

ذہنی طور پر بالکل بے حال ہو کر میں گھر لوٹی۔ عدیلہ کے ساتھ جو بات چیت ہوئی تھی وہ میں نے مصطفےٰ کو سنائی۔ وہ میری خاطر بہت خوش ہوا اور بظاہر اس بات پر بہت مطمئن نظر آیا کہ عدیلہ والا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔

میرے بچوں کو دوبارہ پتہ چلا کہ ان کے نانا نانی بھی ہیں۔ اپنے نواسے، علی کو انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے والد کی توجہ اور شفقت کا مرکز بن گیا۔ والدین کے گھر جانا ہمیشہ خوشگوار تجربہ ثابت ہوتا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے وہاں جانے کا موقع بار بار ملے مگر میری یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ والدین سے میرا میل جول مصطفےٰ کو برا لگتا۔ وہ کہا کرتا کہ وہ مجھے اپنی اور صرف اپنی سمجھتا ہے اور اس تصرف میں کسی اور کی شرکت اسے گوارا نہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ ساری جلن صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ میرے والدین کو اب یہ تک منظور نہ تھا کہ اس کا سایہ بھی ان کی دہلیز پر پڑے۔ مصطفےٰ مجھے ان کے گھر کے باہر اتار دیتا اور مقررہ وقت پر آ کر مجھے باہر ہی سے لے آتا۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ جب بھی مجھے اس طرح چھوڑ کر آنے اور لینے جانے کا موقع آتا تو اس پر چڑچڑاپن طاری ہو جاتا۔ میں محسوس کرتی کہ جو سلوک اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ اسی کا مستحق ہے۔

کشیدگی پھر سر اٹھانے لگی۔ مصطفےٰ اب زیادہ زود رنج ہو گیا اور ہر وقت مجھ سے لڑنے جھگڑنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا نہایت احتیاط سے استوار کیا ہوا مگر بہت نازک "جیو اور جینے دو" کے فلسفے پر قائم باہمی رشتہ سرد جنگ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس خیال سے میرا دل بیٹھا جاتا تھا کہ جنگ از سر نو چھڑ گئی تو کیا ہو گا۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے میں والدین کے گھر جانے سے احتراز کرنے لگی۔ میری ترجیحات واضح تھیں۔ مجھے اپنی شادی برقرار رکھنی تھی۔ اس تعلق کو قائم رکھنے کی خاطر میں نے اتنا دکھ درد سہا تھا اتنے سمجھوتے کیے تھے کہ اسے توڑنا، خصوصاً جب کہ حالات سدھر رہے ہوں، میرے مفاد میں نہ تھا۔ یا میں نے یہی سمجھ رکھا تھا۔

جتوئی صاحب کی بیٹی، شیریں، کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ویلنگٹن ہسپتال میں تھی۔ بچے کی پیدائش سے پہلے مصطفےٰ اور میں اس کی خیریت معلوم کرنے گئے۔ وہاں بہت سے دوست اور عزیز و اقارب موجود تھے۔ شیریں کی والدہ نے مجھے پہلی بار دیکھا۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور مصطفےٰ سے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہیں واقعی بہت اچھی بیوی مل گئی ہے۔ مجھے امید ہے تم اس کی قدر کرو گے۔"

خود پر بڑی دردمندی اور خلوص طاری کر کے مصطفےٰ نے ان سب لوگوں کے سامنے میرا ہاتھ تھام لیا اور خطیبانہ لہجے میں اعلان کیا۔ "میں تہمینہ کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ میرے لیے کتنی اہم ہے یا اس نے مجھ سے کتنا اچھا سلوک کیا ہے۔"

مصطفےٰ مجھے ہسپتال میں شیریں کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ اس سہ پہر کو شیریں نے میرے گھر سے کوئی چیز منگانی چاہی۔ چنانچہ میں نے گھر فون کیا کہ ملازم کو بتا دوں۔ فون مصروف ملتا رہا۔ میں نے سوچا کہ فون کرنا بیکار ہے۔ اسی شام چھ بجے شیریں کو دردِ زہ شروع ہوا۔ میری امی امریکہ گئی ہوئی تھیں۔ توقع تھی کہ عدیلہ ویک اینڈ پر اپنے بورڈنگ ہاؤس سے گھر آ جائے گی۔ یہ پتہ کرنے کے لیے کہ وہ گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں میں نے ہسپتال سے فون کیا۔ اسے یہ بھی بتانا تھا کہ امی نے ہدایت کی ہے کہ وہ اگلی صبح کی پرواز سے امریکہ روانہ ہو جائے۔ مصطفےٰ واپس آ چکا تھا۔ وہ ہم سب کے ساتھ کمرے میں موجود تھا جہاں جام صادق، مرتضےٰ جتوئی، شیریں کا شوہر، تصویر اور دوسرے لوگ جمع تھے۔
عدیلہ نے فون اٹھایا اور کوئی تمہید باندھے بغیر اصل موضوع چھیڑ دیا۔ "تہمینہ، تمہارا میاں پوری سہ پہر مجھ سے فون پر بات کرتا رہا ہے۔ اس نے میری منت کی کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ بتایا کہ اس جیسا مرد مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس بات پر اڑا رہا کہ میری زندگی میں چاہے کوئی بھی آ جائے میں اسے کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔ میں نے کہا کہ تہمینہ تو ہمیشہ یہی کہتی رہتی ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کہنے لگا کہ تمہاری بہن تو بالکل بیوقوف ہے۔ جب میں اس سے کہتا ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے تو وہ میرے کہے پر یقین لے آتی ہے۔ اس نے منت سماجت کر کے کہا کہ میں اس سے مل تو لوں۔ کہنے لگا کہ میں آ رہا ہوں اور کار تمہارے دروازے کے باہر پارک کروں گا۔ وہ میری صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن پر میں اور صرف میں سوار ہوں۔ مجھے بتانے لگا کہ میرے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔ میں نے کہا کہ عمر کے لحاظ سے تو تم میرے والد کے برابر ہو۔ کہنے لگا کہ میرے والد نے جب شادی کی تھی تو وہ ساٹھ برس کے تھے اور امی سولہ سال کی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میری باتوں پر [illegible] نہیں آئے گا۔ اس لیے

میں نے گواہوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔ میری سہیلی کلاڈیا یہاں ہے۔ وہ ہماری باتیں ایکس ٹینشن پر سنتی رہی ہے۔ ہمارے باورچی، رحمان، نے بھی ہماری گفتگو سنی ہے ان سے پوچھ لو۔"

مجھے یقین آ گیا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ عدیلہ سے بات کرتے وقت میں مصطفےٰ کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ صاف صاف قصور وار تھا۔ اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا تھا: میں مجرم ہوں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں نے فون واپس رکھ دیا۔ مجھ پر مکمل سکتہ طاری ہو گیا۔ میں جان گئی کہ میری جو نئے سرے سے تعمیر کی گئی تھی تو صرف اس لی کہ مجھے پھر سے ڈھایا جا سکے۔ میں نے اس شخص پر جتنی بار بھی تکیہ کیا اس نے ہر بار مجھے دھوکا دیا۔

میں کمرے سے باہر چلی آئی اور ویٹنگ روم میں، گویا میرے دکھ کا تمسخر اڑانے کے لیے، جشن کا سماں تھا۔ شیریں کے لڑکا ہوا تھا۔ کیا ظلم تھا کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی وقت میں پیش آئے تھے۔ میں زاروقطار رونے لگی۔ مجھے اپنے پر قابو نہ رہا۔ میرے ساتھ کیا مذاق ہو رہا تھا۔ اس احساس نے پہلے کبھی میرے رگ و پے میں اس طرح سرایت نہ کیا تھا۔ میں شرمندہ بھی ہو رہی تھی۔ اور اس کے باوجود خود کو دوسروں کی نظر میں تماشا بھی بنائے چلی جا رہی تھی۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہاں سے بھاگ ہی جاتی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پرلے درجے کی احمق ہوں۔
جتوئی صاحب کی بیگم مجھے بار بار سینے سے لگا کر پوچھتی رہیں کہ بات کیا ہے۔ میں اپنی نامرادی کا ذکر چھیڑ کر ان کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ مجھ جیسی عورت کا وہاں کیا کام تھا جس کی شادی غیر نارمل اور میاں نفسیاتی مریض۔ مجھ پر یہ عالم تھا جیسے میں نے مستقل طور پر اپنے اندر کسی جنونی کیفیت کو گھونٹ کر رکھا ہوا ہو۔ چشمِ نم کے ساتھ معذرت خواہی کے بعد میں رخصت ہوئی۔ مصطفےٰ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ ہم کار میں بیٹھے اور دل خراش خاموشی میں گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ پھر ایسا بن گیا جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو اور معصوم لہجے میں پوچھنے لگا۔ "کیا ہو گیا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ کیا گڑبڑ ہے؟ تہمینہ، میں تمہاری منت کرتا ہوں مجھے بتاؤ۔ پلیز۔ عدیلہ کا کوئی چکر ہے؟ خدایا۔ وہ پاگل لڑکی۔ کیا اس نے کچھ کہہ دیا ہے؟ اس کی باتوں پر کان مت دھرو۔ وہ یہ ساری باتیں صرف تمہیں پریشان کرنے اور مجھے دکھ دینے کے لیے گھڑتی رہتی ہے۔ اسے تم سے نفرت ہے۔ وہ تمہاری شادی کو برباد کرنے کے درپے ہے۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ وہ تمہیں سزا دینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہماری شادی ختم ہو جائے تاکہ اس کی اپنی انٹی

سیدھی خواہشیں پوری ہو سکیں، تاکہ وہ تمہیں کچھ ثابت کر کے دکھا سکے۔ مہربانی کر کے اس کے کہے پر اعتبار مت کرو۔ اس نے کچھ کہا ہو گا، کہا ہے نا؟ اس نے کیا کہا ہے۔ مجھے بتاؤ"۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

میں سکتے کے عالم میں بستر پر جا لیٹی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رینگ کر کسی کونے کھدرے میں جا گھسوں، رحمِ مادر کی ایسی کی

طرف دوبارہ لوٹ جاؤں۔ میں لاچار اور درماندہ تھی۔ میری زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شیشے کی کرچیوں کی طرح فرش پر بکھری پڑی تھی۔ جب میں نے ان کرچیوں کو چننے کی کوشش کی تو وہ میرے دل، وجان میں کھب کھب گئیں۔ میں چاہتی تھی کہ بس نسیان کے عالم میں چھپ جاؤں، خاک کے اس ذرے کے مانند جو سورج کی شعاع سے چھپتا پھر رہا ہو۔

مصطفےٰ میرے پیچھے پڑا رہا۔ اصرار کرنے لگا کہ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نے تمام روشنیاں بجھا دیں، کمرے کے ایک کونے میں جا دبکی، جنین کے انداز میں منڈکری مار لی اور اس گھپ اندھیرے میں کمرے میں پڑی، آنسو بہاتی رہی۔

صبح کو میں مصطفےٰ کے اضطراب کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ میرے سکون سے خوف زدہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے چھوڑنے والی ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بار میں وہی کروں گی جو کہہ رہی ہوں۔ پہلے تو اس نے اکڑفوں دکھا کر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ پھر مجھے طعنے دینے لگا "کہاں جاؤ گی۔ ، تہمینہ؟ اپنے والد کے پاس؟ وہ تمہیں پچھوڑی ہوئی ہڈی بھی نہیں ڈالیں گے۔"

میں نے طے کر لیا کہ اسے غلط ثابت کر کے رہوں گی۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میں مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ میں اسے چھوڑ جانے کو تھی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر اسے یقین آ گیا کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گی تو وہ یا تو مجھے گھر میں بند کر دے گا یا میرے بچوں کو لے جائے گا۔ میں نے اپنے سکون سے اس کے خدشات کو رفع دفع کر دیا۔ اس نے میرے سکون کا غلط مطلب لیا۔

اس نے جو کچھ ابھی ابھی کہا تھا اس کے لیے مجھ سے معافی طلب کی۔ مجھے گلے لگانا چاہا۔ میں گھن کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ "تہمینہ، تم مکمل عورت ہو۔ تم غیر معمولی ہو۔ تم میں برداشت کا جو مادہ ہے اس کے سامنے میرے گاؤں کی عورتوں کا صبر کچھ نہیں۔ تم نے اتنا کچھ سہا۔ تم نے ان سب باتوں سے نبٹتے ہوئے وقار کا ثبوت دیا۔ تم نے خاموش رہ کر دکھ جھیلے۔ تم نے میری نیک نامی پر حرف نہ آنے دیا۔ تم کمال کی ماں ثابت ہوئی ہو۔ میں نے اس گھر کو اتنی زیادہ مرتبہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ تم نے ہمیشہ اسے نئے سرے

سے بنا ڈالا۔ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا ہی کیوں کہ میں اس ذرا سی شغل کے لیے تمہیں چھوڑ دوں گا؟۔ مجھے پتہ تھا کہ برداشت اور صبر کے بارے میں یہ ساری باتیں میرا جی خوش کرنے کے لیے ہیں۔ ان کی اصلیت کچھ نہیں وہ یہی چاہتا تھا کہ میں پہلے کی طرح دروازے کے آگے بچا پائیدان بنی رہوں۔ میں تھک چکی تھی اور اس بات کے لیے تیار نہیں تھی کہ جوتے رگڑ رگڑ کر گندگی مجھ پر تھوپی جاتی رہے۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اسے آخری بار معاف کر رہی ہوں۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا۔ میں چاہتی بھی یہی تھی کہ اسے میرے کہے پہ یقین آ جائے۔ میری زندگی میں آئندہ خلل نہ ڈالنا۔ اس دفعہ تو میں کسی نہ کسی طرح صورت حال سے نبٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ تم گائیڈ بن کر مجھے سارے جہنم میں پھرا لائے۔ اب مجھ میں نہ تو اتنی جان ہے نہ اتنی قوت ارادی کہ دوبارہ دغا فریب کی غلام گردشوں کے چکر کاٹ سکوں۔" اس نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ مجھے آئندہ کبھی دھوکا نہیں دے گا۔

مصطفےٰ خوش خوش لندن چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر پھولا نہ سما رہا تھا کہ ایک دفعہ پھر مجھے جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں نے فون کر کے ٹیکسی منگائی۔ سامان پیک کیا۔ دائی مائلہ بوکھلا کر پچھاڑیں کھانے لگی۔ بیچاری کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اب میں مزید قربانی دینے کے موڈ میں نہ تھی۔ میں نے اپنے بھائی عاصم کو فون کر کے اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ اس نے مکمل سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ چٹان بن کر میرے پہلو میں ڈٹا رہا۔ اس نے میرے لیے ایک ہوٹل میں سوئٹ بک کرا دیا۔ میں تینوں بچوں کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ میں تو پہلے ہی پتھر کی ہو چکی تھی۔

سوئٹ بہت نفیس تھا۔ زندگی کے چٹخاروں سے میری رغبت ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اس رغبت میں از سر نو جان ڈالنے کے لیے عاصم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ میرے لیے ایک میز پر کیویار اور شیمپین چنی ہوئی تھی۔ عاصم وہاں آ گیا کہنے لگا کہ یہ سب بندوبست ایک پاگل آدمی کے چنگل سے میری رہائی کا جشن منانے کے لیے کیا گیا ہے۔ "تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے میں چاہتا ہوں یہ تمہاری باقی ماندہ زندگی کا پہلا دن قرار پائے۔ اب تمہیں خوش رہنا ہو گا۔ اس شخص کو بھول جاؤ" اس نے میرے بچوں کی طرف مڑ کر کہا۔ "آج سے میں تمہارا باپ ہوں۔" ہم نے جشن منایا۔ میں جا کر سو گئی۔ مجھے بڑے چین کی نیند آئی۔

میں نے مصطفےٰ کو فون کیا۔ دائی نے فون اٹھایا۔ میں نے پوچھا کہ صاحب کہاں ہیں۔ کہنے لگی کہ وہ یوگا کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ اس کے معمولات میں ذرا سا بھی خلل نہ پڑا تھا۔ اس نے آ کر ٹیلی فون سنبھالا۔ میں نے اطلاع دی کہ میں میں ہمیشہ کے

لیے اسے چھوڑ چکی ہوں۔ کہنے لگا۔ "اچھا۔ امید کرتا ہوں کہ تم اپنی زندگی اچھی طرح گزار سکو گی۔"

میں نے وکیل کو فون پر ہدایت دی کہ طلاق کے کاغذات تیار کیے جائیں۔ مصطفےٰ کو خبر نہ تھی کہ میں کتنی سنجیدہ ہوں۔ جب وکیل نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تاخیری حربے استعمال کرنے لگا۔ بالآخر اس نے کہا کہ طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ مسئلے کو سلجھا لے گا۔ "یہ میرا اور تہمینہ کا آپس کا معاملہ ہے۔"

وکیل نے مجھے بتایا کہ کیا بات چیت ہوئی ہے۔ میرے ذہن میں ہر بات بالکل واضح تھی۔ میں اس سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ میں ابھی کمزور تھی۔ وہ کوشش کرے گا کہ کسی طرح بہلا پھسلا کر مجھے واپس چلنے پر منا لے۔ وہ فریب دہی میں طاق ہو چکا تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ اس کی فریب کاری سے دوچار ہونے پر میرا ردعمل جانے کیا ہو۔ میں نے وکیل سے کہا کہ مصطفےٰ کو بتا دیا جائے کہ میرے ساتھ رابطہ صرف میرے وکیل کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔

میں ہفتے بھر لندن میں رہی۔ آزادی کے پورے سات دن، سات راتیں۔ میں نے وہ تمام چھوٹے موٹے کام کیے جو میری بساط میں تھے لیکن جن سے مصطفےٰ نے مجھے باز رکھا تھا۔ میں ہیروڈز میں لانگ ہیرانسٹی ٹیوٹ گئی۔ مجھے سات برس بعد کسی ہیرڈریسر کے پاس جانے کا موقع ملا تھا۔ میں نے خوب مزے کیے۔ مشاطگی کے ذریعے اپنے چہرے کا رنگ روپ بدلوایا۔ اپنے اور بچوں کے لیے خریداری کی۔ نارمل لوگوں کے درمیان دوبارہ پہنچ جانے پر مجھ پر وجد سا طاری تھا۔

میرے بھائی نے مجھے ہوائی جہاز سے ماربیلا بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔ میں نے بچوں کے لیے ایک دوست کی کھلائی کو ساتھ لیا اور ای کے ولا میں جا اتری۔ میں نے والدین سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ میں وضاحتوں، الزاموں اور تہمتوں میں الجھنا نہ چاہتی تھی۔ میری آرزو تو یہ تھی کہ میرا ماضی اس گہرے نیلے سمندر میں غرق ہو جائے جو سپین میں مجھے اپنے ارد گرد نظر آتا تھا۔

میں ہر روز انکوسول جاتی جو ایک ہیلتھ ریزورٹ ہے۔ جو جو علاج وہاں دستیاب تھے میں نے ان سب سے استفادہ کیا۔ میں پڑھی اکساتی رہتی اور کوشش کرتی کہ اپنے ذہن سے تمام یادوں کو کھرچ کر باہر پھونک دوں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی آزادی کا کیا کروں۔ چھوڑی ہوئی عادتوں کو دوبارہ اختیار کرنے پر جن وقتوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ سب بیک وقت مجھے درپیش تھیں۔ وہاں میں نے دو بڑے کمال کے دوست بنائے۔ ان کے نام میمی اور نسرین تھے اور تعلق ایران سے تھا۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا سہارا ملا۔ میں نے

اپنے اور بچوں کے لیے ڈھیر سارے لباس اور جوتے خریدے اور بڑا اچھا وقت گزارا۔

میرے سننے میں آیا کہ مصطفےٰ کی حالت اب خاصی خستہ ہو چکی ہے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ وہ اس چڑیا کو دوبارہ پکڑنے کے لیے خاصا بے قرار تھا۔ جو پنجرے سے اڑ گئی تھی لیکن جب اس نے جب مجھے پکڑنا چاہا تو وہ مہارت بھی اس کے کسی کام نہ آ سکی جو وہ ہیرل سیر میں کبوتر دبوچنے میں حاصل کر چکا تھا۔ ٹھکرائے ہوئے عاشق کی روایتی شکل صورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے داڑھی بڑھا لی۔ جب وہ دربدر پھر کر میرے دوستوں کو قائل کرنا چاہتا کہ وہ مجھے کسی طرح سمجھا بجھا کر لوٹ آنے پر راضی کریں تو اسے دیکھ کر ترس آتا۔ وہ ہر کسی سے اپنی درماندگی اور خستہ حالی کا ذکر کرتا۔ حد یہ کہ ہمارے مالی تک کے آگے اپنا رونا رویا۔

وہ میری یاد میں روتا رہتا۔ جہاں بھی جاتا آنسو بہانے سے کام تھا۔ وہ بے نظیر علی محمود اور بلو کے سامنے رویا۔ وہ حفیظ پیرزادہ اور میری سہیلی فاطمہ گیلانی اور احمد صیدی کے سامنے رویا۔ اس امید پر کہ شاید ان کے کہنے سے میں اپنا فیصلہ بدل لوں۔ اس نے صبیحہ اور ڈینڈریو کے ساتھ کتنی ہی طویل راتیں گزاریں اور ان سے مدد چاہی۔ وہ بے تحاشا شراب پینے لگا۔ راہ چلتے اجنبیوں کے آگے اپنی بیوی کا ذکر چھیڑ دیتا جس سے وہ پیار کرتا تھا اور جو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جس کے جانے کے بعد وہ بدحواس اور بے حال ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ عاصم سے ملا اور منت کی کہ وہ بیچ بچاؤ کرا دے۔ اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ای کو فون کیا، رو پڑا اور معافی مانگتا رہا۔ میرے گھر والے اس قاصمانہ سکوت کو توڑنے پر مجبور ہو گئے جو انہوں نے پانچ سال سے اختیار کر رکھا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے ای کو اپنی چوٹ کھائی ہوئی خودداری کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔ مصطفےٰ نے کھانا چھوڑ دیا، کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔

وہ ایسے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جن کے ووٹ فیصلہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ میرے دوستوں نے فون کرنے شروع کر دیے اور مجھے یقین دلایا کہ وہ بدل چکا ہے۔ میں قائل نہ ہوئی مجھ پر دباؤ ڈالا گیا، گھر والوں کی طرف سے۔ وہ کہنے لگے کہ اور کچھ نہیں تو بچوں کی خاطر نباہ کرنے کی ایک کوشش اور کر دیکھو۔ اس نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ عاصم تک نے مجھ سے صلح صفائی کے امکان کے بارے میں بات کی۔ "اگر وہ بدل گیا ہے تو میرے خیال میں تمہیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔ تم اس شادی میں اتنی جان کھپا چکی ہو۔ اپنے کیے کرائے کو رائگاں کیوں جانے دیتی ہو؟ سوچو۔ عقل سے کام لو۔" مجھے نظر آنے لگا کہ انہوں نے میری طرف سے آپ سوچنا پھر شروع کر دیا ہے۔ مجھے رہائی دلانے کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ اولیت زندگی کے عملی تقاضوں کو

حاصل رہتی ہے۔ جذبات کی حیثیت ثانوی ہے۔

امی مجھے چھوڑ کر اس کی طرف دار بن بیٹھیں۔ میں حیران رہ گئی۔ لیکن کان دبائے سنتی رہی۔ کہ وہ کس بے احتیاطی سے معاملے کے اچھے برے پہلوؤں کا موازنہ کر رہی ہیں۔ کہنے لگیں کہ وہ بدل گیا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے مصطفے کو قابل رحم بچے کے روپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کس برق رفتاری سے ایک روپ چھوڑ کر دوسرے روپ میں آ جاتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی یہ کایا پلٹ کتنی اثر انگیز اور فریب کارانہ ہے۔ ان باتوں کا انہیں کچھ علم نہ تھا۔ انہیں تو صرف اتنا نظر آ رہا تھا کہ ایک طاقتور شخص ہے۔ جو میرا نام سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ انہوں نے اسے گڑگڑاتے اور عاجزانہ وضع اختیار کرتے دیکھا۔ انہوں نے اسے پشیمان پایا۔ انہوں نے متن تو پڑھ لیا سیاق وسباق پہ نظر نہ کی۔

عاصم نے زیادہ عملی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وکیلوں سے ایک معاہدہ تیار کرنے کو کہا جائے۔ اس معاہدے کی رو سے مجھے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اگر میں دوبارہ اسے کبھی چھوڑنا چاہوں۔ تو طلاق لے سکوں گی اور بچے میری تحویل میں رہیں گے۔ اگر مصطفے دوبارہ اپنے پرانے روپ میں آ بھی گیا تو یہ معاہدہ میرے تحفظ کی ضمانت ثابت ہو گا۔

جس تعطل سے ہم دوچار تھے۔ یہ اس کا اچھا حل تھا۔ اب میں کسی پہ بوجھ نہ رہی تھی۔ مجھے اسی صورت میں واپس جانا تھا جب تمام شرائط کو توڑ مروڑ کر میرے مطلب کا بنایا جا چکا ہو گا۔ مصطفے نے آنکھیں میچ کر معاہدے پر دستخط کر دیے۔ وکیل نے خواہ مخواہ ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "مسز کھر، میرے خیال میں دستخط کرنے سے پہلے آپ کو معاہدہ پڑھ لینا چاہیے" "مجھے متن پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اس دستاویز کی مدد سے تہمینہ میرے پاس آ سکتی ہے تو یہ دستخط کرنے کے قابل ہے۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

میں انگلینڈ لوٹ آئی۔ مصطفے مجھے لینے امی کے گھر آیا۔ امی نے بزعم خود غیرت اور روایت کی ترجمان بن کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ وہ سمجھ لے کہ تم اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی ہو۔ اس بار یہ بات وہ کبھی نہ بھولے تو بہتر۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اب کی دفعہ اس نے پہلی کی طرح تمہیں راہ جاتی کو نہیں اٹھایا ہے۔ تم کوئی گمنامی نا شی نہیں ہو۔ تمہارا بھی اپنا گھر ہے۔ جہاں تم واپس آ سکتی ہو۔"

میں اس کے ساتھ رخصت ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ جا کر علی اور پلو صبیحہ اور اینڈریو، فاطمہ اور عبیدی کا شکریہ ادا کروں۔ وہ سب بہت اچھے دوست ثابت ہوئے تھے۔

مصطفے چاہتا تھا کہ وہ ہو اور میں ہوں، کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں اس کی خواہش کو سمجھ سکتی تھی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم بیرل میر واپس آ گئے۔

مصطفے میرے ساتھ اس طرح پیش آیا جیسے میں کوئی ملکہ ہوں۔ ہم اگلی صبح، دوسری بار ہنی مون منانے، پام بیچ پرواز کر گئے۔ ہمارے گردوپیش میں شہر سے دور کی، کھلی فضا کی، رعنائی بسی ہوئی تھی۔ وہاں ماضی کسی طرف سے دخل انداز نہ ہو سکتا تھا کہ ہمارے ارد گرد حسن نے حصار باندھ رکھا تھا۔

مصطفے ایسا رام ہو گیا جیسے بھیڑ کا بچہ ہو۔ میرے آگے بولتا نہ تھا۔ صرف جیسی کرتا رہتا۔ مجھے کبھی انگلی تک نہ ہلانے دیتا۔ صبح کو اٹھتا تو میرے ساتھ اٹھتا، جب میں کھانا کھاتی تو وہ بھی کھا لیتا اور اسی وقت سوتا جب میں سونا چاہتی۔ ہم نے اپنے اپنے رول بدل لیے تھے۔ ہم ساحل پر شمعوں کی چھاؤں میں رومانی ڈنر تناول کرتے اور سمندر کی جھاگ بھری لہریں بل کھاتی آتیں۔ اور میرے خدشات کو بہا لے جاتیں۔

ہم خریداری کرتے پھرتے۔ مصطفے کو شاپنگ پر ساتھ لے جانا کبھی خوشگوار ثابت نہ ہوتا تھا کہ اس پر تمام وقت جھلاہٹ طاری رہتی تھی۔ بہر حال، اس بار وہ کسی زن مرید شوہر کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ جب وہ تھک جاتا تو بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹوروں کے بڑے دروازے کے آگے زمین پر بیٹھ جاتا اور ان تمام پچھلے بلوں کے نتیجے جو مختلف کاؤنٹروں پر بول چکی ہوتی تھی۔ پیکٹوں کی صورت میں اس کے ارد گرد بکھرے نظر آتے وہ ہمدرد گاہکوں سے ہنسی مذاق کرتا جو اسے کوئی مثالی شوہر سمجھ بیٹھتے۔ "کتنے اچھے ہیں آپ" وہ کہتے مصطفے مسکراتا۔ "ملاحظہ فرمائیے یہ سب کچھ میرا جیسا شوہر اسے اور کہاں مل سکتا ہے۔"

اب وہ رومانی ہیرو کا کردار ادا کر رہا تھا۔ المیہ ہیرو قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ بد قسمتی سے اسے محبت کا جواب محبت سے نہ مل سکا۔ میں اس کی طرف سے چوکنی رہتی میں اس کے جذبات کا جواب نہ دے سکی۔ میں اب بھی دکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن اب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے جب میں سادہ لوحی کی بنا پر ہر بات پر یقین کر لیتی تھی۔ مجھے اب مصطفے کھر سے محبت نہ رہی تھی۔ موجودہ صورت حال تو ایک سراب کے سوا کچھ نہ تھی جسے اس نے گویا کسی افسوں کے زور سے، ہماری زندگیوں کے صحرا میں برپا کر دیا تھا۔ یہ شعبدہ بازی تھی۔ ذہنی نیرنگ تھا میں اس کی روادار بھی نہ تھی کہ وہ مجھے چھو ہی لے۔ میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی سیاست پر فریفتہ تھی۔ ہمارے درمیان ایک یہی جان دار رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ہم پاکستان لوٹ چلیں۔ میں چشم تصور سے سب کچھ دیکھتی۔ ذہن میں، منصوبے بناتی کہ اپنے اس مکان میں، جسے فوج نے ضبط کر

لیا تھا، رنگوں کی کون سی سکیم برتوں گی، اس کی کس طرح زیبائش کروں گی۔ میں واپس جا کر اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا حلیہ بدل سکوں۔ وہ مکان میرے لیے وطن بن گیا اور اس کی اندرونی زیبائش میری سیاست۔

اسے میں نے صرف اتنی چھوٹ دی کہ وہ میرا ہاتھ تھام لیا کرے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کرنے دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ وہ مجھ سے عشق کا اظہار کرے۔ یہ اظہار مجھے کھوکھلا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ماضی میں بے شمار باتیں ایسی تھیں۔ جن سے اس کے دعووں کی بالکل نفی ہو جاتی تھی۔ میں اس کی عشقیہ پیش دستیوں سے بدکتی رہتی۔ اس کی رومانی سلسلہ جنبانیوں سے مجھے وحشت ہوتی۔

پام بیچ سے ہم بوسٹن گئے جہاں ہم نے منو کے پاس قیام جس کی علی حبیب سے شادی ہو چکی تھی۔ ان کے ساتھ خوب مزے رہے۔ ہمارے لڑائی جھگڑے بالکل ختم ہو چکے تھے۔ منو کو بڑی خوش گوار حیرت ہوئی۔ میں پرسکون تھی اور اس کی بدمزاجی کا نام ونشان نہ رہا تھا۔ مصطفے خلیق اور شائستہ بن چکا تھا اور اس نے گالیاں بکنی چھوڑ دی تھیں۔ وہ میری ٹانگیں اور سر دباتا۔ میری گرم پانی کی بوتل بھر لاتا۔ شیر سیدھے بلونگڑے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہم لندن واپس آ گئے۔ میری نانی اماں پاکستان سے ہمارے پاس رہنے کے لیے آئیں۔ انہیں اپنے ہاں ٹھہرا کر مجھے بڑا لطف آیا۔ مصطفے ان کی دیکھ بھال کرتا رہا مجھے بالآخر اپنے گھر میں خوش دیکھ کر انہیں بڑی تسکین حاصل ہوئی۔ کہنے لگیں۔ کہ انکی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔

میں نے گھر میں سادہنا ہاتھ لگوا لیا۔ میں محبت میں گرفتار تو نہ تھی مگر خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی۔ میں مطمئن تھی۔ مصطفے پر نئے اقرار نامے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا بھوت سوار ہو گیا وہ چاہنے لگا کہ میں اس کے ایک اور بچے کی ماں بنوں۔

مجھے یقین تھا کہ میرے سب حمل کسی کی بددعا کے زیر اثر تھے۔ میں جب بھی حاملہ ہوتی مجھے انتہائی روح فرسا تجربات سے گزرنا پڑتا۔ کوئی حمل ایسا نہ تھا جو ڈراؤنے خواب سے کم ہو۔ مصطفے نے منت سماجت کی، میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اسے ایک آخری موقع دیا جائے۔ ہماری ازدواجی زندگی کے اس دور میں پیدا ہونے والا بچہ بہت خاص ثابت ہو گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ایک نارمل اور پرمسرت حمل کے تجربے سے گزروں۔ اس نے وعدہ کیا کہ میری ناز برداری کرے گا اور میرا ہر الٹا سیدھا حکم بجا لائے گا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا میں ان تمام بحرانی کیفیتوں کو کسی طور فراموش نہ کر سکتی تھی۔ جو بظاہر صرف اس وقت سر اٹھاتی تھیں جب مجھے حمل ٹھہرا ہوا ہو۔ مجھے جرم و سزا پر

یقین تھا۔ میں نے ایک حاملہ عورت کو دکھ پہنچایا تھا۔ مصطفے کی بیوی، شیری کو، خدا نے مجھے معاف نہیں کیا۔ خدا نے ایسا بندوبست کیا کہ میں اس بات کو کبھی بھولنے نہ پائی۔ جب بھی میرے رحم میں کوئی بیج پرورش پانے لگتا خدا مجھے انتہائی کربی لناکیوں میں ڈال دیتا۔ شیریں جب میرے ہاتھوں اپنے شوہر سے محروم ہوئی تھی تو اس کا ساتواں مہینہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی درد بھری فریاد خدا نے سن لی ہو گی۔ ہر بار جب میں حاملہ ہوتی اس کی بددعا مجھے لگ جاتی۔

مصطفے شیری کی بددعا کے آسیب کو میرے سر سے اتار دینا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں مدیلہ کا بار بار منظر پر نمودار ہونا محض اتفاق نہ تھا۔ ہر بار مجھے دکھ جھیلنا اور کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ مصطفے کا اٹیل پن کام دکھا گیا۔ میں کمزور پڑ گئی مجھے پھر حمل ٹھہر گیا۔ میں پھندے میں پھنس چکی تھی۔

ایک حیرت ناک بات ہوئی جونہی میں نے اسے بتایا کہ میرے تمام طبی ٹیسٹ مثبت نکلے ہیں جن سے میرا حاملہ ہونا ثابت ہے اس کا رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ میں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ مجھے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں لانا چاہتا تھا۔ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ جو راس رچائی جارہی تھی وہ ختم ہوئی۔ نقاب جھر سے پھاڑ کر اتار پھینکا گیا۔ اب جب کہ اس کا بچہ میرے پیٹ میں پل رہا تھا۔ میں کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں عاصم اور اپنے والدین کے سامنے اپنے حماقت کی کیا وضاحت پیش کروں گی۔ میں اس حالت میں کہاں جاؤں گی کہ ایک بچہ پیٹ میں ہو اور تین بانہوں میں۔ اس نے مجھے پھر جوت لیا تھا۔ میں میڈیا نہیں تھی۔ میرے سینے میں دل تھا۔

اس نے پھر اس نامعقول انداز میں خواہ مخواہ لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ وہ گالیاں دینے پر اتر آیا گرداب میں پھر ابال آنے لگا۔ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ جس معاہدے پر اس نے دستخط کیے تھے وہ اس کے حوالے کر دیا جائے میں نے انکار کر دیا۔ اس کی پاداش میں مجھے اپنے دوستوں سے ملنے ملانے سے روک دیا گیا۔ علی اور بلو، صبیحہ اور لنڈریو میرے لیے ناپسندیدہ شخصیتیں بن کر رہ گئے۔ جنہوں نے برے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا وہ ان سب کی بوٹیاں نوچنے پر تلا ہوا تھا۔ بددعا پھر اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ مجھے ہراساں دیکھ کر مصطفے کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ میرے اندیشوں کو اور ہوا دینے لگا۔ "تم جب بھی حاملہ ہو گی تمہیں بددعا لگ جائے گی۔ تم ٹھیک

یونانی اساطیر میں ایک شہزادی جس نے شوہر سے ان بن کے بعد بچوں کو مار ڈالا تھا

ہی کہتی تھیں۔ یہ اس بددعا کی طاقت کا ایک اور نمونہ ہے۔ تمہیں اپنی غلط کاریوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔"

دھیرے دھیرے میری وہی پرانی حالت عود کر آئی میں پھر سے کوئی شمس... بے حس چیز بنتی جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر مصطفےٰ بہت مطمئن اور محظوظ ہوا۔ اس نے ہالینڈ پارک میں ایک فلیٹ خریدا یہ ہماری مشترکہ ملکیت تھا۔ اس کی اس حرکت سے انتشار کی کیفیت دوچند ہوگئی۔ اس بارے میں پہلے سے کچھ کہنا ناممکن تھا کہ یہ شخص کیا کرے گا، کیا نہیں کرے گا۔ اس بے یقینی کی وجہ سے میں دوبارہ پاگل ہوتی جارہی تھی۔ ہمارا زیادہ سے زیادہ وقت فلیٹ میں گزرنے لگا جہاں ہم بظاہر اس کی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔

جب میرا بیٹا حمزہ پیدا ہوا اور مصطفےٰ میرے پاس تھا۔ میرا قیام لندن میں تھا۔ حمزہ کی پیدائش کے دو دن بعد مصطفےٰ کو ملک سے باہر جانا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ جارہا تھا۔ جہاں بہت گرمی پڑتی تھی۔ اسے ٹھنڈے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب مجھے کرنا تھا۔ یہ حمزہ کے پیدا ہونے کے ایک دن بعد کی بات ہے۔

کسل مند ہونے کے باوجود اس کے لیے کپڑے خریدنے لیبرٹی گئی جتنی دیر اس نے ملک سے باہر رہنا تھا اتنے عرصے کے لیے میرے گھر سے باہر جانے پر قدغن لگا دی گئی۔ مجھے امی کے گھر جانے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ "اگر تم وہاں گئیں تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔" مجھے ایک بار پھر الگ تھلگ کیا جارہا تھا، ڈرایا دھمکایا جارہا تھا۔

عدیلہ دوبارہ میری زندگی میں داخل ہوئی اور اس بار تبدیلی یہ آئی کہ اس کی آمد خوشی کے موقع کے حوالے سے تھی۔ اس کی مطلوب سے شادی ہوگئی۔ جو بہاولپور کا ایک جاگیردار تھا۔ وہ دلکش اور نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اور عدیلہ دونوں ایک دوسرے پر دیوانہ وار فریفتہ تھے۔

میں نے اس کا جہیز تیار کرنے میں اس کی مدد کی۔ میں نے اس کا تمام فرنیچر چننے اور پاکستان بھجوانے میں ہاتھ بٹایا۔ حاملہ ہونے کے باوجود سامان روانہ کرنے والوں کے پاس گھنٹوں یہ اطمینان کرنے کے لیے کھڑی رہی کہ تمام چیزیں ٹھیک حالت میں اور حفاظت سے بھجوائی جارہی ہیں۔ اس کے گھر کا سارا سامان لندن سے پاکستان ہوائی جہاز کے ذریعے بھجوایا گیا۔

میں نے فون پر اس سے اس وقت بات کی جب وہ والدین کے گھر سے دلہن بن کر رخصت ہونے والی تھی۔ ہم دونوں رونے لگیں۔ دو کشتۂ ستم ایک شادی کا نشانہ بنی، دوسری بہیمانہ ہوس کا شکار ہوئی۔ میں نے دعا کی کہ اس کی زندگی خوشیوں سے عبارت

ہو۔ "میری تمنا ہے کہ تمہاری شادی اتنی ہی کامیاب ہو جتنی کامیاب میں اپنی شادی کو دیکھنا چاہتی تھی میری تمنا ہے تمہاری ازدواجی زندگی میں دکھ کا کوئی لمحہ نہ آئے۔ میری تمنا ہے کہ تمہیں وہ سب کچھ نصیب ہو جس کی زندگی میں مجھے حسرت رہی۔"

میں فون نیچے رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ وہی فون تھا جس نے مجھے اتنا دکھ پہنچایا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہ ہمیشہ کے لیے اپنی ٹیکن پر آرام سے دھرا رہے گا۔ اسی فون کی بدولت کئی سال بعد عدیلہ کو زک اٹھانی پڑی۔

حمزہ کی ولادت کے بعد مطلوب اور اس کی نئی نویلی دلہن لندن آئے۔ مصطفےٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ میں اپنے طور پر مطلوب سے ملوں۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار لگی۔ میں نے بحث کی۔ اس نے میری دلیل رد کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ میرے علاقے کا جاگیردار ہے۔ اگر میں اس کی بیوی سے نہیں مل سکتا تو وہ بھی میری بیوی سے نہیں مل سکتا۔" "تم تو کسی وجہ سے اس کی بیوی سے ملنا نہیں چاہتے۔ وہ کس وجہ سے نہ ملے؟" خاموشی۔ لیکن بحث میں میرا پلڑا بھاری رہنے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ مجھے حکم دیا جاچکا تھا۔

مصطفےٰ معاہدے کے کاغذات حاصل کرنے کے لیے مجھے دق کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے کسی قسم کا تحفظ حاصل نہ رہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے کاغذات کے بارے میں جھگڑتا رہتا۔ "مصطفےٰ اگر تمہیں شرائط سے اتفاق نہیں تھا تو تمہیں ان کاغذات پر دستخط کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا۔ اب نتائج خود بھگتو۔ میں عاصم سے کاغذات نہیں مانگ سکتی۔ اس کی نظر میں تمہارا کوئی احترام نہ رہے گا۔" اس نے مجھے تھپڑ رسید کیا۔ فلیٹ جاکر اس نے وکیل سے فون پر کہا کہ کاغذات اسے بھجوا دیئے جائیں۔ "میری بیوی معاہدے کی تنسیخ پر آمادہ ہوگئی ہے۔ کیا آپ ہمیں ایسا ڈرافٹ بھجوا سکتے ہیں جس میں یہ صراحت کردی گئی ہو کہ معاہدہ منسوخ ہوچکا ہے۔ وہ اس پر دستخط کردے گی۔" وکیل نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور نیا معاہدہ اگلی صبح ڈاک سے بھجوا دیا جائے گا۔ مصطفےٰ نے کہا کہ اگر میں نے معاہدے کو منسوخ نہ کیا تو وہ مجھے جسمانی گزند پہنچائے گا۔

میں ڈاک کی منتظر تھی۔ میں نے معاہدہ وصول کیا۔ گھر جاکر بچوں کو لیا اس بار چاروں بچوں اور منو کے ساتھ، جو کار چلا رہی تھی، ہم امی کے ہاں چلے گئے۔

بظاہر مصطفےٰ جب گھر لوٹا اور اسے پتہ چلا کہ ہم سب جاچکے ہیں تو وہ روتے لگا۔ اس نے مجھے واپس جانے پر راغب کرنا چاہا۔ مصطفےٰ نے پھر ان سے بات چیت شروع کردی اور اس بار کہا کہ میری دماغی حالت درست نہیں اور میرے کردار پر بھی ناشائستہ الزام

گا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ میں اب مصطفےٰ کے وعدوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتی۔ مجھے بہت بار ڈسا جا چکا تھا۔

میں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ میرے بچوں کو عدالت کی تحویل میں دے دیا گیا۔

باب-۴

سیاسی حیوان

1977ء تا 1986ء

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مصطفےٰ کھر نرا حیوان نہیں تھا۔ سب سے پہلے اور نمایاں طور پر وہ سیاسی حیوان تھا۔ جن دنوں وہ مجھے دھنتا اور مجھ پر دھونس جماتا رہتا تھا ان دنوں اصل میں انتہائی سنجیدہ سیاسی کاموں میں مصروف تھا۔ اس کی گھریلو زندگی تو اس تماشے کا ذرا سا ضمیمہ تھی جو بہت بڑی سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔ اس کے جوہر اس وقت کھلتے جب وہ اتحاد قائم کرنے یا توڑنے، سازشیں کرنے، منصوبے گھڑنے اور بات کو شک کی نظر سے دیکھنے والوں کو بہلا پھسلا کر ہم خیال بنانے میں مشغول ہوتا۔ اپنی پیچ در پیچ سازشوں کی مدد سے وہ جلاوطنوں کی سیاست کے جنگل سے صحیح سلامت نکل آیا جہاں سیاسی رہنماؤں اور اقدام پسندوں کو اپنی قربانیوں اور اہمیت کے حوالے سے اس مغالطے میں مبتلا ہوتے دیر نہ لگتی کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ مصطفےٰ سدا سے اس کا قائل تھا کہ ہر کام کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہونا چاہیے، ورنہ اسے کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اب اس نے حقیقت پسندی کا رشتہ ایک ورثہ کے ساتھ جوڑنا شروع کیا۔ اسے اپنی اہمیت پر پختہ یقین تھا اور سمجھتا تھا کہ تمام جلاوطنوں میں صرف وہی ایسا ہے جو غاصب کا تختہ الٹنے کی جدوجہد کی قیادت کر سکتا ہے۔ جس سیاسی جماعت کی اس نے داغ بیل ڈالی تھی، جسے چھوڑ دیا تھا اور جس میں دوبارہ شرکت اختیار کر لی تھی۔ وہ جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ مصطفےٰ کو یہ بڑا کمال کا موقع ہاتھ آیا تھا وہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو

چن کر پارٹی کو اپنی مرضی کے مطابق نئی شکل دے سکتا تھا۔

جس انداز سے ہم نے پاکستان چھوڑا تھا اس پر میں ناخوش تھی۔ حکمران ٹولے کے دو سینئر رکن، جنرل فیض علی چشتی اور جنرل راؤ فرمان علی مصطفےٰ پر مائل بہ کرم تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ مصطفےٰ نے اپنی جان بچانے کے لیے سودا کیا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ لندن سے چند ایسی دستاویزات لے آئے گا جن کی مدد سے بھٹو صاحب کو ملزم ٹھہرایا جا سکے گا۔ جنرلوں نے اسے بھروسے کے قابل سمجھا۔ یہ بات بجائے خود کلنک کا ایسا ٹیکا ہے جو مصطفےٰ کے ماتھے پر ساری عمر لگا رہے گا۔

مصطفےٰ نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا کہ اس کے اور جنرلوں کے درمیان کیا سودا ہوا ہے۔ مجھے بس اتنا علم تھا کہ دستاویزات لے کر ہمیں اسی سال نومبر میں پاکستان لوٹنا تھا۔ یہ بے وفائی میری سمجھ سے باہر تھی۔ بھٹو صاحب اور مصطفےٰ میں اختلافات رہے تھے لیکن ان کو دور کیا جا چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر بھٹو صاحب کا قابل اعتماد ساتھی بن چکا تھا۔ لیکن اب جس وقت اس کا قائد اپنی زندگی کی خاطر ایک بے لحاظ حکومت سے جنگ لڑ رہا تھا مصطفےٰ بظاہر جلادوں کے ساتھ کسی سازش میں ملوث ہو چکا تھا۔ کیا وہ واقعی کمزور طبیعت کا مالک اور سیاسی طور پر بے اصول آدمی تھا؟ میرے شبہات کا مصطفےٰ کے پاس ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا۔ "آنے والا وقت بتائے گا۔" اور یہ جواب بہت معنی خیز، بہت چست اور ڈپلومیٹک انداز میں ذومعنی تھا۔

میں محسوس کر سکتی تھی کہ مصطفےٰ بے چین ہے۔ وہ ایک دبدھے سے دست و گریباں تھا۔ وہ جنرلوں کے چنگل سے نکل چکا تھا ایک اجنبی ملک میں بے یارومددگار پڑا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی۔ اس کے باوجود اسے لگتا تھا کہ یہ سب حالات بدل سکتے ہیں۔ اسے ایک بہت اہم اور کڑا فیصلہ کرنا تھا۔ اگر وہ وعدے کے مطابق پاکستان نہ لوٹا تو جنرل بڑے جھلائیں گے۔ وہ انہیں زبان دے کر آیا تھا۔ اگر وہ انگلستان میں ٹھہرا رہا اور اعلان کر دیا کہ وہ بھٹو کا حامی ہے تو پارٹی کے ملک سے باہر مقیم اقدام پسند اس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے اور اسے سربلند کر کے اپنا قائد مان لیں گے۔ اسے پورا یقین تھا کہ آفت میں گرفتار وزیراعظم کے یہ پرستار اسے مالی طور پر بھی سہارا دیں گے۔ جو ادھر یا اُدھر قسم کا کڑا فیصلہ وہ کرے گا۔ اسی کو مد نظر رکھ کر تاریخ اسے اچھا یا بُرا قرار دے گی، غدار یا ہیرو؟۔ مصطفےٰ نے ذہن میں سکہ اچھالا چند کی نظر میں غدار، عوام کی نظر میں ہیرو۔ اس نے لندن رک جانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اسے انجام دینا آسان نہ تھا۔ اپنے ماضی کی وجہ سے مصطفےٰ کی شخصیت کو داغ لگ چکا تھا۔ پیپلزپارٹی کے وہ افراد، جو سخت پالیسی اپنانے

کے حق میں تھے، اسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں یاد تھا کہ اس نے ان کے عظیم قائد کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے خیال میں وہ بہت خود طلب اور احسان فراموش تھا۔ جس انداز میں اس نے پاکستان چھوڑا تھا اس کے پیش نظر انہیں اس کی نیت پر بھی شبہ تھا۔ اپنی تاریخ کے اس دور میں پیپلزپارٹی والوں کو ہر شخص پر چھپے دشمن کا گمان ہوتا تھا۔ انہیں ہر طرف مخبر نظر آتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ ان کی صفوں میں حکومت نے اپنے آدمی داخل کر دیے ہیں۔ مصطفےٰ کا دفتر عمل بے داغ نہ تھا۔ جنرلوں نے اس کے پاکستان سے فرار کے وقت اغماض سے کام لیا تھا۔

مصطفےٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ شک اور شبے کی اس فضا کے خلاف جدوجہد کرے گا۔ میں نے اس کے موقف کو سراہا۔ میں نے کہا کہ وطن لوٹ کر سرکاری گواہ بننے سے بہتر ہے کہ ہم مکھیاں مارتے پھریں اور روکھی سوکھی پر گزارا کریں۔ بھٹو صاحب اس کے قائد تھے۔ وہ جو بھی تھا انہیں کی وجہ سے تھا۔ اسے یہودا کا کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔ میری بھٹو صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن میں انہیں ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتی تھی۔ مصطفےٰ ان کا ذکر نہایت جوشیلے انداز میں کرتا رہا تھا۔ وہ میرے قائد کے قائد تھے۔

مصطفےٰ جنرل چشتی کو فون کرتے ہوئے گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ وہ جنرل کو دو ٹوک انداز میں یہ نہ بتا پایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس نے واپسی کی مقررہ تاریخ میں توسیع کی آڑ لی۔ کہنے لگا کہ وہ دو مہینے میں قطعی طور پر لوٹ آئے گا۔ مصطفےٰ اپنی کشتیاں جلانے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ پہلے ہوا کا رخ دیکھنا چاہتا تھا۔ صورت حال کے بارے میں وہ غیر یقینی کا شکار تھا۔

جیسے جیسے جنوری کا مہینہ قریب آیا مصطفےٰ کو بھی وہی مرض لاگو ہو گیا جو جلاوطنوں میں عام ہے یعنی مرض رجائیت۔ اس نے مجھے بتایا کہ جنرل ضیا کے دن گنے جا چکے ہیں۔ "وہ چھ مہینے سے زیادہ نہیں نکال پائے گا۔ دیکھ لینا"

ان نو برسوں میں جو ہم نے جلاوطنی میں گزارے اپنا یہ انداز اس نے اتنی بار دہرایا کہ سن سن کر کراہت آنے لگی۔ اس نے جرنل کو مطلع کر دیا کہ وہ واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

مصطفےٰ نے ذوالفقار علی بھٹو کو بچانے کے لیے ملک سے باہر مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کی ابتدا اور پاکستان میں مقدمے کی ابتدا ایک ہی وقت میں ہوئی۔ مقدمہ جس میں ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت کر کے فیصلہ سنایا گیا اور جو عدالتی قتل کی صورت میں اختتام کو پہنچا۔ بھٹو کا بڑا بیٹا، میر مرتضےٰ بھٹو، آکسفورڈ میں تھا۔ مصطفےٰ نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اسے آکسفورڈ چھوڑ کر لندن چلے آنے پر راضی کر لیا۔ مصطفےٰ نے اسے فوجی حکومت کے

خلاف پیپلزپارٹی کی مزاحمت کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ اس نوجوان طالب علم کو سیاست کے فن کی اونچ نیچ سمجھانی شروع کی۔ مرتضےٰ تھا تو جذباتی لیکن بڑی تیزی سے سبق سیکھنے لگا۔ وہ ہمیشہ اپنی بہن بے نظیر کے سائے میں رہتا تھا۔ جو بھٹو کے ترکے کی وارث تھی۔ مرتضےٰ دل ہی دل میں بہن کی بالادستی سے خار کھاتا تھا اور بھٹو صاحب کی نظر میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے بہت بے چین تھا۔ میر مرتضےٰ کو بھی، مصطفےٰ ہی کی طرح کسی ایسے مقام کی تلاش تھی جس پر فائز ہو کر وہ اپنے جوہر دکھا سکے۔ ان دونوں کے ملاپ سے پیپلزپارٹی کے حوصلہ ہارے ہوئے اقدام پسندوں کو امید کی نئی کرن نظر آئی۔ مصطفےٰ کے متانت آمیز رویے سے مرتضےٰ کی تندخوئی میں اعتدال پیدا ہوا۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر مصطفےٰ کو مرتضےٰ کے ذہن کو کچھ عرصہ اور قابو میں رکھنے کا موقع مل جاتا تو اس کے انقلابی جوش وخروش کا رخ صحیح سمت میں موڑا جا سکتا تھا۔ جب اسے تنہا چھوڑ دیا گیا تو میر بھٹک کر سیاست کی سر بستہ گلی میں جا نکلا۔ جس میدان میں وہ غلبہ حاصل کر سکتا تھا اسے اپنی بہن کے لیے خالی چھوڑ دیا۔

مصطفےٰ میر مرتضےٰ کی خامیوں سے آگاہ تھا۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ میر میں سیاسی کیریر اختیار کرنے کا کوئی رجحان موجود نہیں ۔ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس میں اتنی اہلیت نہیں کہ ان کی زندگی بچانے کے لیے کوئی تحریک چلا سکے۔ بھٹو صاحب کے ان خیالات کا مصطفےٰ کو بھی علم تھا اور میر کو بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا سہارا لے کر اپنا اپنا کام نکالنا چاہا۔ بھٹو کے بیٹے کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے مصطفےٰ کی ساکھ میں اضافہ ہوا۔ ادھر میر نے اس شخص سے سیاست کے گر سیکھنے شروع کیے جسے اس کے والد نے ایک بار برسرِعام اپنا جانشین قرار دیا تھا۔

بھٹو صاحب نے بہت سے عالمی رہنماؤں سے ذاتی سطح پر تعلقات استوار کیے تھے۔ اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود ان تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اقتدار پر مبنی سیاست میں ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن خیال رہے کہ بھٹو صاحب کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ مصطفےٰ اور میر نے فیصلہ کیا کہ ان رہنماؤں سے ملنا چاہیے۔ ان کے مشن کا مقصد یہ تھا کہ ان رہنماؤں کو قائل کیا جائے۔ کہ وہ بھٹو صاحب کی جان بچانے کے لیے تگ ودو کریں۔ مصطفےٰ کو یقین تھا کہ جنرل بین الاقوامی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ بھٹو صاحب کے دوست جلاوطنوں کو مالی امداد فراہم کریں گے۔ اور اس طرح بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے چلائی جانے والی تحریک کا زور ٹوٹنے نہ دیں گے۔

میر اور مصطفےٰ لیبیا جا کر قذافی سے ملے۔ بھٹو صاحب نے اس "مغربی دنیا کے اچھوت" کو بڑی عزت بخشی تھی۔ لاہور میں ایک سٹیڈیم اب تک قذافی کے نام سے

موسوم ہے۔ قذافی نے وفادار دوست ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے میر کو مہم چلانے کے لیے فنڈ فراہم کیا۔ متحدہ عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان کی طرف سے بھی مالی مدد موصول ہوئی۔ میر اور مصطفےٰ حافظ الاسد اور الجزائر کے بومدین سے بھی ملے جنھوں نے وعدہ کیا کہ ضیا کی حکومت پر دباؤ ڈالتے رہیں گے۔

فنڈز وصول ہو گئے۔ نوجوان اور آدرش پسند شاہنواز بھٹو بھی آ پہنچا جس کے چہرے پر کسی انقلابی کی کھوئی کھوئی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ بھی ہمارے پاس ٹک گیا۔ مصطفےٰ لینن کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کی کروپس کایا (لینن کی بیوی) بڑی حد تک ان تمام معاملات سے دور دور رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ تینوں انقلابیوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہو چلی ہے۔ روپے نے آتے ہی نحوست پھیلائی اور فساد ڈلوا کر چھوڑا۔

ان کے دورے جاری رہے۔ وہ یاسر عرفات سے ملے اور اس کی تائید حاصل کی گئی۔ مصطفےٰ آزمودہ کار مہم جو تھا۔ وہ اخفا اور راز داری میں یقین رکھتا تھا۔ اس کے برعکس میر اور شاہنواز کو بڑی جلد جوش آ جاتا تھا۔ ان سے بعید نہ تھا کہ کوئی غیر محتاط حرکت کر بیٹھیں۔

مصطفےٰ نے سازشی لہجے میں ہمیں مطلع کیا کہ یاسر عرفات نے بھٹو صاحب کو چھڑانے کا پلان تیار کر لیا ہے۔ فلسطینی کمانڈو پاکستان بھیجے جائیں گے۔ وہ راولپنڈی جیل پر حملہ کریں گے۔ اور جب لوگوں کی توجہ بٹ جائے گی تو بھٹو صاحب کو کوٹھری سے نکال کر لے جائیں گے۔ ایک اور دوست ملک کا طیارہ، بظاہر کسی وی آئی پی کو لے کر، چکلالہ کے ہوائی اڈے پر منتظر کھڑا ہو گا۔ بھٹو صاحب کو اس پر سوار کرا کے ملک سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔ ان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ رہے گا۔ وہ جلد ہی ہم سے آ ملیں گے۔ تاکہ ضیا کی ظالمانہ حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھ سکیں ایسی باتیں سن کر خوشی سے اچھلنے کو جی چاہتا تھا۔

جوش کے مارے میر کو خود پر قابو نہ رہا۔ اس نے کراچی اپنی بہن بے نظیر کو فون کیا اور فون پر، لہک لہک کر باتیں کرتے ہوئے، منصوبے کی تفصیلات ظاہر کر دیں۔ بے نظیر نے کرید کرید کر سوال کیے ۔ میر نے مزید تفصیلات سے پردہ اٹھایا، فوج ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سترکلفٹن کا کوئی فون ایسا نہ تھا جسے انٹیلی جنس کی تمام ایجنسیوں نے ٹیپ نہ کر رکھا ہو۔

سننے میں آیا ہے کہ اس نامراد فون کال نے بھٹو صاحب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ غصے کے مارے مصطفےٰ پیلا ہو گیا۔ میرے بیڈروم کی خلوت میں اس نے مجھے بتایا کہ میر اور بے نظیر کے بارے میں اس کی ٹھیک ٹھیک کیا رائے ہے۔ "یہ دونوں پرلے درجے

کے گاؤدی ہیں۔ اس قدر بے عقلی کی حرکت کرنے کی انہیں کیا سوجھی۔ انہوں نے اپنی بچگانہ حرکت سے سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا۔" اس نے میر کے ساتھ کسی رورعایت سے کام نہ لیا اور صاف صاف بتا دیا کہ اس طفلانہ حرکت کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ اس نے میر کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کے کیے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔

بھٹو صاحب کو بچانے کا منصوبہ رفت گزشت ہوا۔ قیدخانہ یکایک چھوٹے سے قلعے میں تبدیل ہو گیا۔ پہرے داروں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ دائیں بازو کی جماعت اسلامی کے پیکار طلب بازو سے تعلق رکھنے والے افراد نے آ کر جیل کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نہ کمانڈو آئے نہ چکلالہ کے ہوائی اڈے پر کوئی طیارہ کھڑا نظر آیا۔ بھٹو صاحب کے گرد پھندا تنگ ہوتا چلا گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ اگر وہ فون نہ کیا جاتا تو انہیں بچایا جا سکتا تھا۔ آخر کار وہی پھندا پھانسی کا پھندا بن کر ان کے گلے میں پڑا۔

روپیہ دھڑا دھڑ ہمارے پاس رہا تھا۔ مجھے ایک بریف کیس یاد ہے جو آغا حسن عابدی کی معرفت ہمیں ملا تھا۔ اس میں پچاس ہزار پاؤنڈ تھے۔ یہ رقم اسی کے سیف میں رکھوا دی گئی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ مرتضے زیادہ پر اعتماد نظر آنے لگا تھا وہ اپنے رابطے قائم کر چکا تھا اور مصطفے سے جان چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میر کو اپنی اہمیت کا علم تھا۔ وہ بھٹو خاندان کا فرد تھا۔ یہ خاندانی نام اس کی ساکھ کا ضامن تھا۔ نام کیا تھا چھومنتر تھا۔ ادھر نام لیا نہیں، اُدھر کام ہوا نہیں۔ اسے یہ پسند نہ تھا کہ روز افزوں شہرت کے اس راستے پر وہ مصطفے کو ساتھ لے کر چلے اور پھر یہ بھی ہے کہ مصطفے کا طرز عمل اسے شاید ضرورت سے زیادہ محتاط اور دقیانوسی معلوم ہوتا تھا۔

نوجوان مرتضے اور شاہنواز کو جو نئی نئی اہمیت ملی اور دولت ہاتھ آئی تو ان کے عیش ہو گئے۔ وہ اپنی امیج پر آپ ہی ریجھ گئے۔ وہ بہت نوجوان تھے اور نوجوانوں کی رسائی اگر اچانک عورتوں اور تیز رفتار زندگی تک ہو جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ انہیں ایسے سیاست داں سمجھا گیا۔ جو اپنے والد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلا لینے میدان میں اترے ہیں۔ اس بنا پر لوگ جوق درجوق ان کی طرف کھنچے چلے آئے لیکن یہ مقناطیسیت ان آسانی سے بھرنے میں آ جانے والے بیڈروم انقلابیوں کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی۔ ان کی زندگی کا پورا اسلوب بدل گیا۔ وہی انقلاب قابل قبول ٹھہرا جس کی باگ ڈور جیٹ طیاروں پر ملکوں ملکوں سفر کرنے والے امیر وکبیر حضرات کے ہاتھ میں ہو۔ جان جوکھوں کھانے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے دن گزر چکے تھے۔ وہ ناولوں میں پائے جانے والے دہشت گرد معلوم ہونے لگے جیسے ان کی ذات میں چے گیویرا اور ہیرالڈ رابنز کے کسی کردار کو رلا ملا دیا گیا ہو۔

میر نے اب پانچ ستارہ ہوٹلوں کے شاندار سوٹوں میں ڈیرا جمایا۔ جینز کی جگہ مہنگے سوٹوں نے لے لی۔ چال ڈھال میں اکڑفوں پیدا ہو گئی۔ لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا لڑکا ماچس کی ان جلتی تیلیوں سے کھیل رہا ہو۔ جن لڑکیوں سے اس کا کسی زمانے میں میل جول تھا وہ غائب ہو گئیں۔ اب انسانیات پڑھنے اور مارکس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے والی نوجوان، آدرش پسند، خوش خلاف انڈر گریجویٹ لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی نظر نہ آتیں۔ ان کی جگہ ایسی حسین وجمیل سمور پوش عورتوں نے لے لی جن کا اونچے اونچے سماجی حلقوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹیلی فون کی کتاب سے عام لوگوں کے نام اور پتے قلمزد کر دیے۔ اب وہاں ایسی امیر کبیر عورتوں کے نام تھے جن کے نمبر تک ڈائرکٹریوں میں درج نہیں ہوتے۔ ان دنوں ایک یونانی وزیر کی بیوی تو ہر وقت مرتضے کی باہنوں میں جھولتی رہتی تھی۔

مصطفے نے میر کو حسنی شیخ سے متعارف کرا دیا تھا۔ اپنے والد کی داشتہ اور خفیہ بیوی سے ملنا میر پر یقیناً گراں گزرا ہو گا۔ لیکن حسنیٰ کے اہم شخصیتوں سے روابط تھے۔ اس لیے محبت کو بالائے طاق رکھتے ہی بنی۔ شیخ زید سے ملاقاتوں کا بندوبست کرنے کے لیے انہیں حسنیٰ کی مدد درکار تھی۔ حسنیٰ نے انہیں شیخ زید سے ملوا دیا۔ بھٹو کے بیٹے کی دستگیری کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ جس شخص سے اسے محبت ہے اس سے وفا کرتی رہے گی۔ حسنیٰ نے میر کو خبردار کرنا شروع کر دیا کہ مصطفے سے بچ کر رہے اور رازدارانہ طور پر بتایا کہ اس کے والد نے مصطفے پر کبھی پوری طرح اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس نے میر کو مشورہ دیا کہ اپنے لیے راہ خود نکالے کیونکہ وہ محسوس کرتی تھی کہ ان تمام رابطوں سے مصطفے اپنی سیاسی حیثیت مستحکم کرنے کا کام لے گا۔ وہ مصطفے سے بخوبی واقف تھی۔ مصطفے کی سیاسی حرص اور موقع پرستی کا جو اندازہ اس نے لگایا تھا وہ ممکن ہے مبالغہ آمیز ہو لیکن میر کا اثر پذیر ذہن اس کی پڑھائی ہوئی پٹی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بھٹو صاحب نے شیخ زید کے نام ایک خط مصطفے کو دیا تھا۔ اس میں مصطفے کو بھٹو صاحب کا بھائی کہہ کر متعارف کرایا گیا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ خط میں شیخ زید سے یہ استدعا بھی کی گئی تھی کہ حامل رقعہ کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ انگلینڈ آنے کے بعد مصطفے نے وہ خط حسنیٰ کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ "میں نے تو اس خط سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حسنیٰ نے غالباً اس کی مدد سے اپنا کام نکال لیا۔ خط کی عبارت سے بالکل واضح نہ تھا کہ لکھنے والا اصل میں کہنا کیا چاہتا ہے"۔

میر نے مصطفے سے یارانہ ختم کر لیا۔ حسنیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ اس نے مصطفے کو سنا دیا۔ مصطفے کو بڑا دھچکا لگا۔ اس نے حسنیٰ سے تعلقات منقطع کر لیے۔ تھوڑے ہی عرصے

بعد میر اور حسنیٰ کا اتحاد بھی باقی نہ رہا۔

بھٹو کے بیٹے ہمارے چھوٹے سے فلیٹ کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنے شایان شان علاقے میں بہت کشادہ اپارٹ منٹ حاصل کر لیا۔ جو لوگ کل تک مصطفےٰ کا دم بھرتے تھے اب ان دونوں کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ انہوں نے خود کو مصطفےٰ سے دور کر لیا۔ اور اپنی سٹرٹیجی آپ مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مہم جوئی کا چرچا ہونے لگا۔ بات ہوائی بندوقوں سے آگے نکل چکی تھی اور اب وہ بیچ بیچ کے ہتھیاروں کی خریداری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلح جدوجہد کے ذریعے ضیا حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ ایسے لوگوں کی فہرستیں تیار کی گئیں۔ جنہیں مارڈالنا مقصود تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اگر دہشت گردی کی کوئی ایسی مہم باقاعدگی سے چلائی جائے جس کا مقصد حکومت کی کلیدی شخصیتوں کو ہلاک کرنا ہو تو اقتدار تک پہنچا جا سکتا ہے۔ کابل میں تربیتی کیمپ قائم کرنے کے فیصلے کی مصطفےٰ کو اطلاع تک نہ دی گئی۔ خیالی قصوں کے نشے میں ڈوبے انہیں دنوں میں الذوالفقار نامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جب بسم اللہ ہی غلط ہو تو آگے چل کر بیڑا غرق ہونا ہی چاہیے تھا۔

مصطفےٰ خوب سمجھتا تھا کہ دہشت کے ذریعے جنرلوں کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش بے سود ثابت ہو گی۔ اسے علم تھا کہ ہمارے عوام سبوتاژ اور سیاسی قتل جیسی حرکتوں کو نفرت کی نظر سے دیکھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ کٹر اقدام پسند الذوالفقار کی طرف کھنچے آئیں گے اور یہ کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے آدمی بہت جلد تنظیم میں سرایت کر جائیں گے۔ اسے ڈر تھا کہ حکومت جوابی جارحانہ کاروائی پر اتر آئے گی جس کے نتیجے کے طور پر سیاسی کارکنوں کو یا تو ختم کر دیا جائے گا یا وہ جیلوں میں سڑتے رہیں گے۔ الذوالفقار کو کچلنے کے بہانے اہل اقتدار کو اپنے تمام مخالفوں کو پکڑنے دھکڑنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ پیپلز پارٹی اتنی منظم نہ تھی کہ اس طرح کی خفیہ تحریک کو سہارا دے سکے۔ اسے یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کے قانون شکن بازو کی سرگرمیوں سے اور کچھ ہو نہ ہو بحالئ جمہوریت کی پُر امن جدوجہد کی رفتار ضرور سست پڑ جائے گی۔ وہ بھٹو برادران کی بے صبری کو سمجھ تو سکتا تھا لیکن اس سے اغماض برتنے کو تیار نہ تھا۔ اب پارٹی پر مجموعی طور پر ایک ہی طرح کی سیاہی تھوپی جا سکے گی یعنی اس میں شامل سبھی لوگ دہشت گرد قرار پائیں گے۔ دہشت کا جواب دہشت سے دیا جائے گا۔ میرا اور شاہنواز کی انتشار پسند سرگرمیوں کی وجہ سے بے گناہوں کی شامت آ جائے گی۔ وہ عذاب سہیں گے۔ جیل جائیں گے اور پھانسی چڑھیں گے۔

مصطفےٰ کو سیاست کے ایک زیادہ سپاٹ اسلوب سے دلچسپی تھی۔ اس نے ملک سے

باہر کی پارٹی کی، جو ابتری کا شکار تھی، از سر نو تنظیم کا آغاز کیا۔ پارٹی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس میں کسی قسم کا نظم وضبط باقی نہ رہا تھا۔ مصطفےٰ نے یورپ کے متعدد ملکوں اور انگلینڈ بھر کا دورہ کیا۔ اس نے بڑے بڑے عام جلسوں سے خطاب کیا اور لوگوں کے نڈھال حوصلوں کو ابھار دیا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر تو وہاں پہ تھیں نہیں کہ ان کا نام سن کر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ ان کی نیابت کا فرض مصطفےٰ نے بطریق احسن انجام دیا۔ ان دونوں کے انگلینڈ آنے تک پیپلز پارٹی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ اور کچھ کر دکھانے کے لیے مچل رہی تھی۔ مصطفےٰ لوگوں کو جوق در جوق جلسہ گاہوں تک لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نعرہ وہ لگاتا۔ اس کی آواز میں آواز لوگ ملاتے۔ اس کام میں وہ ان تھک تھا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر جہاں بھی گئیں۔ انہوں نے جذبات سے سرشار ہجوموں کو اپنا منتظر پایا۔ یہ ساری کامیابی انہیں مصطفےٰ کے تنظیمی جوش وخروش اور ولولہ انگیز خطابت کی بدولت نصیب ہوئی۔

پرانے دوست اور ساتھی ملنے آ جاتے اور گفتگو کا محور ہمیشہ سیاست ہوتی۔ ہمیں رفیع رضا سے ملنے جلنے کے کافی مواقع ملے جو ایک زمانے میں بھٹو صاحب کے خصوصی معاون رہ چکے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ دور حکومت کی کامیابیوں اور حماقتوں پر تفصیل سے بات چیت کرتے، نیویارک سے یوسف بچ آ جاتے جو اقوام متحدہ کے لیے کام کرتے تھے۔ رفیع کے مقابلے میں ان کے مزاج میں زیادہ ٹھہراؤ آ چکا تھا یعنی وہ سوچتے تھے کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب صبر کرنا چاہیے وہ مضطرب بھی نسبتاً کم تھے۔ اور بھٹو صاحب پر انہیں غصہ بھی کم تھا۔ یہ دونوں حضرات بہت ہی نستعلیق ذہن کے مالک تھے اور سیاست کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ میں ان کی فہم وفراست کی بڑی قائل تھی اور ان کی گفتگو سے محظوظ ہوا کرتی تھی۔

ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ جب بھی لندن آتے اہتمام کر کے ہم سے ملتے میں نے دیکھا کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر نامے میں تبدیلیاں آ گئی ہیں اور محسوس کیا کہ بھٹو صاحب کی اصلی پرانی ٹیم کی جگہ ایسے گھٹیا سیاست دانوں نے سنبھال لی ہے جن کے عزائم بے تکے ہیں۔ وہ اس دیوار کے نوشتے کو پڑھ ہی نہ پائے جس کی طرف جلد ہی پیٹھ کر کے انہیں اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی، اور اگر آپ کے پیچھے دیوار ہو اور سامنے دشمن تو لڑنے مرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

سمندر پار کی پیپلز پارٹی اب پراگندہ احساس کی تصویر نہ رہی تھی۔ وہ اب ایک معین شکل اختیار کر کے ایک متعین سمت میں بڑھ رہی تھی۔ مصطفےٰ نے فیصلہ کیا کہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ لوگوں کو دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنا ہو

گا کہ وہ اپنے پابزنجیر قائد کے ساتھ ہیں۔ برطانیہ نے اپنے ہاں مقیم جلاوطنوں کا ہمیشہ لحاظ کیا ہے۔ جو کاروائی پاکستان میں قتل عام کی کھلم کھلا دعوت کے مترادف ہوتی وہ انگلینڈ میں مہذب احتجاج کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ انڈرز سکوئر میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے مظاہرے کے لیے لوگوں کو پکارا گیا۔ بڑا سوال یہ تھا: کیا عوام جوق در جوق آئیں گے؟

وہ آئے۔ وہ آپ سے آپ موج در موج خانہ ساز بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے آئے۔ وہ اس طرح آئے کہ ان کی ٹی شرٹوں پر بڑے بڑے حرفوں میں "بھٹو کو بچاؤ" رقم تھا۔ وہ بریڈ فورڈ اور ساؤتھال سے اور یورپ کے ہر اس کونے سے آئے جہاں تک بھٹو کی داستان پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنی گاڑیوں پر، پیدل چل کر اور ٹیوب ٹرین کے ذریعے آئے۔ وہ متانت کے ساتھ سپیکرز کارنر پر جمع ہو گئے۔ مصطفےٰ کو عام لوگوں پر جو بھروسہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ سب ایک سنگین زیادتی کی تلافی کے لیے مل جل کر مارچ کریں گے۔ وہ اپنے قائد کو پھانسی چڑھنے سے بچانے کے لیے مارچ کریں گے۔

یہ ہنگامہ خیز جلوس، جو بل پر بل کھاتا لندن کے مرکز سے گزرا، اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ عوام نے اس شخص کو بھلایا نہیں ہے۔ جس نے انھیں ظلم اور ناانصافی کے سامنے پُر وقار انداز میں ڈٹے رہنا سکھایا تھا۔ اہل جلوس سفارت خانے کے سامنے اکھٹے ہوئے جہاں انھوں نے دوسرے مقررین کے علاوہ مصطفےٰ، میر اور طارق علی کی آتش ناک تقریریں سنیں۔ ہجوم اطمینان کا یہ احساس لے کر منتشر ہوا کہ ان کی موجودگی نے ان کے سیاسی بیان کو وزنی بنا دیا ہے۔

جنرل مرعوب نہ ہوئے۔ بھٹو صاحب کا بھانجا، بھتیجا طارق اسلام، اپنے ماموں /چچا سے ان کے قتل سے ذرا پہلے جیل جا کر ملا۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ بھٹو اپنے سابقہ وجود کی پھیکی سی پرچھائیں نظر آتے ہیں۔ ان کا وزن نوے پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سوجے ہوئے تھے اور مسوڑھوں کی مزمن خرابی میں، بے توجہی کے باعث، مزید بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہتے تھے۔ کرب کی کیفیت کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ طارق کو محسوس ہوا جیسے اس نے بھٹو صاحب کی بجائے ان کا سایہ دیکھا ہو۔ لیکن سائے کا ذہن اسی طرح فعال تھا۔ بھٹو صاحب نے سیاست پر بات چیت کی اور یہ جاننے کا بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ انھیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میر اور شاہنواز سیاست کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں اور ان کی جان بچانے کے لیے مہم چلا رہے ہیں۔ انھوں نے طارق سے مصطفےٰ کا پوچھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا مصطفےٰ اچھی تقریر کر لیتا ہے۔ جب طارق نے

اثبات میں جواب دیا تو بھٹو صاحب کی شخصیت کا پرانا رنگ عود کر آیا۔ انھوں چہرے پر روکھی سی مسکراہٹ لا کر پوچھا۔ "مجھ سے بہتر نہیں؟" یہ سوال کم اور بیان زیادہ تھا۔

بھٹو صاحب اس وجہ سے الجھن اور اضمحلال کا شکار تھے کہ عوام نے انھیں دی جانے والی سزا پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کی یہ امیدیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں کہ اچانک شورش برپا ہو گی اور آمر کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عوام قید خانے پر دھاوا بول کر انھیں چھڑا کیوں نہیں لیتے۔ عوام کی بے رخی دیکھ کر وہ اداس ہو گئے۔

طارق نے ان سے کہا کہ وہ خود عوام سے اٹھ کھڑے ہونے کو کہیں۔ اس نے بھٹو صاحب کو مطلع کیا کہ پارٹی کی قیادت کسی وجہ سے آگے نہیں آ رہی۔ پارٹی کی قیادت سے کہنا چاہیے کہ وہ عوام کو آواز دے اور اٹھ کھڑے ہونے پر اکسائے۔ بھٹو صاحب کے قتل سے صرف ایک ماہ پیشتر ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کو جیل سے رہا کرایا گیا تھا۔ اس موقع پر ان کی رہائی بھٹو صاحب کے لیے تعجب خیز تھی۔ "کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے منہ میں چوگا دوں؟ انھیں علم نہیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ ممتاز اور حفیظ بک چکے ہیں۔ وہ عوام کو اٹھ کھڑے ہونے کے لیے نہیں کہیں گے۔" طارق بضد رہا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ اگر عوام کی طاقت نے کوئی تدارک نہ کیا تو فوج بدترین حربوں پر اتر آئے گی۔ بھٹو صاحب پیپلزپارٹی کے رہنماؤں کو آزمانے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے طارق سے کہا کہ وہ ان کا پیغام حفیظ تک پہنچا دے۔ اور پیغام یہ تھا کہ عوام سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہوں۔

طارق اپنے ماموں/چچا سے رخصت ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ثابت ہو گی۔ غداری کی ہوا کی شدت کے سامنے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں طارق نے امید کے تنکوں کا سہارا لینا چاہا۔ وہ ڈاکٹر نیازی کو ساتھ لے کر حفیظ کے پاس گیا۔ اس نے غلط وقت چنا تھا۔ گھر کے باہر بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ حفیظ نئی شادی کر رہا تھا۔ وہ گھر سے نکل کر ڈرائیو تک آیا اور طارق سے ملا جس پر بدحواسی طاری تھی۔ پیغام پہنچا دیا گیا۔ حفیظ کی شکل دیکھنے کے لائق ہو گئی "تمھارا مطلب ہے وہ چاہتے کہ ہم عوام سے اٹھ کھڑے ہونے کو کہیں؟" "ہاں" "خوب۔ میں ایسا... ہی کروں گا... فوراً... کل صبح۔" دولھا کے ذہن میں اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ عوام کو کوئی پیغام نہ دیا گیا۔ اس آدمی کے گلے میں جس کی ذات پوری پارٹی پر محیط تھی، پھندا اور تنگ ہو گیا۔

ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ بھٹو کو پھانسی چڑھنے سے پہلے متعدد بار مرنا پڑا۔ جنرل

ضیا نے اس کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ انھیں دوسالہ جیل میں صرف اس لیے رکھا گیا کہ ان کی قوت ارادی جواب دے جائے۔ ان کی تذلیل اور توہین کی گئی۔ ان کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ ایک بریگیڈیر کو مقید رہنما کی کوٹھری کے سامنے والی کوٹھری میں بٹھا دیا گیا۔ اس کا کام صرف بھٹو صاحب کو گالیاں دینا تھا تاکہ وہ غصے سے پاگل ہو جائیں۔ بریگیڈیر کو بھٹو صاحب کی کمزوریوں کا علم تھا۔ اس نے اپنے تمام زبانی حملوں کو انھیں رستے ہوئے زخموں پر مرکوز کر رکھا۔ بھٹو صاحب کی والدہ کو رسوا کرنے کے لیے نہایت ناشائستہ زبان استعمال کی۔ وہ طعنے دیتا رہتا یہاں تک کہ بھٹو صاحب ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ بظاہر کبھی کبھار پاکستان کے سابق وزیر اعظم کو جلال آ جایا کرتا لیکن بیشتر وقت وہ تحمل سے کام لیتے۔ بریگیڈیر ان پر قہقہے لگاتا اور گالیوں کی بوچھاڑ کرتا رہتا۔ فوجی جنرل انھیں نفسیاتی طور پر مفلوج کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

مغرور اور دماغ دار بھٹو صاحب کو ایک مضرِ صحت، کھلا ٹائیلٹ استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا جو تقریباً ان کی کوٹھری کے اندر تھا۔ انھیں اس کی بدبو سہنی پڑتی۔ کسی طرح کا تخلیہ میسر نہ تھا۔ جب وہ ٹائیلٹ استعمال کرتے تو ایک پہرے دار ان کی طرف منہ کیے کھڑا رہتا۔

مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ بھٹو صاحب گو امیر گھرانے کے فرد ہونے کے ناتے نازونعم میں پلے ہیں لیکن مرد بحران ہیں۔ وہ سر نہ جھکائیں گے۔ تذلیل اور تعذیب کی اس انتہائی اور رکھاؤ سے ان کے حوصلے میں دوبارہ جان پڑ جائے گی، ان کی جرات پھر تازہ دم ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ بھٹو صاحب جب دارورسن کا سامنا کریں گے تو خوف کا شائبہ تک ان کے چہرے پر نظر نہ آئے گا۔ وہ تقدیر پرست تھے۔ انھیں تاریخ کی عدالت پر یقین تھا اور یہ اعتماد بھی کہ بالآخر وہ بری ہو کر رہیں گے اور اسی یقین اور اعتماد کے سہارے وہ تختۂ دار تک آپ چل کر جانے کو تیار تھے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔

پاکستان سے آنے والی خبریں وحشت ناک تھیں۔ میر اور شاہنواز کا ملک سے رابطہ قائم تھا۔ جو خبر انھیں ملتی ہم تک پہنچا دیتے۔ اکا دکا افواہیں گشت کرتی رہتیں جن سے ہمارے حوصلے بلند ہو جاتے۔ ہمیں بتایا گیا کہ عالمی رہنماؤں نے ضیا سے کہا ہے کہ وہ رحم دلی سے کام لے۔ ضیا نے انھیں یقین دلایا ہے کہ وہ بھٹو کی جان نہیں لے گا۔

اس کے بعد ہمارے سننے میں آیا کہ بے نظیر کو اپنے والد سے ملانے لے جایا جا

رہا ہے۔ بے نظیر کو بتایا گیا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی۔ جب وہ ملے تو ان کے درمیان میز اور سلاخیں مائل تھیں۔ بے نظیر نے پہرے داروں کی منت کی کہ وہ اسے باپ سے گلے ملنے دیں۔ بھٹو صاحب نے اسے جھڑکا۔ "ان سے کبھی کسی بات کی التجا نہ کرو۔" بے نظیر ان کی پسندیدہ خوشبو "شالیمار" لائی تھی جو انھوں نے لے کر رکھ لی۔ چند کتابیں بھی تھیں۔ بھٹو صاحب طنزیہ انداز میں مسکرائے اور کتابیں بے نظیر کو لوٹا دیں۔ "میں نہیں سمجھتا کہ میرے پاس انھیں ختم کرنے کا وقت ہو گا۔" بے نظیر نے انھیں ایک ریزر دیا۔ وہ انھوں نے لے لیا اور بولے۔ "اچھا ہے۔ میں یہ داڑھی مونڈ ڈالوں گا۔ میں کسی بدبخت ملا کی طرح مرنا نہیں چاہتا"۔ وہ اپنے خالق کے حضور میں پیش ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں اگلی صبح پانچ بجے پھانسی دے دی جائے گی۔

ہم نے بھٹو صاحب کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ان کے نیم جاں بلب دماغ میں کون سے خوف پل رہے تھے؟ کیا ڈراؤنی جگہ بنا ہوا تھا ان کا دماغ جس میں قدم دھرتے جان نکلتی تھی۔ میں اللہ کی پناہ کی طالب ہوئی۔ مصطفیٰ نے اپنا غم بوتل سے غلط کیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ وہی بریگیڈیر، جو انھیں ستاتا رہتا تھا، اندر آیا اس نے بھٹو صاحب کو چند کورے ورق اور قلم دیا۔ انھیں اپنی وصیت قلم بند کرنے سے محروم رکھا جا رہا تھا۔ وہ انھیں ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب تحریراً اپنے گناہوں کا اقرار کریں۔

بھٹو صاحب بیٹھ گئے۔ انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ ان کا ذہن بلاشبہ یادوں سے اٹا پڑا ہو گا۔ وہ ساری کامرانیاں، وہ دل وجان سے فدا ہجوم، وہ مداح سرائیاں۔ وہ سب آخر کہاں غائب ہو گئیں۔؟ یہاں وہ بالکل تنہا تھے۔ ہولناک انداز میں تنہا اور سامنے ایک کورا کاغذ رکھا تھا۔ جو انھیں ترغیب دے رہا تھا کہ سمجھوتا کر لو۔ جان بچا لو جی دار رہنما کو پتہ چل گیا کہ یہ اس کی زندگی کا بہترین لمحہ ہے۔ اس لمحے کو اس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیے۔ اپنی زندگی لٹا دی۔

بریگیڈیر غصے سے بھوت بنا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بھٹو صاحب نے اسے مات دے دی تھی۔ اس نے سزا یافتہ قیدی کے پیٹ میں لات ماری۔ بھٹو صاحب گر پڑے، افسانہ بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی دیو ہیکل شخصیت کی طرح آفاق پر چھا گئے۔ بریگیڈیر اور اس کے قبیل کے لوگوں کے حصے میں مر کر بھی ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ یہاں آ کر حقیقت اور افسانہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ حقائق افسانے سے

عجیب تر ہیں۔ اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا کہ اس رات اصل میں کیا پیش آیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کی لاش کو پھانسی دی گئی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب بھٹو صاحب کو اٹھا کر تختۂ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو انھیں ہوش آ گیا۔ وہ لڑکھڑائے، گر پڑے، اٹھے اور پھر بساط بھر بے خوفی کے ساتھ، جیسے کسی کو خاطر میں نہ لا رہے ہوں، آپ چل کر تختۂ دار تک گئے۔ پارٹی کو اب ایک شہید مل گیا تھا۔ جذبات اور خیالات کو ولولۂ تازہ دینے کے لیے اور کیا چاہیے تھا۔

سی 130 کے نوجوان پائلٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کے سننے میں آیا تھا کہ بھٹو صاحب کو طیارے کے ذریعے لاڑکانہ لے جایا جا رہا ہے۔ یہ 4 اپریل 1979ء کی بات ہے۔ اس نے کیبن میں قدم رکھا تاکہ اس آدمی کو خوش آمدید کہہ سکے جس کا وہ شیدائی تھا۔ اس کی نظر کوبھی کے تابوت پر پڑی جس میں بھٹو صاحب کی میت رکھی تھی۔ نوجوان پائلٹ صدمے کے مارے نڈھال ہو گیا۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی تھوڑی سی جان ضائع نہ ہو گئی ہو۔ وہی سی 130 نو سال بعد بہاولپور کے اوپر پھٹ کر تباہ ہو گیا۔ جلاد جہاز پر سوار تھا۔ اچھوں کا بول بالا اور بروں کا منہ کالا ہو کر رہتا ہے۔ تارا مسیح جس نے پھانسی دی تھی، غائب ہو گیا اور یہی حشر اس کے بیٹے کا ہوا جس نے اس کی جگہ سنبھالی تھی۔ حقیقت کیا ہے؟ اس کا آج بھی کسی کو علم نہیں۔

میر نے صبح پانچ بجے فون کر کے ہمیں خبر سنائی۔ مصطفٰے نے ہمیں جگا دیا۔ اس کا ردعمل دھیما دھیما تھا۔ ایسے مرد کی طرف سے، جسے زاروقطار رونے کی عادت تھی بے زیادہ جذباتی ردعمل کی توقع تھی۔ اس نے اپنے مرحوم قائد کے لیے کوئی آنسو نہ بہائے۔ مصطفٰے نے میر کے فلیٹ کا رستہ لیا۔ وہاں میز پر شواز ریگل کی بوتل رکھی تھی۔ پریس اور دوسرے لوگ جس وقت رہنماؤں کا انتظار کر رہے تھے وہ شراب پینے میں مشغول تھے۔ شہادت کو مردے کے لیے رت جگے کا رنگ دیا جا رہا تھا۔

بھٹو صاحب کو تن تنہا تختۂ دار کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں جو حمایت کبھی حاصل تھی اس سے وہ اپنے ہی اعمال کی بدولت ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انھوں نے کیا یہ کہ اپنے صف اول کے تمام رہنماؤں کو آپس میں لڑاتے رہے۔ ہر شخص اور اس کی بیوی کے بارے میں ان کے پاس فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں سے اتحاد کر لیا جو ان کے جانی دشمن تھے اور حقیقی وفاداری کی قدر کرنے میں ناکام رہے۔ اپنا فرقۂ قیادت اپنے ہی خاندان کو سونپ کر پارٹی کو زک پہنچائی۔ یہ غلط فیصلہ تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹی میں اتنی سیاسی فراست نہ تھی۔ کہ وہ ان کی جان بچانے کے لیے جدوجہد کر سکتیں۔ ان دونوں کو پارٹی کی کوئی سمجھ نہ تھی۔ ان میں تام کو لچک نہ تھی۔ اور جو برے آثار نظر آ

رہے تھے وہ ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہیں۔ اس نسل کے دوران مصطفٰے، حفیظ، ممتاز جتوئی اور کوثر نیازی جیسے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ بھٹو صاحب کے سحر سے آزاد ہو چکے تھے۔ بھٹو صاحب کی حقیقت ان پر عیاں ہو چکی تھی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایسے فیصلہ کن موقع پر پارٹی کی باگ دوڑ ایک نحیف و نزار خاتون اور اس کی سیاسی طور پر نابالغ بیٹی کو تھما کر انھیں دھوکا دیا گیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی حیثیت گھٹا دی گئی، ان کے ذریعے صرف اپنا مطلب حاصل کیا گیا۔ اگر ان جیالوں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے دیا جاتا تو بھٹو صاحب کو بچایا جا سکتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاست ممکنات کے فن کا نام ہے یعنی یہ جاننے کا کہ کیا ممکن ہے، کیا ممکن نہیں۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر کسی معجزے کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ کوئی معجزہ سرے سے رونما ہی نہ ہوا۔

بھٹو صاحب اس وہم کے مارے ہوئے تھے کہ ان کی دوسری صف کی قیادت پارٹی کو ہائی جیک کر لے گی اور ان کا پتا کاٹ دے گی۔ معاملہ جان بچانے کا ہو یا پارٹی کو بچانے کا، انھیں اپنے اہل خانہ کے سوا کسی پر اعتبار نہ تھا۔

رہنماؤں نے اس فیصلے کو رکوانا چاہا مگر ان کی ایک نہ چلی اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ بھٹو صاحب کی خاطر خطرہ مول لینے کی صورت میں فوج کا سارا نزلہ ان پر گرے گا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر کی ہدایات کے تحت کام کرنا قطعی طور پر ناممکن تھا کیوں کہ بھٹو صاحب خواتین کو ان کی طرف سے بدظن کر چکے تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ سب کچھ بھٹو خواتین کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ کوئی متبادل قدم اٹھا کر خطرہ مول لینے کا حاصل ہی کیا تھا۔

بھٹو صاحب کی موت سے عوام کی قوت ارادی اجتماعی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ملک میں ہر طرف خوف کی فضا نظر آنے لگی۔ ہم میں سے جو لوگ اس ناقابل تصور بات کے بارے میں سوچتے رہتے تھے بے یقینی اور پشیمانی کے عالم میں سن ہو کر رہ گئے۔ پارٹی کے سرگرم کارکنوں کو تسلی دینا ناممکن تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے صف اول کے رہنماؤں نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ ان کی توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ غلطی کس سے ہوئی، کیسے ہوئی۔ ان کے عظیم قائد کو تختۂ دار تک پہنچنے کیوں دیا گیا؟ کیا ان سیاسی بالشتیوں کی نظر میں، جو بھٹو صاحب کی باقیات تھے، زندہ بھٹو کی بہ نسبت مردہ بھٹو زیادہ کار آمد تھا؟ لوگ چاہتے تھے کہ جو قصور وار ہیں انھیں نہ بخشا جائے۔ لوگ محاسبے کا تقاضا کر رہے تھے۔ وہ یہ تاویل قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ ضیا ضرورت سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا اور دنیا بھر کو قول دینے کے بعد اپنے وعدے سے پھر گیا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ

قیادت نے ایسے آدمی پر اعتبار کیا ہی کیوں جو اپنا ارادہ بھی اپنی رودی کی طرح گھڑی گھڑی بدلنے کا عادی تھا؟ ان کے قہر وغضب کا نشانہ حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو بنے۔ قیادت کا لبادہ بیگم بھٹو اور بے نظیر کے حصے میں آیا۔ یہی وہ آخری دو ہستیاں تھیں جنہوں نے بھٹو صاحب کو زندہ دیکھا تھا اور جن کے دل میں بھٹو صاحب کا آخری وصیت نامہ محفوظ تھا۔ جنوبی ایشیا میں ایک اور حکمراں خاندان نے جنم لیا۔ اس خاندان کی جڑیں جس مٹی میں پیوست تھیں، وہ ایک شہید کے لہو میں نہائی ہوئی تھی۔ اس لہو کو مقدس مانا گیا۔ اسے متبرک گردانا گیا۔۔ مسابقت کی سیاست کی جگہ انتقام کی سیاست نے لے لی۔ اب ایسا کھیل شروع ہوا جس میں جمع تفریق کا حاصل صفر تھا۔

جلاوطنی کے دنوں میں مالی طور پر ہمارا یہ حال تھا کہ کبھی رنج کبھی گنج۔ اکثر وبیشتر ہم کنگال رہتے اور رشتے داروں سے مانگ تانگ کر کام چلاتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پچاس پاؤنڈ کا نوٹ ہاتھ آ جاتا تو لگتا کہ عیش ہو گئے ہیں۔ بی سی سی آئی کے آغا حسن عابدی بڑی باقاعدگی سے ہر مہینے مصطفےٰ کو دو ہزار پاؤنڈ بھیجا کرتے تھے۔ اس ترسیل کا انتظام جتوئی صاحب نے کیا تھا۔ مصطفےٰ اپنی مالی صورت حال پر شاذونادر ہی تبادلۂ خیال کرتا۔ میں ان معاملات میں دخل نہ دیتی۔ میرے دیکھنے میں صرف اتنا آیا کہ ہماری آمدنی اور اخراجات میں توازن کی شدید کمی ہے۔

ایک واقعہ خاص طور پر میرے تجسس کو گدگداتا ہے۔ میں اب تک اس اسرار کی تہ تک نہیں پہنچ پائی۔

ایک بار کوئی پچیس برس کا ایک نوجوان مصطفےٰ سے ملنے آیا۔ میں کین زنگٹن میں علی محمود کے فلیٹ میں اکیلی تھی۔ نوجوان نے کہا کہ وہ مظفر گڑھ سے آیا ہے اور مصطفےٰ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مصطفےٰ کو واپس آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ کہنے لگا کہ میں انتظار کروں گا۔

جس طرح بعض لوگوں کو دیکھتے ہی کراہت سی محسوس ہوتی ہے مجھے وہ نوجوان اسی طرح برا لگا۔ مصطفےٰ سے جس قسم کے لوگ ملنے آیا کرتے تھے یہ کسی طرح ان سے مختلف تھا وہ بدتمیزی سے بات کرتا تھا اور مجھے کچھ اجڈ معلوم ہوا۔ اس کے رویے سے لگتا تھا جیسے وہ مصطفےٰ کا احسان اٹھانے کے بجائے الٹا اس پر کوئی احسان کرنے آیا ہے۔ میں نے اسے انتظار کرنے دیا۔ میں مزید باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس نہ رکی اس نے مجھے منغض کر دیا تھا۔

مصطفےٰ لوٹا تو میں نے نوجوان کا ذکر کیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ وہ دونوں گھنٹے بھر ساتھ رہے۔ اس کے بعد مصطفےٰ نے آ کر مجھ سے دو سو پاؤنڈ مانگے۔ میں

حیران ہوئی۔ لوگوں میں رقمیں بانٹتے پھرنا میرے میاں کا مزاج نہیں۔ اس طرح کی حرکت وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب اسے بھی بدلے میں کچھ ملنے کی امید ہو۔ میں نے اس بارے میں کچھ پوچھ گچھ کی۔ "یہ بیچارہ نوجوان مظفر گڑھ سے چل کر یہاں مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔" دس دن بعد اسی نوجوان کا ہوائی اڈے سے فون آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اسے برطانوی حکام نے ہیروئن رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ کہنے لگا کہ کھر صاحب سے بات کرنی ضروری ہے۔ "کھر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو میں ان سے تمہاری بات کرادوں گی۔ مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔" میں نے نوجوان سے کہا کہ گھبرائے نہیں اور اس کا بتایا ہوا ٹیلی فون نمبر لکھ لیا۔

نوجوان سے بات کرنے پر مصطفےٰ مجھ پر سخت ناراض ہوا۔ کہنے لگا کہ میری حماقت کی وجہ سے وہ بھی اس مقدمے میں پھنس جائے گا۔ "صرف اتنا کہنا چاہیے تھا کہ تمہیں پتہ نہیں وہ کون ہے۔ تم بہت باتیں کرتی ہو۔"

اس کے کہنے کی کوئی تک میری سمجھ میں نہ آئی۔ پچھلی بار تو مصطفےٰ کو لڑکے پر بڑا رحم آ رہا تھا۔ اس کی بات میرے پلے نہ پڑی۔ "میرا خیال تھا۔۔۔ کہ تم ہوتے تو اس کی مدد کرنا چاہتے۔ تم نے اسے خاصی اہمیت دی تھی۔ تم گھنٹے بھر اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ مجھے کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ اب تم اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ خصوصاً اب جب وہ مشکل میں پھنس چکا ہے۔ شاید تم اس کی مدد کر سکو"

کچھ دیر غور وفکر کے بعد فیصلہ کر لیا گیا۔ مصطفےٰ نے نمبر ڈائل کیا۔ فون پر متعلقہ افسر سے بات کی جس نے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ نوجوان اعلیٰ قسم کی ہیروئن سمگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اسے گرفتار کر لیا گیا تو اس نے پولیس سے درخواست کی کہ مصطفےٰ سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ اسے دعویٰ تھا کہ مصطفےٰ اس کا دوست ہے۔ مصطفےٰ نے کہا کہ اسے لڑکے سے بات کرنے دی جائے۔ "تم نے یہ احمقانہ حرکت کس لیے کی؟ دیکھو، اب تم کیسے جنجال میں پھنس گئے ہو۔"

اس نے فون اچانک بند کر دیا اور ٹہلنے لگا۔ وہ بہت نروس اور پریشان تھا۔ مصطفےٰ کے نام سمن آیا۔ اسے عدالت نے گواہ کے طور پر طلب کر لیا۔ وہ عدالت میں پیش ہوا۔ عدالت میں نوجوان نے کہا کہ اس کے بعض دوستوں کو سابوتاژ کی ایک کارروائی میں ملوث کر دیا گیا ہے۔ فوجی آمر کے خلاف احتجاج کے طور پر ایک گاڑی پٹڑی سے اتار دی گئی۔ یہ ایک سیاسی عمل تھا۔ توڑ پھوڑ کے اس عمل کی تفصیلات پاکستانی پریس میں چھپیں۔ سابوتاژ کرنے والوں کی تلاش شروع ہوئی تو اس کے دوست بھی پھنس گئے اور انہیں جھوٹے الزامات کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ حکام نے وعدہ کیا کہ اس کے

دوستوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ نوجوان ہیروئن لے کر لندن جائے اور مصطفےٰ کے گھر تک رسائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیروئن گھر میں کہیں رکھ دے۔ "میں ہیروئن مجبوراً لے کر آیا تھا۔ مارشل لا حکومت چاہتی تھی کہ میں اسے کھر صاحب کے گھر میں کہیں چھپادوں تاکہ وہ مفت میں سمگلنگ کے جرم میں پکڑے جائیں"۔

یہ کہانی اخباروں کے لیے بہت موزوں تھی۔ ہر اخبار میں خبر چھپی کہ کس طرح ایک بے گناہ سیاست دان کو بدنام کرنے کی مذموم سازش ناکام بنا دی گئی ہے۔ مصطفےٰ کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ اسے نشانہ بننے میں مزہ آتا تھا کہ اس طرح ایک تو اس کی وقعت کی تصدیق ہوتی تھی، دوسرے پتہ چلتا تھا کہ جنرل اس کے ہاتھوں کتنے دق آ چکے ہیں۔ اس نے جنرل ضیا کی گھٹیا چالوں کے بارے میں اخباری بیانات جاری کرنے پر خاصا وقت صرف کیا اور کہا کہ وہ جنرلوں کے لیے خطرہ بن چکا ہے اور وہ سیاست کے میدان سے اس کا قصہ پاک کرنے کے لیے کوئی نہایت گری ہوئی حرکت بھی کر سکتے ہیں۔

نوجوان کے بیان پر مجھے ایسی شہادت کا گمان ہوا جو اسے اچھی طرح رٹا دی گئی ہو۔ جس واقعے سے مصطفےٰ کے سیاسی کیریر کو سخت دھچکا لگنا چاہیے تھا وہ اس سے اپنی ساکھ بنانے میں مصروف تھا۔ اس کا انداز مجھے سراسر بناوٹی لگا۔ یہ عین اسی طرح کا بیان تھا جو مصطفےٰ سخت مشکل میں پھنس جانے پر گھڑنے کا ماہر تھا۔

میں بیٹھی حیران ہوتی رہی کہ پاکستان میں دو سو پاؤنڈ سے کتنی ہیروئن خریدی جا سکتی ہے اور وہ لندن کے بازاروں میں کتنے کی بکے گی۔؟

اس نوجوان کو خط لکھنے کا بڑا ہوکا تھا۔ اس کے خطوں میں رونے جھینکنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ مصطفےٰ کو لکھتا کہ اس کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ انہیں کوئی رقم بھجوائی جائے۔ درخواست کرتا کہ مصطفےٰ بیچ میں پڑ کر اسے رہائی دلا دے۔ اس نے متعدد فون نمبر دیے اور مصطفےٰ کی منت کی کہ اس سے آ کر مل تو لیں۔

اس کی منت سماجت میرے شوہر نے اس کان سن کے اس کان اڑا دی۔ جونہی جج نے فیصلہ سنایا نوجوان کو بھلا دیا گیا۔ آخر وہ جنرلوں کے لیے منشیات ہی تو لیے پھر رہا تھا۔ یا بات کچھ اور تھی؟ ایسا لگا جیسے اس میں اور کتوں، کنیزوں یا کبوتروں میں کوئی فرق نہیں۔

ادھر مصطفےٰ تو بیرون ملک پیپلز پارٹی کے احیا کے لیے کام کر رہا تھا ادھر بیگم بھٹو نے ان لوگوں سے، جو اب تک اس کے شوہر کے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے، اپنے اختلافات رفع دفع کرنا شروع کر دیے۔ جنرل ضیاء نے سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا

دی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی نقل و حرکت کو ان کے متعلقہ صوبوں تک محدود کر کے اس نے ملک کو مزید تقسیم کر دیا۔

نہایت صبر آزما حالت میں، بڑی رازداری برتتے ہوئے، مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ولی خاں، اصغر خاں، نوابزادہ نصر اللہ، ملک قاسم، خواجہ خیر الدین، غوث بخش بزنجو اور معراج محمد خاں بیگم بھٹو سے ملے۔ یہ سب رہنما اس پاکستانی قومی اتحاد کے روح رواں تھے جس نے بھٹو صاحب کی حکومت کو الٹ دیا تھا اور جس کے نتیجے میں مارشل لا نافذ ہوا تھا۔ یہ سیاست دان ضیا حکومت کی وعدہ شکنیوں کی وجہ سے روٹھے ہوئے تھے۔ جنرل ضیا کے نوے دن طول کھینچ کر چار لمبے برسوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ تحریک بحالی جمہوریت کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ آمر، جس نے بڑی چابک دستی سے اپنے مخالفین میں تفرقہ ڈال رکھا تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن قسمت اس کا ساتھ دیتی رہی۔

پی آئی اے کے ایک طیارے کو کراچی سے اغوا کر کے کابل لے جایا گیا۔ طارق رحیم نامی ایک مسافر کو اغوائیوں نے گولی مار کر باہر تارمیک پر پھینک دیا۔ میر مرتضےٰ جو کابل میں تھا، شامل ہو گیا۔ نہ تو اسے علم تھا کہ اغوا میں سلیم اللہ ٹیپو کا بھی ہاتھ ہے نہ اس سازش سے کوئی دور کا بھی واسطہ تھا۔ لیکن یہ موقع اچھا تھا۔ اتنا اچھا کہ وہ اسے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اغوائی جنرل ضیا کے قید خانوں سے کوئی چالیس کے قریب سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میر نے اغوائیوں سے ملاقات کی اور الذوالفقار نے اغوا کی ذمے داری قبول کر لی۔ ہائی جیکنگ اتنے دن جاری رہی کہ پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ فوجی حکومت کو جھکنا پڑا۔ اس نے قیدی رہا کر دیے۔ یہ تاریخ کے سب سے ہوشربا اور کامیاب ترین اغواؤں میں سے ایک تھا۔ جیت ہو گئی لیکن چند روزہ ثابت ہوئی۔

جنرل ضیا نے بڑی پھرتی سے جوابی کارروائی کی۔ الذوالفقار کو بہانہ بنا کر دہشت کا بازار دوبارہ گرم کر دیا گیا۔ پاکستان بھر میں چھاپے مارے گئے۔ اور ہر اس شخص کو پکڑ لیا گیا جس کا پیپلز پارٹی کے ترنگے جھنڈے سے دور کا بھی واسطہ تھا۔ ہزاروں کو جیل ہوئی، بہت سوں نے کوڑے کھائے اور جسمانی صعوبتیں برداشت کیں اور کئی نہایت نفیس طبع نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ناقابل یقین واقعے پیش آتے رہے۔ "کیا تم کمیونسٹ ہو؟" نوجوان فوجی افسر نے ایک ان پڑھ مگر سرگرم سیاسی کارکن سے پوچھا۔ "نہیں کمیونسٹ دشمن ہوں، جناب" "مجھے پرواہ نہیں کہ تم کس قسم کے کمیونسٹ ہو۔ اسے حوالات میں بند کر دو"۔

بونس کے طور پر ضیا نے اغوا ہونے والے طیارے کے مسافروں کو سرکاری خرچ پر ہوائی جہاز سے مکے بھجوایا تاکہ وہ عمرہ ادا کر سکیں۔ جس ابتلا سے مسافر گزرے تھے اس کی یادوں کو انھیں کی زبانی ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیلی وژن والے اپنے کیمرے لے کر موقع پر موجود تھے۔ جنرل ضیاء کے ہاتھ ایسا ڈنڈا آ گیا تھا جسے وہ پیپلز پارٹی پر برسا سکتا تھا۔ اسے دہشت گردوں کی پارٹی قرار دے دیا گیا۔ اس بات کی ضیا کو کوئی پروا نہ تھی کہ خود اس نے پوری قوم کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔

اغوا کے لیے جو وقت چنا گیا تھا اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی آئی ہیں۔ اس سے زیادہ موزوں وقت خیال میں نہیں آ سکتا۔ یہ واقعہ ٹھیک اس وقت پیش آیا جب تحریک بحالی جمہوریت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک غیر موثر ہو کر رہ گئی۔ جو تجزیہ نگار تاریخ کا شعور رکھتے ہیں انھوں نے یاد کیا کہ 1970ء میں کس طرح "گنگا" نامی بھارتی جہاز کو اغوا کر کے پاکستان پہنچا دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے خود ہوائی اڈے جا کر طیارے پر قبضہ کرنے والے کشمیری حریت پسندوں کی پیٹھ تھپکی تھی۔ بہت برسوں بعد انکشاف ہوا کہ یہ اغوا تو "را" کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اغوا کو بہانہ بنا کر بھارت کے اوپر سے گزر کر مشرقی پاکستان جانے والی پروازوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اس ایک ہی بے رحمانہ ضرب سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ گیارہ برس بعد میر مرتضےٰ نے، ہوش کے بجائے جوش کے زیر اثر آ کر اپنے والد کی تقلید کی۔ کیا یہ چھوٹا سا ڈراما خود ضیا نے رچایا تھا؟ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

جس وقت اغوا کی خبر آئی تو ہم کار میں تھے۔ میں نے خوش ہو کر مصطفےٰ کی طرف دیکھا بالآخر کسی نے کچھ کیا تو ہے۔ مصطفےٰ پر کوئی رعب نہ پڑا۔ "یہ غلط کام ہوا ہے۔ اس سے بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ بڑے پیمانے پر مخالفین کی تلاش شروع ہو گی۔ پارٹی کے جان نثار کٹر کارکنوں کو پکڑ لیا جائے گا۔ خدا کرے اس اغوا سے میر اور شاہنواز کا کوئی تعلق نہ ہو۔"

بے نظیر کو پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لیے شروع ہونے والی جدوجہد میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد لندن آئی۔ اسے ایک بہت ہی روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا تھا اور اب وہ اپنے والد کی سیاسی جماعت کی رہنما بن گئی تھی۔ وہ خود کو اپنے نئے کردار کے مطابق ڈھالنے میں مصروف تھی۔ پیپلز پارٹی کے پرانے کارکن بھی ایک نوجوان لڑکی کے زیر قیادت کام کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔ بے نظیر کے بارے میں ان کے دل میں کچھ شبہات تھے۔ وہ ابھی

تحمل کر اس کے ساتھ نہ تھے۔ وہ بے نظیر کو اس لیے تو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے کہ وہ بھٹو کی بیٹی ہے۔ لیکن انھیں کچھ زیادہ یقین نہیں تھا کہ وہ اصل میں کیا ہے۔

ان دنوں انگلینڈ میں صف اول کے رہنما مصطفےٰ اور حفیظ پیرزادہ تھے بے نظیر کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں ان کے جذبات ملے جلے تھے۔ مصطفےٰ نے بے نظیر کو چھوٹی بچی کے روپ میں دیکھا تھا اور وہ انھیں "انکل" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ ابھی بے نظیر کو سیاسی طور پر باشعور ہوتے دیر لگنی تھی اور ناپختگی سے پختگی تک کا یہ سفر خاصا اذیت ناک ثابت ہونے والا تھا۔ مصطفےٰ ہوائی اڈے پر لینے تو ننھی "بچی" کو گئے لیکن وہاں ملاقات کس سے ہوئی اپنی پارٹی کی شریک چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو سے۔

بے نظیر نے ہوائی اڈے پر حفیظ اور مصطفےٰ کا خاصا احترام کیا۔ جب اس نے بی بی سی سے گفتگو کی اور ہوا کی لہروں نے اس کی باتیں دنیا بھر میں پہنچائیں۔ تو وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہنی مون کی مدت بہت تھوڑی رہی اور وہ کچھ ایسا خوشگوار بھی ثابت نہ ہوا۔

بے نظیر کے گرد سیاست دانوں کی ایک نئی نسل نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اپنے والد کے ہم عصروں کی بہ نسبت وہ اپنے دوستوں، سہیلیوں، پرستاروں اور رشتے داروں کی چیدہ منڈلی میں زیادہ خوش رہتی تھی۔ والد کے ہم عصروں کے بارے میں وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس کا بھٹو صاحب سے موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ اس نے خود کو ان تمام لوگوں سے دور کر لیا جو پیپلز پارٹی کے پرانے رکن تھے۔ اس کی کچن کابینہ ان لوگوں پر مشتمل تھی: ڈاکٹر نیازی، دانتوں کا معالج جو اب اس کا مشیر خاص، جام صادق علی، یاسمین نیازی، طارق اسلام جو اس کا کزن تھا، اور بہجت جو اس کی بچی اماں تھی۔

مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ بے نظیر کو اپنی تعریف سننے میں زیادہ مزہ آتا ہے اور یہ پسند نہ تھا کہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ کچن کابینہ چاہتی تھی کہ پرانے راہنماؤں کو بے نظیر سے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ کابینہ کے ارکان اسے مصطفےٰ حفیظ اور ممتاز کے خلاف ورغلاتے رہے۔ گپ شپ سے بے نظیر کا دل بہلانا ان کا کام تھا۔ وہ اسے غلط اطلاعات فراہم کرتے رہتے۔ تاکہ وہ بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھی چین کی بنسی بجاتی رہے۔ حقائق اس کے علم میں نہ آ سکیں۔ انھوں نے بے نظیر سے کہا کہ مصطفےٰ جیسے لوگوں پر تکیہ نہ کیا جائے جن کے اپنے عزائم ہیں اور جنھیں پارٹی کی قیادت کرنے کے دعوے بھی ہیں۔ انھوں نے خبردار کیا کہ اگر اس نے ان مکار سیاست دانوں کا سہارا لیا تو وہ اسے دھکا دے کر پارٹی کو ہائی جیک کر لیں گے۔ جنگل کی آگ کی طرح تیزی سے پھیلنے والی ان افواہوں کو ہوا دینے میں بھی ان کا ہاتھ تھا کہ حفیظ، جتوئی اور

مصطفےٰ نے اس کے والد سے غداری کی تھی اور یہ کہ مصطفےٰ پاکستان سے مشکوک انداز میں روانہ ہوا تھا۔

بے نظیر پر ان باتوں کا اثر ہونا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ سے پرانے وفاداروں (یا بے وفاؤں) کی طرف سے چوکنی رہتی تھی۔ اس کے یہ جو انکل تھے انھیں فالتو کہنا تو ابھی قبل از وقت تھا لیکن اس نے ٹھان لی کہ ان سے دب کر نہیں رہے گی۔

مجھ سے مصطفےٰ کی جو بات چیت ہوتی رہتی تھی اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بے نظیر کو موقع دینے پر آمادہ تھا۔ اس کی انگلینڈ آمد کے وقت وہ اسے اپنی قائد کے طور پر قبول کرنے میں بالکل مخلص تھا وہ سینیئر سیاسی مدبر کا کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا اور امید رکھتا تھا کہ بے نظیر اُس کی سیاسی فراست سے استفادہ کرے گی۔ انھیں پتہ تھا کہ اب وہ اس واحد سیاسی جماعت کی سربراہ ہے جو ضیا کو اقتدار سے ہٹانے کی تحریک کے ہراول کا کام کر سکتی ہے۔ لیکن بے نظیر کے رویے سے مصطفےٰ کے خلوص پر اوس پڑ گئی۔

مرکزی کمیٹی کے ہر اجلاس سے مصطفےٰ بے نظیر سے پہلے سے بھی زیادہ بددل اور مایوس ہو کر لوٹتا۔ پرانی یادوں نے پھر زور باندھا اور انھیں رہ رہ کر وہ اجلاس یاد آنے لگے جن کی صدارت بھٹو صاحب کرتے تھے۔ "جب ہم مرکزی کمیٹی کے کسی اجلاس میں شرکت کرتے تو ہمارے درمیان سنجیدہ بحث مباحثہ ہوتا۔ بتدریج کوئی سٹریٹجی ترتیب دی جاتی۔ ہم قابل عمل فارمولے تجویز کرتے۔ مسائل کو نمٹاتے۔ نہ کبھی لاحاصل بحثیں ہوتیں نہ کبھی ساری کاروائی سے کسی زیر بحث مسئلے کو ٹرخانا مقصود ہوتا۔ ہم اتنا کچھ سیکھتے۔ ہر اجلاس عظیم ذہنوں کے ٹکراؤ کے مانند ہوتا۔ فطین ذہنوں کا ٹکراؤ۔ بھٹو صاحب یکے بعد دیگرے ہم سے اس طرح کام لیتے، کسی کو بڑھاتے کسی کو گھٹاتے، کہ سماں بندھ جاتا۔ ہم بہترین کارکردگی کا ثبوت دیتے۔ جس ٹیم کو بھٹو صاحب نے اپنے گرد جمع کر رکھا تھا اس کے مقابلے میں پنکی تو انیس برس سے کم عمر کی الیون کی قیادت کر رہی ہے۔ طبیعت کو اس قدر الجھن ہوتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جام صاحب ہو یا نوجوان مرتضےٰ جتوئی یا وہ بریگیڈیئر عثمان یا ڈاکٹر نیازی، ان جیسے لوگوں سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ ہر بات مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ حیرت ہی کیا جو ضیا آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس طرح حزب اختلاف ہو تو وہ سو سال تک حکومت کر سکتا ہے۔ ایکشن کا کوئی منصوبہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہر اجلاس اس فیصلے پر ختم ہوتا ہے کہ شورش میں شدت پیدا کی جائے۔ لیکن کس طرح؟" یہ شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ "ضیا کے پاس چھ مہینے اور ہیں" والے مشہور نظریے کو بالائے طاق رکھنے کی نوبت آئی۔

ایک مرتبہ مصطفےٰ نے بے نظیر سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ اجلاس میں شریک ہونے سے پہلے اُس نے ممتاز اور حفیظ سے مشورہ کیا اور ایک اہم مسئلے پر ان کی حمایت چاہی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پیپلز پارٹی الذوالفقار کے بارے میں کیا موقف اختیار کرے۔ مصطفےٰ کا استدلال تھا کہ الذوالفقار پارٹی پر بوجھ بن گئی ہے اور جنرل ضیا اس سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ پارٹی اپنے دہشت پسند بازو سے ● کو دُور کر لے۔ اس سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہ حساس معاملہ تھا لیکن مصطفےٰ محسوس کرتا تھا کہ اسے سلجھایا جانا چاہیے۔ حفیظ اور ممتاز کی ہمت نہ ہوئی کہ مصطفےٰ کا ساتھ دیں۔ مصطفےٰ نے اکیلے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اُس نے کمیٹی کو بتایا کہ اُس کے خیال میں بھٹو کے صاحبزادگان اپنا رومانی مہم جوئی کا شوق پورا کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا کہ پارٹی کی اتنی بساط نہیں کہ فوجی جنرلوں سے ٹکر لے سکے۔ "پیپلز پارٹی کو الذوالفقار کے بارے میں کوئی واضح بیان جاری کرنا ہو گا۔ ہم محض اس بنا پر ان کے جرائم اپنے سر نہیں لے سکتے۔ کہ ہمارے ان سے مراسم ہیں یا رشتے داری ہے۔ تمہارے بھائی کی جلد بازی کی وجہ سے ہم اپنے پکے اور ثابت قدم کارکنوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں"۔

بے نظیر بپھر گئی۔ پارٹی کی شریک چیئرپرسن کے بجائے وہ اچانک میر اور شاہنواز کی بہن بن بیٹھی۔ "میں اجازت نہیں دوں گی کہ میر مرتضےٰ اور شاہنواز بھٹو کا ذکر اس ہتک آمیز انداز میں کیا جائے۔" مصطفےٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس مسئلے پر تمہیں بات چیت کرنی ہی ہو گی۔ تمہاری پسند ناپسند یہاں نہیں چلے گی۔ اس بات کا ہماری پارٹی سے بڑا گہرا سروکار ہے۔ ہمیں اعلان کرنا پڑے گا کہ ہمارا دہشت پسندی سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔" بے نظیر کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگی۔ اور آنسو بہاتی ہوئی اٹھ کر اجلاس سے بھاگ گئی۔

جام صادق اور حفیظ نے اصرار کیا کہ مصطفےٰ جا کر بے نظیر سے صلح صفائی کر لیں۔ انھوں نے کہا کہ "بے نظیر کے ساتھ یہ سمجھ کر پیش آنا چاہیے کہ وہ اڑیل لڑکی ہے جو اپنی تردید میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ مصطفےٰ نے ان کی بات مان لی۔ انھوں نے بیڈروم میں جا کر بے نظیر سے صلح جوانداز میں گفتگو کی۔ مصطفےٰ وضاحت کرتا رہا، وہ شکایت کرتی رہی۔ "آپ لوگ ہر وقت مجھے کونے میں دھکیلتے رہتے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس پر اعتبار کروں، کس پر اعتبار نہ کروں۔ آپ لوگوں کے طرزعمل کی وجہ سے مجھے اتنی مشکل پیش آ رہی ہے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان سب معاملات سے کیسے نمٹا جائے۔"

مصطفےٰ نے وضاحت کی کہ سیاست میں اختلاف رائے کو اپنی ہتک نہیں سمجھنا

چاہیے۔ "یہ سیاست ہے۔ تمھیں یہ باتیں سمجھنی ہوں گی۔ تم ایسے بہت سے لوگوں سے ملو گی۔ جو تم سے اختلاف کریں گے۔ ہر بار تم یوں بچوں کی طرح روٹھ کر فیل نہیں ہو سکتیں۔ اپنے جذبات پر ذرا قابو پاؤ اور زیادہ استقامت کا ثبوت دو"

اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ بے نظیر نے صدارت سنبھالی بہت جلد مصطفےٰ نے دوبارہ نکتہ چینی شروع کر دی۔ بے نظیر اٹھی اور آنسو پینے کی کوشش کرتی ہوئی دوڑ کر اپنے بیڈروم کے تخلیے میں چلی گئی۔ وہ بہت ہی حساس اور پریشان تھی۔ اسے اپنے پر اعتماد نہ تھا۔ شریک چیئرپرسن کے رو بیٹھنے کی کہانی ہر طرف کسی لطیفے کی طرح مشہور ہو گئی۔ جب بھی اس کی کسی کاروائی یا پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا پیپلز پارٹی کی قائد کے آنسو نکل آتے۔

جس منصبے کا اسے سامنا تھا وہ تھا بھی بے کراں۔ وہ نوجوان تھی، ناتجربہ کار تھی، اس کے باپ کو ناحق پھانسی دے دی گئی تھی، قید میں رہ چکی تھی۔ بیک وقت مارشل لاء، حزب اختلاف کے سرکھپ رہنماؤں سے اور خود اپنے والد کی پارٹی کے رہنماؤں سے چومکھی لڑ رہی تھی۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ ترس کھا کر اسے تھوڑی سی مہلت ہی دے دیتا۔

بے نظیر کا چڑچڑاپن بڑھتا گیا۔ وہ ممتاز، حفیظ اور مصطفےٰ کی پہنچ سے باہر ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ تازہ پر پرزے نکالنے والی افسر شاہی کو اپنے آگے حصار بنا کر کھڑا کر لیا اور خود اس کی آڑ میں چھپ گئی۔

مصطفےٰ کو اب بے نظیر سے ملنے کے لیے پہلے سے وقت لینا پڑتا۔ سرخ فیتے کی وجہ سے بعض نہایت اہم فیصلے بروقت نہ ہو سکے۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ اس کی سبکی کی جا رہی ہے اُسے ڈاکٹر نیازی یا بشیر ریاض یا یزدانی یا ناہید خان کی وساطت سے اپائنٹمنٹ لینا برا لگتا تھا۔ ان لوگوں نے بھانپ لیا کہ مصطفےٰ کے دل میں غبار آ چکا ہے اور مصطفےٰ کی خیرہ سری اور پارٹی میں اس کے عزائم کے بارے میں بے نظیر کے کان بھرنے لگے۔ ہفتوں گزر جاتے۔ تب کہیں جا کر ان کی ملاقات کا بندوبست ہوتا اور ملاقات بھی ایسی جس میں دونوں کھچے کھچے رہتے۔

بے عملی کا اس سے زیادہ تیر بہدف نسخہ تجویز نہ کیا جا سکتا تھا۔ مصطفےٰ سمجھتا تھا کہ اگر پارٹی کو سیاسی طور پر قدم آگے بڑھانا ہے تو بے نظیر سے مستقل رابطہ نہایت اہم ہے۔ وہ پارٹی کا بزرگ ترین رہنما تھا۔ اس کڑی آزمائش میں وہ اپنے تجربے کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ سیاست کے خارزار میں پہلے چند برسوں کے دوران بے نظیر کو راہ دکھا سکتا تھا۔ مصطفےٰ ریجنٹ کا کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا۔ ادھر بے نظیر کا اپنا سر اتنا

نہیں ہوا تھا۔ غرور سے پھولا ہوا تھا۔

پارٹی کے عمائدین کے رتبوں میں یہ ردوبدل پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کھر اب منظور نظر کی حیثیت سے محروم ہو چکا ہے اور جو اقتدار اُسے اب تک حاصل تھا وہ کھچ کر کسی اور گروپ کی طرف جا چکا ہے۔ اس گروپ کو نہ صرف شریک چیئرپرسن تک رسائی حاصل تھی بلکہ وہ ہر وقت اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ کارکنوں نے یہ بھی دیکھا کہ مصطفےٰ کے ساتھ بے نظیر کا رویہ بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی بے نظیر کے لب ولہجے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور باتوں سے ان پر ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ جان گئے کہ بے نظیر اب مصطفےٰ کو وقیع یا اہم نہیں سمجھتی۔ کارکن ہی وہ اساس تھے جس پر مصطفےٰ کے اقتدار کی عمارت کھڑی تھی۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ یہ اساس اس کے پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔

کارکنوں کا ایک اور گروپ بھی رفتہ رفتہ بے نظیر سے بدظن ہوتا گیا۔ بے نظیر پارٹی کو جس طرح چلا رہی تھی وہ انھیں آزردہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسرے اس کے انداز سیاست کا یہ خاصہ کہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ سفر کس سمت میں جاری ہے انھیں بہت گراں گزرنے لگا تھا۔ ان کارکنوں نے پارٹی سے رشتہ توڑ لیا۔ سابق ٹیسٹ کرکٹر آفتاب گل جیسے لوگ الگ ہو گئے۔ آفتاب پی پی پی کا بڑا مخلص اور گرم جوش رکن تھا اور جنرل ضیا کو قتل کرنے کی ایک سازش میں ملوث ہونے کی وجہ سے پاکستان سے بھاگ آیا تھا۔ جو کارکن بھٹو خاندان کے وفادار سمجھے جاتے تھے انھوں نے اچانک تعلق ختم کر لیا۔ سب کی زبان پر ایک ہی شکایت تھی اور وہ یہ کہ بے نظیر میں تکبر بہت ہے اور اس تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ بہت سے کارکن کھر کے ساتھ مل گئے۔ پارٹی کے اندر، غیر رسمی طور پر، کھر گروپ وجود میں آ گیا۔ ایک دوسرا جوابی گروپ جام صادق علی کے گرد جمع ہو گیا جو بدستور بھٹو خاندان کا وفادار اور قابل اعتبار چیلا بنا رہا۔

نجی سطح پر بے نظیر بڑی کمال کی عورت تھی۔ وہ شیریں جتوئی اور مجھے گھر مدعو کرتی رہتی اور ایک دفعہ اس نے ہم سے کہا کہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلیں۔ وہ مارزن کے بارے میں نئی لگنے والی فلم دیکھنا چاہتی تھی جسے والہانہ داد دی جا رہی تھی۔ فلم کیا تھی اس بن مانس کی بلند ابرو دانشورانہ تفسیر تھی جس میں کچھ پہلو طبقاتی معنی آفرینی کا بھی نکلتا تھا۔ میں بے نظیر سے مصطفےٰ کے بغیر نہ مل سکتی تھی کیوں کہ اس کی طرف سے مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بے نظیر کا دکھ درد میرے لیے باعث کشش ہے اور میرے اور اس کے درمیان ہمدردانہ رشتہ قائم ہو جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بے نظیر کے ساتھ میرے تعلقات کتنے دن اور استوار رہیں گے۔ تم

جیسی عورت کو اس کی سہیلی بنتے دیر نہ لگے گی۔ تمہاری وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات الجھ کر رہ جائیں گے۔ تمہاری ان فضول یاریوں اور میری سیاست کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اس لیے بے نظیر سے دور رہو۔" میں اس سے دور رہنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن اس کے دکھ درد اور بہت بھاری ذمے داری کو محسوس کرتی رہی۔

بے نظیر ہماری بعض ڈنر پارٹیوں میں شریک ہوئی۔ یاسمین نیازی اور اسلام طارق کی شادی کا جشن منانے کے لیے ہم نے بڑی زبردست ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ مصطفےٰ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کامیاب سیاسی چال چلی۔ انھوں نے بے نظیر اور بیگم بھٹو اور اس سماجی حلقے کے افراد کو تومدعو کیا جس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور جہاں ان کی بڑے آرام سے گزرتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی سیاسی کارکنوں کو بلانا بھی نہ بھولے جو ضیافت میں ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ملکہ معظمہ کی گارڈن پارٹی میں زبردستی آگھسے ہوں۔ مصطفےٰ نے عوام الناس اور اہل کروفر کے درمیان کوئی خط تفریق کھینچنے سے انکار کر دیا اور مساوات کے اس مظاہرے سے پارٹی کے ادنیٰ کارکنوں کے دل جیت لیے۔ اس خوش تدبیری پر انھیں اپنی پارٹی کی شریک چیئرپرسن سے کوئی نمبر نہ ملے۔ اسے اپنے کارکنوں کے ساتھ سوشل ہونے سے انکار تھا۔ لیکن سوشلسٹ انداز میں ان سے اپنا کام نکالنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر دونوں ہمیشہ مجھ سے بہت محبت سے ملتیں۔ میں نے جس طرح اپنا گھر بار سنبھال رکھا تھا اس پر بے نظیر نے مجھے سراہا۔ وہ مصطفےٰ سے کہنے لگی۔ "انکل، آپ کی خوش نصیبی کا کیا کہنا کہ تہمینہ آپ کی بیگم ہیں۔" میرے خیال میں وہ سمجھ چکی تھی کہ مصطفےٰ خاصا ٹیڑھا آدمی ہے۔

مجھے احساس ہو چلا تھا کہ بے نظیر اور مصطفےٰ کی زیادہ دیر نبھ نہیں سکتی۔ مصطفےٰ اس کی خوشامد نہ کر سکتا تھا اور وہ مصطفےٰ کا احترام کرنے کو تیار نہ تھی۔ یہ اناؤں کا ٹکراؤ تھا۔ کسی نہ کسی چیز کو تو آخر ٹوٹنا ہی تھا۔ شاہنواز کا انتقال ہوا تو واقعات نے اچانک پلٹا کھایا۔

مصطفےٰ اگرچہ الذوالفقار اور اس کی سرگرمیوں کا نہایت سختی سے مخالف تھا، شاہنواز کی موت نے انھیں ہلا ڈالا۔ شاہنواز اس طرح کا آدرش پسند تھا جن کا تذکرہ قصے کہانیوں میں ملتا تھا۔ وہ بہت حساس تھا اور بظاہر لگتا تھا کہ ہمارے روبرو کوئی بہت شائستہ دہشت گرد موجود ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں، اپنی نرمی اور ملنساری سے، رازفاش کر دیتی تھیں۔ اُن میں کوئی ایسی سرد مہر فولادی کیفیت نہ تھی جو دہشت گرد کی اس باقی امیج سے میل کھا سکتی جو اس نے اپنے پر طاری کر رکھی تھی۔ جلاوطنی کے ابتدائی ایام میں جب وہ

ہمارے یہاں مقیم تھا تو مجھے اس سے بہت انس ہو گیا تھا۔ جب میں ان کے مشاغل کے بعد گری پڑی چیزیں اٹھاتی، صفائی کرتی پھرتی وہ ہمیشہ مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اب وہ اس جہان سے رخصت ہو چکا تھا۔ جس طرح اس کی موت واقع ہوئی تھی اس سے سستے اخباروں کو اپنے صفحات الل ٹپ بھرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ نوجوان خوبرو دہشت گرد کا کام کس نے تمام کیا؟ کیا یہ اس کی دلکش افغان بیوی، ریحانہ، کا کارنامہ تھا؟ یا اسے جنرل ضیا کے مامور کیے ہوئے قاتلوں نے ٹھکانے لگایا تھا؟۔ یا شاہنواز نے، جسے اس زندگی کے بارے میں جو وہ گزارنے پر مجبور تھا، کوئی خوش فہمی باقی نہ رہی تھی، خود کشی کر لی تھی؟ زیادہ شک اس کی بیوی پر کیا گیا۔ مجھے "کس نے مارا" اور اسی قبیل کے سوالات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میری نظر میں یہ زندگی کا المناک زیاں تھا۔ وہ اتنا جوان، اتنا پُرعزم تھا۔ میں الگ جا بیٹھی اور روتی رہی۔

ہم جتوئی صاحب اور خلیفہ کے ساتھ بحری سیر پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہم نے اپنی سیر منسوخ کر دی۔ جتوئی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ بے نظیر کے ہمراہ شاہنواز کی میت کے ساتھ پاکستان جائیں گے۔ انھوں نے سوگوار بہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مل سکی۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ تابوت کے ہمراہ جتوئی صاحب کا جانا نہایت ضروری ہے۔ بالآخر جتوئی صاحب اور مصطفےٰ بے نظیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اس سے اظہار افسوس کیا۔ وہ ایک ہی طیارے پر روانہ ہوئے مصطفےٰ تو طیارے کے پہلے سٹاپ پر اتر گیا اور جتوئی صاحب میت کے ساتھ کراچی چلے گئے۔

پارٹی اس افسوس ناک موت سے پورا سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے بہت بے چین تھی۔ پارٹی والوں نے صورت حال کا بڑا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ جو مروتی اہل پاکستان پر بھٹو صاحب کی موت کے وقت طاری ہو گئی تھی وہ دُور ہو چکی تھی۔ شاہنواز کے جنازے کے وقت فراست کا ثبوت دے کر عوام کو اپنے حق میں صف آرا کرنا ممکن تھا اور لوگوں کے منظم ہو کر میدان میں اترنے سے برپا ہونے والے زلزلے کی لہریں فوجی حکومت کو لرزا سکتی تھیں۔ انھیں یقین تھا کہ اگر بے نظیر کراچی سے سڑک کے راستے لاڑکانہ جائے تو لوگ جوق در جوق اس کے ساتھ چلنے کے لیے امڈ آئیں گے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں، بالخصوص ایسے دور میں جو مارشل لا اور اجبار سے عبارت ہو، بڑے بڑے ہجوم نفسیاتی طور پر بہت اہم ہوتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے ایک گروپ کا خیال تھا کہ شاہنواز کو کراچی میں دفنانا چاہیے۔ لاڑکانہ بنگال سے بہت بابرکت ثابت ہو رہا تھا۔ نوڈیرو میں بھٹو صاحب کا مزار عوام کو یکجا کرنے کا

مقام نہ بن سکتا تھا۔ شاہنواز کی قبر کو ایسے متبرک مقام کے طور پر کام لانا ممکن تھا جہاں سے تحریکیں جنم لے سکیں۔

بے نظیر نے ان نقطہ ہائے نظر کو ماننے سے انکار کر دیا۔ طیارے سے اترتے ہی، جسے ٹرمینل سے محفوظ فاصلے پر پارک کیا گیا تھا۔ وہ ایک فوجی طیارے پر سوار ہوئی جس نے جھٹ پٹ اسے موئنجوڈرو کے ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔ وہاں حشر کا سا سماں تھا ہر طرف چیختے چلاتے ہجوم نظر آ رہے تھے۔ اس غضب کا جم غفیر اور لوگوں کی جذباتی حالت دیکھ کر بے نظیر کی سمجھ میں آ گیا کہ اس نے فاش غلطی کی ہے۔ جن لوگوں نے لاڑکانہ میں ہجوم کی مجنونانہ کیفیت دیکھی انھوں نے جان لیا کہ بے نظیر کرشمہ آفرین شخصیت کی مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کو دفنانے وطن لوٹی تھی۔ اس نے سیاسی درجہ حرارت کو پرکھ لیا تھا۔ اب خود اس کی واپسی کا منصوبہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ دس اپریل 1986ء کو لاہور میں اکٹھے ہونے والے ہجوم کا اور بھی بڑا ہونا لازم تھا۔

مصطفےٰ اور جتوئی صاحب نے محسوس کیا کہ بے نظیر نے ایک بار پھر ان کے معروضات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جتوئی صاحب اور بے نظیر کے درمیان اختلافات کی نوعیت سنگین ہو گئی۔ جتوئی صاحب سندھ میں پیپلز پارٹی کے صدر تھے۔ بے نظیر نے ہالہ کے مخدوم کے آدمیوں کو اہم عہدوں پر فائز کر کے پارٹی کو لولا لنگڑا کر دیا۔ اپنی پارٹی کے دیوقامت حضرات کے قد کو گھٹاتے جانا بے نظیر کی سٹریٹجی کا حصہ تھا۔

وہ مصطفےٰ کو بھی نیچا دکھا چکی تھی۔ مصطفےٰ کو یقین تھا کہ پنجاب میں پی پی پی کا صدر اُسے ہی مقرر کیا جائے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پنجاب بلا شرکت غیرے اُس کی قلمرو ہے۔ جب پتہ چلا کہ اُس کا نام اس عہدے کے لیے زیر غور ہی نہیں تو اُسے صدمہ پہنچا۔ اُس نے اس معاملے پر بے نظیر سے بات کی تو اُسے بتایا گیا کہ وہ بہت متنازع انتخاب ثابت ہو گا۔ "بہت زیادہ لوگ اس چناؤ سے اختلاف کریں گے۔" مصطفےٰ کو طیش آ گیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اختلاف کر کیسے سکتا ہے۔ میرے سوا اور کسی کو نہیں چنا جا سکتا۔ یہ مجھ پر آپ کوئی مہربانی نہیں فرمائیں گی۔ میں خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر اس عہدے کا حق دار ہوں۔ سب کو تسلیم ہے کہ میں پنجاب کا قائد ہوں۔"

بے نظیر قائل نہ ہوئی۔ وہ جہانگیر بدر، فاروق لغاری، فیصل صالح حیات اور ڈاکٹر نیازی جیسے لوگوں کے ردعمل سے خائف تھی۔ مصطفےٰ ششدر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ بے نظیر کو اُس پر اعتبار نہیں۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ "پنجاب کے بالشتیوں" کے ردعمل سے خوف زدہ تھی۔ مصطفےٰ نے جان لیا کہ جب تک وہ پارٹی کی سربراہ ہے اُس کی سیاسی ترقی رکی رہے گی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُسے غیر موثر

وانتو بنانے کے لیے کوئی کارروائی کی جانے والی ہے۔

ان دنوں ہمیں بلوچستان کے عطاء اللہ مینگل سے ملنے جلنے کا خاصا موقع ملا۔ وہ بھی ہماری طرح جلاوطن تھے۔ مصطفےٰ سردار مینگل کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سردار صاحب بڑے پکے بلوچ قوم پرست تھے۔ انھوں نے پنجابیوں سے اپنے تنفر کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ "میں پنجابیوں سے اصولی طور پر نہیں ملتا۔ نہ میں ان کا کھانا کھاتا ہوں نہ ان کے گھر جاتا ہوں۔ وہ اعتبار کے قابل نہیں۔ لیکن مصطفےٰ صاحب مختلف ہیں۔ وہ لائق احترام ہیں۔ میں ان سے ملنے ملانے میں استثناء سے کام لیتا ہوں کیوں کہ وہ خود مستثنیات میں سے ہیں۔"

مینگل اور مصطفےٰ دونوں کو شکار کا بہت شوق تھا اور وہ ایک ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتے۔ ہم ان کے گھر بھی جاتے رہتے۔ ان کی بیگم انگلستان میں بھی پردے میں رہتیں۔ مجھے سردار صاحب سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا۔

ایک دفعہ مصطفےٰ کی نظر سردار مینگل کی ٹیلیفون بک کے اندراجات پر پڑ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ حفیظ پیرزادہ کا نام اور نمبر کاٹ دیا گیا ہے۔ وجہ دریافت کی تو جواب ملا۔ "میں حفیظ پیرزادہ جیسے ناموں سے اپنی ٹیلی فون بک کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔"

ایک ہفتے بعد حفیظ، ممتاز اور سردار مینگل مصطفےٰ سے ملنے آئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کنفیڈریشن کی ایک سکیم سامنے لانے والے ہیں اور مصطفےٰ کو قائل کرنا چاہا کہ وہ بطور پنجابی سکیم کی حمایت کرے۔ مصطفےٰ نے اس کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ سکیم پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا نسخہ ہے۔ اُس کے خیال میں یہ اور کچھ نہیں، مجیب الرحمن کے وہی چھ نکات تھے جن کے نتیجے میں پاکستان دو نیم ہو گیا تھا۔ بس ان نکات کو نیا لباس پہنا کر سامنے لایا جا رہا تھا۔

مصطفےٰ کو بڑا تجسس تھا کہ حفیظ کے بارے میں سردار صاحب کی رائے اچانک یکسر کیسے بدل گئی۔ اُس نے اس خفگی اور حقارت کو یاد کیا جو ہفتے بھر پہلے مینگل کی آواز سے صاف جھلک رہی تھی۔ چند ہی دن میں ان کی رائے میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے واقع ہو گئی۔ مصطفےٰ کو یقین تھا کہ ان کی ڈور کوئی اور ہلا رہا ہے۔ کنفیڈریشن سکیم کسی بیرونی طاقت کی ذہنی اختراع تھی۔ اس کا مقصد پاکستان کی فیڈریشن کو ضعف پہنچانا تھا۔ یہ علیحدگی کی سازش تھی جس نے منہ پر خود مختاری کی نقاب ڈال رکھی تھی۔ اُسے سارا شک بھارت پر ہوا۔ بھارت کے سوا کسی اور طرف خیال جا ہی نہ سکتا تھا۔ یہی وہ غیبی ہاتھ تھا جس نے مینگل کو حفیظ کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ موقع پرستی اور عمل پسندی پر مبنی سیاست میں، کیسے کیسے عجیب جوڑے ہم آغوش ہوتے

مصطفیٰ کھر اور حنیف رامے، ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف محاذ

نظر آتے ہیں۔

ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ نے جب کنفیڈریشن کے منصوبے سے اپنی وابستگی کا اعلان کیا تو وہ ابھی پیپلزپارٹی کے رکن تھے یہ پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی تھی۔ مصطفیٰ بے نظیر کے پاس گیا۔ "ممتاز اور حفیظ کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو۔ انہوں نے ہمارے پلیٹ فارم سے ایک نئے منشور والی نئی سیاسی جماعت کا اعلان کر دیا۔ آپ نے اس کی اجازت کیسے دی؟ اگر آپ اس بارے میں سکوت اختیار کیے رہیں گی تو یہ ان کی سکیم پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہوگا۔"

بے نظیر ممتاز اور حفیظ سے الجھنے کو تیار نہ تھی۔ مصطفیٰ کو یقین ہو گیا کہ وہ ان سے ملی ہوئی ہے۔ کنفیڈریشن کی سکیم آزمائشی غبارہ تھی جسے ہوا کا رخ پہچاننے کے لیے اڑایا جا رہا تھا۔ مصطفیٰ حیران ہوا کہ پارٹی کی سب سے اونچی صف میں بھی بھارتیوں نے اپنے پاؤں جما لیے ہیں۔ ان کی چابک دستی دیکھ کر مصطفیٰ ضرور چکرا گیا ہوگا۔

بے نظیر نے یہ دلیل پیش کی کہ سندھی انتخابی حلقوں کی وجہ سے وہ ممتاز اور حفیظ سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ اس نے مصطفیٰ کو بتایا کہ سندھیوں کی دشمنی مول لینے کے بجائے وہ اس مسئلے کو نظر انداز کرنے کو ترجیح دے گی۔

مصطفیٰ قائل نہ ہوا اپنی بات پر اڑا رہا۔ پارٹی کی سربراہ سے اپنے اختلاف کو اُس نے عام کر دیا۔ اُس نے کنفیڈریشن سکیم اور پارٹی کی قیادت کی بے تدبیری پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ حفیظ اور ممتاز کو پارٹی سے نکال دیا جائے۔

معاملہ رفع دفع ہونا تو کجا مصطفیٰ کو مظفر گڑھ کی پیپلزپارٹی کے صدر کی طرف سے اظہار وجوہ کا نوٹس موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ وہ پریس کو ایسا غیر عاقلانہ اور عاجلانہ بیان جاری کرنے پر قیادت سے معافی مانگے اگر اُس نے معافی نہ مانگی تو اُسے پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ مظفر گڑھ کے پیپلزپارٹی کے صدر نے سچ مچ مصطفیٰ کو پارٹی سے نکالے جانے کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مصطفیٰ نے پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

رفیع رضا نے اس کتابچے کو لکھنے میں ہاتھ بٹایا جس میں مصطفیٰ نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر نے ایک ساتھ اپنی پارٹی کو خیر باد کہا۔ انہوں نے نیشنل پیپلزپارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایسی پارٹی تھی جس کی طرف پیپلزپارٹی کے کارکن کھچ آئے۔ اس کا منشور بھی پیپلزپارٹی کے منشور سے ملتا جلتا تھا۔ مصطفیٰ کو بھٹو کی شخصیت کی سحر انگیزی کا بہت اچھی طرح احساس تھا۔ اُسے امید تھی کہ

مصطفےٰ کھر، ذوالفقار علی بھٹو، محمود علی قصوری اور دوسرے اراکین اسمبلی کے ساتھ پہلی منتخب قومی اسمبلی میں

میری امی کی جوانی کے دنوں کی ایک تصویر

ویں اصولوں کا دوبارہ ذکر چھیڑ کر وہ لوگوں کی پر جوش حمایت حاصل کر لے گا۔ وہ بھٹو کی میراث کے حقیقی جانشین کے طور پر ابھرنے کا خواہاں تھا، اور بھٹو خواتین کو بے وقت کرنا چاہتا تھا جو اس کے خیال میں بھٹو پرستی کے رجحان کو جڑ سے اکھاڑنے کا عمل شروع کر چکی تھیں۔ مصطفٰے سمجھتا تھا کہ جب وہ عوام سے بھٹو صاحب کی بات کرے گا اور ان اصولوں کا ذکر چھڑے گا جن کے بھٹو صاحب علم بردار تھے تو عوام کی طرف سے مثبت جواب ملے گا۔ آخر بھٹو کے جانشین ہونے کا شرف تو اُسی کو حاصل تھا۔ جو کچھ اُس کا حق تھا اس سے وہ کشمکش کے بغیر دست بردار نہ ہو گا۔ سیاسی میدان میں آنے والے اوچھے نوواردوں کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ اُسے پس منظر میں دھکیل دیں۔

جتوئی صاحب اور مصطفٰے پرانے حلیف اور اچھے دوست تھے۔ جتوئی صاحب مصطفٰے کے مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دو مرتبہ ضیا نے انھیں وزیراعظم بنانے کی پیشکش کی اور دونوں بار انھوں نے، مصطفٰے کی طرف سے منفی جواب ملنے پر، یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

پہلی بار ہم دبئی میں تھے۔ اور جتوئی صاحب اس پیشکش کے بارے میں مصطفٰے سے صلاح مشورہ کرنے آئے۔ مصطفٰے نے کہا کہ پیشکش کو قبول کرنا سیاسی خود کشی کے مترادف ہو گا۔ جتوئی صاحب اس وقت جنرل کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش میں تھے کہ مصطفٰے کو ملک میں واپس آنے دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دونوں مل کر ملک کو چلا سکیں گے۔ پنجاب کی حمایت کے بغیر جتوئی صاحب غیر موثر ثابت ہوں گے۔ اور پنجاب مصطفٰے کی قلمرو تھا۔ جنرل مصطفٰے کے حوالے سے سودے بازی کرنے پر تیار نہ تھا۔ جتوئی صاحب نے پاکستان واپس جا کر پیشکش کو مسترد کر دیا۔

دو سال بعد جنرل نے جتوئی کو وزیراعظم کے عہدے کی دوبارہ پیشکش کی۔ ایک بار پھر جتوئی صاحب نے محسوس کیا کہ مصطفٰے کے بغیر وہ وزارت عظمیٰ کی ذمے داریوں سے عہدہ برا نہ ہو سکیں گے۔ یہ بات تو ماننے کی نہیں تھی کہ جتوئی صاحب تو وزیراعظم ہوں اور مصطفٰے جلاوطن رہے۔ انھوں نے اپنے بھائی، امام بخش، کو انگلینڈ مصطفٰے کے پاس بھیجا۔ جتوئی صاحب کے گھر والے شدت سے اس کے حق میں تھے کہ یہ بلند عہدہ قبول کر لیا جائے۔ مصطفٰے نے جتوئی صاحب کو مشورہ دیا کہ مارشل لا حکومت کے ساتھ کسی طرح کا تعلق پیدا نہ کریں۔ جتوئی صاحب نے کہا کہ یہ پیشکش وہ صرف اس صورت میں قبول کریں گے کہ مصطفٰے کو واپس آنے دیا جائے۔ جنرلوں کی نظر میں مصطفٰے اب بھی بڑی ٹیڑھی کھیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو گا۔

میرے والد شاکر اللہ درّانی 1952ء میں

خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جنہوں نے مذاکرات کی میز پر پہنچ کر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ بھٹو صاحب نے بڑی وضاحت سے خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے فوج کے نچلے عملے کو محب الوطن اور جنرلوں کو غدار قرار دیا۔

1971ء میں ڈھاکے میں پاکستانی فوج کی شکست کے بعد بھٹو صاحب کا خواب پورا ہو گیا۔ شکست سے جو خلا پیدا ہوا تھا اس کے اندر انہیں خاصی آسانی سے من مانی کاروائیاں کرنے کا موقع مل گیا۔ حد یہ کہ اس وقت بھی، جب فوج سنبھالا لے رہی تھی، ان کا اعتماد بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے فوج کی امیج بحال کرنے میں مدد دی۔ جب 1977ء میں ایک اور سیاسی تعطل کی نوبت آئی تو فوج میں اتنا اعتماد آ چکا تھا کہ اس نے 5 جولائی کو حکومت پر قبضہ کر لیا۔

مصطفےٰ کھر اور پی پی پی کے خاصے لوگ اس وائرس کا شکار ہو گئے جسے بھٹو صاحب نے پالا پوسا تھا اور پھر اس پارٹی میں، جس کے وہ قائد تھے، پھیلا دیا تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں بھارتیوں سے رابطہ قائم کرنے کی جو بدترین تشریح کی جا سکتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ انسان ہر طرف سے مایوس ہو کر کچھ بھی کر گزرنے پر اتر آتا ہے۔ ان کے حماقت مآب نظریے کے مطابق اس رابطے کو غداری کا مترادف نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسے وہ بھٹوازم کہتے ہیں۔

سیاسی طیف کے دائیں طرف واقع پارٹیاں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتیں۔ انہیں اتنا فہم ضرور ہے کہ فوج اہم ادارہ ہے اور اگر یہ موجود نہ ہو تو پاکستان بھارت کے رحم و کرم پر ہو گا جو اس پورے خطے پر حکم چلانے کا خواہاں ہے۔ بظاہر بے پایاں مارشل لا کے تاریک ترین دور میں بھی ان کے ذہن بھٹک کر کسی ایسے حل کی طرف مائل نہ ہوئے جس پر ملک دشمن ہونے کا خفیف سا گمان بھی ہو سکے۔ یہ میلان رکھنے والے بہت سے رہنما فوج کو کھیل میں شریک کرنے پر آمادہ ہیں اور اسے اقتدار میں بھی حصہ دینے کو تیار ہیں۔

مصطفےٰ کھر کی بیگم ہونے کے ناتے مجھے فوج سے نفرت کرنے اور گھن کھانے کا سبق رٹایا گیا تھا۔ میرا ذہن ایسے سانچے میں جکڑا جا چکا تھا کہ اس سے کوئی اور ردِ عمل متوقع ہی نہ تھا۔ بیشتر آزاد خیال حضرات، جن سے مجھے بعد میں ملنے کا اتفاق ہوا، مصطفےٰ کے نظریے سے بھی زیادہ انتہا پسندانہ نظریوں کے حامی دکھائی دیے۔ انہیں بھارت سے اتنا عناد نہیں تھا جتنی نفرت اس کردار سے تھی جو فوج کا ہماری ملکی سیاست کے حوالے سے رہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انتشار ہے جسے تاریخ نے جنم دیا ہے۔ مجھے پتہ ہونا ہی چاہیے۔ کبھی میں بھی اسی انتشار کا حصہ تھی۔ اب میں معاملات کو بہتر طور پر

جتوئی صاحب نے ایک بار پھر پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اگر واپسی کی شرط مان لی جاتی تو مصطفےٰ کا مشورہ کچھ اور ہوتا۔

فوج کے پاس مصطفےٰ کو آزاد انسان کی حیثیت سے وطن لوٹنے سے باز رکھنے کی اپنی وجوہ تھیں۔ فوجیوں کی نظر میں وہ غداری کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ پاکستانی فوج کے ادارے کو تباہ و برباد کرنے کے ایک شیطانی منصوبے پر کام کر رہا تھا۔

ہماری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اس نظریے کا قائل ہے کہ ہمارے تمام مسائل کی بنیادی وجہ پاکستانی فوج ہے۔ یہ نظریہ اس بہت ہی بین اور مداخلت پسندانہ کردار پر مبنی ہے جو فوج ہماری سیاست میں ادا کرتی چلی آئی ہے۔ اس نظریے کے محرکین کا استدلال ہے کہ فوج ہمیشہ سیاست دانوں اور جمہوریت کو شبے کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ اپنے مفادات اور اس بڑے دفاعی بجٹ کی، جو اس کی بقا کا ذمے دار ہے، نہایت چوکنی رہ کر حفاظت کرتی ہے۔ آبادی کے اس بڑے حصے کے رائے ساز رہنما اس مسئلے کا ایک الجھا ہوا حل پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستانی فوج کو تباہ کرنا پڑے گا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ سیاسی عمل کے ذریعے فوج کو تباہ کرنے کی کوشش بے سود ثابت ہو گی انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فوج کو جنگ کے ذریعے کچل دیا جائے۔ اس بلائے عظیم کا مکمل صفایا اسی صورت میں ممکن ہے کہ بھارت کو کسی طرح فوج کے خلاف قدم اٹھانے پر راضی کیا جا سکے۔ یہ رہنما ایک لمحے کے لیے بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ان کی سرگرمی حب الوطنی کے منافی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارتی تو صرف مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ ان کی کاروائی کا مطلب پاکستان کا خاتمہ نہ ہو گا۔ ایک دفعہ فوج کو شکست ہو جائے تو سیاست داں زیادہ آزادی سے ہمارے بے ڈھنگے نظام کو نئے سرے سے تعمیر کر سکیں گے۔ بھارتی جس طرح آئیں گے اسی طرح سرحد کے اس پار لوٹ جائیں گے۔ اور ہمیں اپنے ملک کی گاڑی آپ چلانے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے۔ یہ رہنما خود کو ان علیحدگی پسندوں سے مختلف گرداتے ہیں جو قومی آزادی کی جنگ کے ذریعے اپنے ملک کے حصے بخرے کرنے کی سازش کرتے ہیں۔ ان کا دشمن مملکت پاکستان نہیں، فوج ہے۔

بھٹو صاحب پہلے سیاست داں تھے جنہوں نے بڑی ترکیبیں لڑا کر، صحیح معنی میں ، ایسی صورت حال دوبارہ پیدا کی۔ ایک دفعہ 1965ء میں اور دوسری بار 1971ء میں۔ 1965ء میں فوج کی تذلیل نہ ہوئی اور اس کے جرات مندانہ کارناموں نے عوام کے دل جیت لیے۔ بھٹو صاحب ٹھہرے زیرک سیاست داں وہ سمجھ گئے کہ انہیں عوامی جذبات کا ساتھ دینا ہو گا۔ تاشقند معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے جنرلوں کے

سمجھتی ہوں۔

پاکستان پیپلزپارٹی پر اتنا دباؤ تھا کہ بنیادی غلطی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی قیادت نے، جو آمر سے اقتدار چھیننے کے لیے مایوسانہ ہاتھ پیر مار رہی تھی، پاکستان کے روایتی دشمن، بھارت سے خفیہ مذاکرات شروع کر دیے۔ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور بھارتی رہنماؤں سے باقاعدہ رابطے رکھے جانے لگے۔ ان تمام باتوں کو خفیہ رکھا گیا کیوں کہ ان کی اگر ذرا سی خبر بھی باہر آ جاتی تو پنجاب، جہاں سے پیپلزپارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ مل سکتے تھے، برگشتہ ہو جاتا۔

بھارتیوں نے میر اور شاہنواز کو سیاسی پناہ کی پیشکش کی تھی۔ وہ ان کے لیے بھارت میں تربیتی کیمپ قائم کرنے اور ضروری سازوسامان بہم پہنچانے پر بھی آمادہ تھے۔ میر اور شاہنواز نے اس پیشکش کو قبول نہ کر کے سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ بھارت نہ جانے کا فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا تھا کہ انھیں بھارت سے کوئی بغض تھا۔ سیاسی مصلحت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ بھارت نہ جائیں۔ ہر اس تحریک کا جسے بھارت کی سرپرستی حاصل ہو پاکستان کے قلبستان (پنجاب) میں، جہاں حب الوطنی کا سب سے زیادہ شور تھا، ناکام ہونا یقینی تھا۔ کابل بہتر چناؤ تھا۔ اس کی انھیں کوئی پروا نہ تھی کہ کابل، ماسکو اور دہلی کا ایک محور موجود ہے۔ یہ تینوں طاقتیں ضیاءالحق کو نشانہ بنانا چاہتی تھیں۔ میر اور شاہنواز کی کابل میں گاڑھی چھنی۔ ضیاء نے افغانستان کے بارے میں جو موقف اپنایا تھا اور جس طرح سکھ علیحدگی پسندوں کی چوری چھپے مدد کر رہا تھا اس پر روسی اور بھارتی سخت برہم تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ضیا کو بھی ناکوں چنے چبوائے جائیں۔ الذوالفقار کچوکوں پر کچوکے دے کر آہستہ آہستہ اسے ختم کر سکتی تھی۔

مصطفےٰ کو معلوم تھا کہ کنفیڈریشن کا چکر بھارتیوں نے چلایا ہے۔ کنفیڈریشن کے حق میں پیپلزپارٹی کے دو سربرآوردہ رہنما سب سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ بےنظیر نے شروع شروع میں حفیظ اور ممتاز کو پارٹی سے نکالنے میں جو تامل ظاہر کیا تھا اس سے شبہ پیدا ہوتا تھا کہ کنفیڈریشن کی سکیم میں اس کا بھی کوئی کردار ہے۔ توقع یہ کی جا رہی تھی کہ چھوٹے صوبے اس سکیم کو قبول کر کے پنجاب کے خلاف متحد ہو جائیں گے۔ کنفیڈریشن پسندوں نے خود کو سندھ بلوچ پختون محاذ کا نام دے کر اپنی توپوں کا رخ کھلم کھلا پنجاب کی طرف موڑ دیا۔ یہ خیالی منظر کہ پاکستان آخرش ٹوٹ پھوٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے گا کوئی نیا نہ تھا۔ ایسی علیحدگی پسند تحریکوں نے، جو آزاد سندھودیش، عظیم تر بلوچستان یا پختونستان کی مانگ کرتی رہتی تھیں، پہلے دن سے ہماری سیاست میں فساد پھیلا رکھا تھا۔ پاکستان کی تین قومیتیں پہلی بار ایک

ایسے پلیٹ فارم پر یکجا ہوئی تھیں۔ جو فیڈریشن کے پرخچے اڑا دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ جو رہنما اس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے تھے ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے ہمارا 1973ء کا آئین قلم بند کیا تھا۔ پیپلزپارٹی کی قیادت کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ پنجابی فوج سے عناد رکھتی ہے۔ اس نے کنفیڈریشن کے تصور کو اس خیال سے خوش آمدید کہا ہو گا۔ اور کچھ نہ سہی تو اس بہانے پنجاب کی بالادستی ختم کرنے کی امید تو ہے۔

بھارتی پیپلزپارٹی کی ایک اور اہم گروہ بندی میں بھی پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھیں پنجاب سے ایک رہنما کی تلاش تھی کہ آخری پانی پت تو پنجاب ہی نے بننا تھا۔ یہ سب سے فریب آمیز پلان تھا۔ اس سے پاکستان کے دل پر ضرب پڑتی تھی۔ انھوں نے مصطفےٰ کھر کو اپنے آلہ کار کے طور پر چنا۔

مجھے مصطفےٰ کے بھارتی رابطے کا پہلی بار 1980ء میں پتہ چلا۔ ان دنوں میرے بیٹے علی کی پیدائش متوقع تھی۔ میری بہن زرمینہ کی شادی کے دوران مصطفےٰ بھارت چلا گیا۔ وہ میرے لیے ڈھیر سارے ملبوسات لے کر آیا۔ ساتھ ہی وہ ان کے "آدمی" بن کر لوٹا۔

اُس نے اندرا گاندھی سے اپنی ملاقات کے بارے میں مجھے بتایا۔ وہ اندرا سے ملنے گیا جس کی رہائش گاہ نئی دہلی میں صفدر جنگ روڈ پر واقع تھی۔ دن کا وقت تھا۔ اُسے لے جا کر لونگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ میز پر "ٹائم" کا کوئی شمارہ پڑا تھا۔ مصطفےٰ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ گھر بہت سادہ ہے۔ اس میں ٹیم ٹام بالکل نہیں ایسا گھر نہیں تھا جسے اثر آفرینی کے لیے مزین کیا گیا ہو۔ اس میں مرورِ ایام کے ساتھ خود بخود نکھار آتا گیا تھا۔ اس گھر کا اپنا مزاج تھا۔

اندرا گاندھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے انداز میں سادگی تھی۔ وہ اپنا مافی الضمیر بے تکلف بیان کر سکتی تھی لیکن یہ خیال کبھی نہ آتا تھا کہ وہ مرعوب یا دھونس جمانا چاہتی ہے۔ اس سے نباہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انھوں نے گھنٹے بھر بات کی جس کے دوران جمہوریت کی بحالی اور بھٹو صاحب کے قتل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انھوں نے پاک بھارت تعلقات پر بھی غور کیا۔ دونوں ہمسایہ ملکوں میں پائی جانے والی مسلسل مخاصمت کی وجوہ کا تجزیہ کرنا چاہا اور اسلحہ کی دوڑ کا، جو سراسر گھاٹے کا سودا تھا، جائزہ لیا۔ اندرا کا خیال تھا اور مصطفےٰ نے اس سے اتفاق کیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کو برقرار رکھنا فوج کے مفاد میں ہے۔ فوج پاکستان کے قلیل وسائل کو ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ فوج کی وجہ سے پاکستان زیادہ تیز رفتاری سے ترقی نہ کر پا رہا تھا۔ فوج نے ہمارے

عوام کو غریب رکھا ہوا تھا، جنھیں نہ کھانے کو ٹھیک طرح کچھ ملتا تھا نہ پہننے کو اور جن کے پاس رہنے کے لیے گھر تک نہ تھے۔ فوج جمہوری اداروں کی تعمیر میں روڑے اٹکاتی رہتی تھی اور سیاست دانوں کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فوج کی نفری میں کمی کرنی پڑے گی۔ پاکستان کی فوج تصوری کر دی جائے تو بھارت اپنے وسائل کو مسلح افواج پر صرف کرنے کے بجائے ان کا رخ صنعتی اور ترقیاتی منصوبوں کی طرف موڑ سکے گا۔ بھارت عظیم اقتصادی طاقت بننے کا خواہاں تھا اور اس کا یہ خواب صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ اسے پاکستانی فوج کے وبال سے نجات مل جائے۔

اندرا گاندھی خوب جانتی تھی کہ پاکستانی فوج کبھی اقتدار سے پرامن طور پر دست بردار نہ ہوگی۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستانی فوج کو جنگ میں شکست دے کر بے عزت کرنا پڑے گا۔ پچھلی بار بھٹو صاحب غلطی کر بیٹھے تھے۔ جس فوج نے بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے وہ اسی فوج کے مورال کو دوبارہ بلند کرنے میں لگے رہے۔ فوج نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں پھانسی چڑھا دیا۔ "ہمیں آپ کی فوج کو کچلنا اور ذلیل کرنا پڑے گا۔ صرف اسی کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ہم آہنگی فروغ پا سکتی ہے۔ صرف اسی کے بعد آپ اپنے ملک میں سول قانون کی بحالی کی امید کر سکتے ہیں۔"

یہ ساری باتیں مصطفےٰ نے بارہا سنی تھیں۔ بھٹو صاحب ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ فوج صرف محاذ جنگ پر شکست کھانے کے بعد اقتدار شہریوں کو منتقل کرنے پر تیار ہو سکتی ہے۔ ان کا کہا 1971ء میں درست ثابت ہوا۔ وہ اتنے مآل اندیش نہ تھے کہ شکست خوردہ فوج کے دل میں اپنی تلوار اتار دیتے۔ وہ ہچکچائے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لالچ میں ایسا موقع ضائع کر دیا جو زندگی میں ایک ہی بار ملتا ہے۔ بھٹو صاحب کا نظریہ ان کے معتقدین کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا تھا۔ پیپلز پارٹی میں بہت سے لوگ اسی کو آخری حل سمجھتے تھے۔ اس خیال کے حامیوں میں مصطفےٰ کھر کو بھی شامل سمجھیے۔

اس حیرت ناک انکشاف کے حوالے سے میرا ردعمل عجیب تھا۔ میں یہ تو سمجھ گئی کہ مصطفےٰ نے جو کچھ کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے اس کے مضمرات کیا ہوں گے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اُس نے جو کچھ کیا حب الوطنی کے خیال سے کیا۔ اُس کے دلائل دل کو لگتے تھے۔ "جو کچھ میں کرنے والا ہوں اسے غلط سمجھا جائے گا۔ پاکستان کے لوگ ان پڑھ ہیں۔ ایک ہی خیال سے سختی سے چمٹے رہتے ہیں۔ پہلے سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آگے چل کر کیا ہوگا۔ ہمیں مآل اندیش ضرور ہونا چاہیے۔ ان کی نظر میں بھارت دشمن نمبر ایک ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی اصل دشمن فوج ہے جو انھیں بہتر مستقبل

سے محروم کر رہی ہے۔ میرا منصوبہ طویل المیعاد ہے۔ یہ منصوبہ ہمارے مستقبل کے لیے ہے۔ ہمارے بچوں کے لیے ہے۔ ملک کے خاص الخاص طبقے کی یہ سمجھ میں نہ آئے گا۔ وہ منصوبہ کو ضرورت سے زیادہ انتہا پسندانہ قرار دے کر اسکی مخالفت کریں گے۔ انھیں پتہ ہے کہ ہم معاملہ صرف فوج تک محدود نہیں رہنے دیں گے۔ انھیں بھی اپنی ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی ہوئی دولت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ وسیع پیمانے پر اصلاحات کی جائیں گی۔ فوج کی تباہی تو محض پہلا قدم ہے۔ اسی لیے یہ راز خطرناک ہے۔

میں حیران ہوں کہ مصطفےٰ کو، جو پارٹی ڈسپلن کا اس قدر سختی سے قائل تھا، اپنی چیرپرسن اور شریک چیرپرسن کی اشیرباد حاصل تھی۔ پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں اب ترپ کا بھارتی پتا آ گیا تھا۔ جب بھی یہ محسوس ہوا کہ اس کے اقتدار میں واپس آنے کی منزل رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی ہے پارٹی یہ پتا چل دے گی۔

بھارت یاترا کے بعد مصطفےٰ زیادہ نڈر ہو گیا اُس میں اپنے خیالات کو چھپوانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ "آکا نوسٹ" نے مصطفےٰ کا مضمون چھاپا۔ اسے چھوٹا موٹا کارنامہ سمجھنا ہوگا۔ "آکا نوسٹ" کی حد تک یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس کے صفحات پر تیسری دنیا کے کسی ملک کی حزب اختلاف کے ایک غیر معروف رہنما کا مضمون اس کے نام سے چھپے۔ مضمون چار صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے ساتھ بھارت کے تعلقات سے بحث کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ حالات کو معمول پر لانے کے عمل میں فوجی حکومت رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ مضمون کا یہ نزاع انگیز حصہ پڑھ کر وہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے جو مصطفےٰ کو "شیر پنجاب" کے نام سے جانتے تھے۔ زیتون کی شاخ پنجابی سیاست داں کے ہاتھ میں بے تکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ مضمون لکھنے پر اس کی پارٹی نے مصطفےٰ کی سرزنش نہیں کی۔ پارٹی کے سکوت نے مصطفےٰ کے موقف پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ایک نامی گرامی اخبار میں مضمون کی اشاعت سے نئے نئے بنے ہوئے اتحادیوں کی نظر میں مصطفےٰ کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ خوش ہوئے کہ ان کے آدمی میں اپنے موقف کو اخبار میں چھپا دینے کی ہمت ہے۔ انھوں نے مصطفےٰ سے خصوصی مراسم استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھارت کے ساتھ ربط ضبط کو سرکاری شکل دے دی گئی۔ مصطفےٰ کی ملاقات اعلیٰ مرتبے پر فائز ایک انٹیلی جنس افسر سے کرا دی گئی جو انگلینڈ میں انڈین ہائی کمیشن میں تعینات تھا۔ اس کا نام جوشی تھا۔ سازش اور جاسوسی کا جو ڈراما وہ کھیل رہے تھے اس کی مناسبت سے انھوں نے ایک دوسرے کے خفیہ نام رکھے۔ مصطفےٰ

بھارتی ہائی کمیشن کو فون کر کے کہتے کہ "آصف علی" سے بات کرنی ہے۔ اپنا نام وہ "دلیپ" بتاتے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کے شوق میں جوشی اور مصطفےٰ نے اپنے مذہبی تشخص تک کا ادلا بدلا کر لیا تھا۔ اس دوقومی نظریے کو، جس کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا تھا، طنزآمیز انداز میں تیاگ دیا گیا۔ جو منصوبے بنائے جا رہے تھے ان سے اس نظریے کی مکمل نفی کی نوبت آ سکتی تھی۔

ملاقات کا وقت ٹیلی فون پر طے کیا جاتا۔ دونوں ہمیشہ کسی وِمپی بار میں ملتے جو لندن میں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ وہ ساتھ بیٹھ کر پلاسٹک کے ان لال ڈبوں سے، جن کی شکل کسی عجیب وغریب بنا پر، حلوا کدو جیسی ہوتی ہے، بے مزہ اور مشینی انداز میں بنے برگروں پر ٹماٹو کیچ اپ نچوڑتے رہتے۔ تلے ہوئے آلوپاروں پر دونوں ملکوں کے مستقبل پر اور مخصوص نوعیت کی چالوں گھاتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا جاتا۔

ملاقات ہر بار کسی مختلف وِمپی بار میں ہوتی۔ میں نادانستہ طور پر، چھندرت .بی، متعدد بار مصطفےٰ کے ساتھ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں آس پاس کی کتابوں کی دکانوں میں وقت گزارتی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر رسالوں وغیرہ کو دیکھتی رہتی جنھیں مجھے ہاتھ لگانے کی بھی ممانعت تھی۔ ان کی ملاقات کوئی گھنٹے بھر جاری رہتی۔ ان میں جو بات چیت ہوتی اس سے مجھے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ میرا شوہر بھارتیوں سے مل کر پاکستان میں جمہوریت بحال کرنے کے کسی منصوبے کی تفصیلات پر کام کر رہا ہے۔

ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعض دفعہ مصطفےٰ جوشی سے ہفتے میں دو بار ملتا۔ ملاقات ہر بار جوشی سے ہوتی۔ مستقل رابطہ اسی سے تھا۔

ہم چھٹیاں منانے شارجہ جا رہے تھے۔ پرواز کے دوران مجھے بتایا گیا کہ ہم بھارت بھی جائیں گے۔ راجیوگاندھی سے ملاقات کا بندوبست ہو چکا ہے۔ سنجے گاندھی، جو اندرا کا سیاست داں بیٹا تھا، پائلٹ بننے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ راجیوگاندھی، جو اندرا کا پائلٹ بیٹا تھا، اب سیاست داں بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملاقات کا بندوبست ہماری ایک دوست، فریدہ میتر، نے کیا تھا جو شارجہ میں رہتی تھی۔ اس کی گاندھی خاندان سے دوستی تھی۔

ملاقات کا وقت طے ہو جانے تک ہم شارجہ میں انتظار کرتے رہے۔ دہلی روانہ ہونے سے ذرا پہلے مصطفےٰ نے بڑی بیوقوفی کی حرکت کی۔ شام کے وقت ہم سلمان تاثیر اور اس کی دوست تولین سنگھ کے ساتھ تھے۔ جو ایک بھارتی صحافی ہے۔ مصطفےٰ نے ذکر کیا کہ وہ کل دہلی جا رہا ہے۔ سلمان نے بھی دہلی چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے پاس

ویزا نہیں تھا اور ایسی کوئی صورت بھی نہیں تھی کہ اتنے مختصر نوٹس پر ویزا مل سکے۔ مصطفےٰ نے ہنسی میں آکو کہا کہ وہ "انتظام کر لے گا۔" مجھے قدرے تعجب ہوا۔

ہم دہلی پہنچے۔ وہاں انٹیلی جنس کے افسر ہمارے منتظر تھے۔ وہ ہمیں آن کی آن میں امی گریشن کے سارے جھنجھٹ سے نکال کر لے گئے۔ سلمان کو روک لیا گیا۔ وہ ویزا کے بغیر باہر نہ جا سکتا تھا۔ تولین نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ امی گریشن حکام نے ہم دونوں کو کیسے جانے دیا جب کہ ویزا ہمارے پاس بھی نہ تھا۔ تولین معروف صحافی تھی۔ ہماری آمد راز نہ رہی۔

اگر یہ خبر اخباروں میں آ جاتی تو بڑا سنسنی پھیلانے والا سکوپ ثابت ہوتی۔ اس خبر کو دبانے کی غرض سے انٹیلی جنس افسروں نے مداخلت کی اور سلمان تاثیر کو ویزا کے بغیر بھارت میں داخل ہونے دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ نے بہت بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ اُس نے ہمارے ساتھیوں کو یہ تو نہیں بتایا تھا کہ وہ راجیوگاندھی سے ملنے جا رہا ہے۔ بہر حال، اس بات پر کہ وہ بھارت جا رہا تھا اور اتنی حیثیت کا مالک تھا کہ ہوائی اڈے پر ایک معمولی پاکستانی سیاست داں کے لیے ویزا کا بندوبست کر سکتا تھا۔ لوگوں کو ضرور اچنبھا ہوا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارا معاملہ ہمارے میزبان کو ذرا نہ بھایا۔ ہوائی اڈے پر ہونے والی پچ پچ سے راجیو کو مطلع کر دیا گیا اور اس نے مصطفےٰ سے مل کر کسی طرح کی بدنامی مول لینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں راجیو کی طرف سے ایک مختصر اور روکھا پیغام ملا۔ اس نے ایک بھارتی صحافی کے ساتھ سفر کرنے اور اپنی خفیہ آمد کو توجہ کا مرکز بنا لینے پر مصطفےٰ کو بھارام، افسوس ظاہر کیا کہ اس بار وہ ان سے نہ مل سکے گا اور کہا کہ آئندہ زیادہ احتیاط کا ثبوت دیا جائے۔

ہم اوبیرائے کی مہربانی سے، جو فریدہ میتر کا دوست تھا، اوبیرائے ہوٹل میں ٹھیرے۔ ہمیں دہلی سے باہر ان کے فارم پر بھی مدعو کیا گیا اور بعض پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سیاست کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ راجیو نے مصطفےٰ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کی۔

ڈیڑھ ماہ بعد مصطفےٰ نے راجیوگاندھی کے ساتھ ایک اور ملاقات کا بندوبست کیا۔ اس بار وہ اپنے رابطے یعنی جوشی کے حوالے سے بھارت پہنچا اور راجیو سے ملا۔ بعد میں مصطفےٰ نے مجھے بتایا کہ اُس نے دیکھا راجیو کے سیاسی قدوقامت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ پُراعتماد تھا اور مصطفےٰ کا نقطۂ نظر سمجھ گیا۔ مصطفےٰ کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ بتدریج

ابھر کر سامنے آنے والے سیاسی منظر کی باریکیوں پر اس کی کتنی گہری نظر ہے۔ راجیو نے اس منصوبے سے اتفاق کیا جس پر مصطفےٰ بھارتیوں کو اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا۔ مصطفےٰ سنجے کا معترف تھا اور اس کی الم ناک موت کی خبر سن کر افسردہ ہوا تھا۔ راجیو سنجے جیسی ساحرانہ کشش کا مالک تو نہ تھا لیکن مصطفےٰ کو بہت ملنسار لگا۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ ملاقات اچھی رہی ہے۔

جوشی کے ساتھ ملاقاتیں باقاعدہ وقفوں سے جاری رہیں۔ کسی منصوبے کو شکل دی جا رہی تھی۔

مصطفےٰ پاکستان کی مسلح افواج میں چوری چھپے نفوذ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ غیر مطمئن فوجی افسروں کا ایک گروپ اس سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ یہ جونیئر افسر جنرل ضیا سے ناخوش تھے اور سمجھتے تھے کہ فوج کا کوئی کام نہیں کہ ملکی سیاست میں دخل دیتی پھرے۔ ان کی نظرِ انتخاب مصطفےٰ پر اس لیے پڑی کہ ان کے خیال میں مصطفےٰ دبنگ آدمی تھا۔ جن اصلاحات کی افسروں کے نزدیک ملک کو ضرورت تھی انہیں مصطفےٰ جیسا سیاست دان ہی نافذ کر سکتا تھا۔ ان کا پنجابی رہنما ہونا سونے پر سہاگا تھا۔ افسر جانتے تھے کہ پاکستان میں سول حکومت کی بحالی کے لیے چلائے جانے والی کوئی بھی تحریک اہلِ پنجاب کی تائید اور شرکت کے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ انہیں یقین تھا کہ مصطفےٰ پنجاب کے عوام کو صف آرا کرنے اور تحریک میں حصہ لینے پر اکسانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

نوجوان فوجی باغیوں نے محسوس کیا کہ جنرل اور اس کے حواری جنرلوں کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔ جمہوریت کو بحال کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ عدالتیں بہت زیادہ اطاعت گزار ثابت ہوئی تھیں۔ اور عوام میں، جو جبر و تشدد کا نشانہ بنتے رہے تھے، اٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی۔

نوجوان افسروں سے ابتدائی رابطے تھوڑے تذبذب کے ساتھ قائم کیے گئے کہ دیکھیں تو سہی ان کی نیت کیا ہے۔ طرفین پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے کو آزماتے رہے۔ انہوں نے لندن میں ایک مشترکہ دوست کے فلیٹ پر ملاقات کی۔ مصطفےٰ کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ امید لگائے ہوئے تھا کہ ایک نہ ایک دن فوج کی زرہ بکتر میں کوئی رخنہ ڈھونڈ نکالے گا۔ اُس نے فوج کے نوجوان افسروں سے رومانی تصورات وابستہ کر رکھے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ ان افسروں کے درمیان سے کوئی انقلابی قیادت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ جنرل بددیانت تھے۔ نچلے درجے کے افسر اور سپاہی وطن دوست پیشہ ور تھے۔ ان افسروں کی صورت میں انہیں اپنی امیدیں

پوری ہوتی اور خواب شرمندہ تعبیر ہوتے دکھائی دیے۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ضیا کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ فوج کی نچلی صفوں میں سرکشی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ضیا کے اپنے حلقۂ انتخاب نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

منصوبہ تیار کیا گیا۔ طے یہ پایا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان افسر ایک بم نصب کر دیں گے۔ جب فوج کے اعلیٰ عہدے دار کسی اجلاس کے لیے اکٹھے ہوں گے تو بم پھٹ جائے گا۔ بات چیت کے ذریعے تاریخ اور جگہ کا تعین ہو گیا۔ بم پھٹتے ہی نوجوانوں کے گروہ دھاوا بول کر پاکستان بھر میں ریڈیو اور ٹیلی وژن سٹیشنوں پر قبضہ کر لیں گے۔ جنرلوں کے خلاف ایک جوابی بغاوت برپا ہو گئی۔ پیپلز پارٹی کے قائد کو وزیراعظم بنا دیا جائے گا۔ نئی حکومت میں مصطفےٰ کھر کو نمبر دو کا مقام حاصل ہو گا۔ ضیا اور اس کے ساتھیوں کی موت سے ملک بے یقینی اور افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔ تمام جلاوطن پاکستان لوٹ آئیں گے۔ عوامی طاقت کو اس طرح مجتمع کیا جائے گا کہ کوئی اور جنرل کبھی اقتدار پر قبضہ نہ کر سکے۔ اب سب پر، جو 1977ء کی بغاوت میں ملوث تھے، غداری کے الزام میں مقدمہ چلے گا۔ "بجلی کے ہر کھمبے سے جنرل لٹکتے نظر آئیں گے۔" جو بھی مجرم پایا گیا اُسے بخشا نہیں جائے گا۔ فوج کی تطہیر کی جائے گی۔ فوجی آمروں کا ساتھ دینے والوں کو بے نقاب کر کے ان پر مقدمے چلائے جائیں گے۔

چھ سال بعد ٹھیک اس دن جو ناکام سازش کے لیے چنا گیا تھا، مصطفےٰ کا زاہی وژن حقیقت بن کر سامنے آیا۔ جنرل ضیا اور اس کے قریب ترین ساتھیوں کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ لیکن یہ دھماکا زمین پر نہیں فضا میں ہوا۔ جن لوگوں نے اقتدار سنبھالا وہ اتنے منتقم مزاج نہیں تھے۔ جتنا شاید مصطفےٰ ہوتا۔ انہوں نے عین اس وقت جب فیصل مسجد کے احاطے میں ضیا کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی پرانے جھگڑوں پر مٹی ڈال کر صلح صفائی کی راہ ہموار کر دی۔

منصوبے پر عمل در آمد کے لیے "لڑکوں" کو ہتھیار درکار تھے۔ انہوں نے ہتھیاروں کی فہرست تیار کی۔ وہ فہرست مصطفےٰ نے سنبھال کر رکھنے کے لیے مجھے دے دی۔ مجھے یاد ہے فہرست پر میں نے نظر ڈالی تھی۔ خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ اسلحہ اور ایمونیشن کی خریداری کا بندوبست مصطفےٰ کے ذمے تھا۔ انہیں کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا تھا جو اس اسلحہ اور گولہ بارود کو پاکستان سمگل کر کے "لڑکوں" تک پہنچا دے۔ خریداری کا مسئلہ طے پا گیا۔ جوشی نے ایک اور ریڈ نما برگر کھاتے ہوئے اسلحہ کی فراہمی کی ہامی بھر لی۔ اسلحہ کو پاکستان میں مقررہ جگہ تک پہنچانا زیادہ ٹیڑھا مسئلہ تھا۔

علی محمود کو اعتماد میں لیا گیا۔ وہ ابوظہبی میں تعمیراتی ٹھیکوں سے [illegible] پیسہ کما چکا

تھا اور اس آپریشن کے اخراجات برداشت کر سکتا تھا۔ مصطفیٰ نے اس معاملے پر اس کے ساتھ بات چیت کی۔ معاوضے کے طور پر یہ لالچ دیا گیا کہ نئی حکومت میں اسے وزیر خزانہ بنا دیا جائے گا۔ علی اور اس کی بیگم بلو اب مصطفیٰ کے سیاسی حلیف بن گئے۔

ہم علی کے گھر منتقل ہو گئے جو ویلون گارڈن سٹی میں واقع تھا۔ واقعات زیادہ تیزی سے پیش آنے لگے۔ جوشی نے پاکستانی سرحد کے پاس ایک بھارتی گاؤں میں اسلحہ ذخیرہ کرنے کا بندوبست کر دیا۔ اسلحہ لکڑی کے کریٹوں میں بند تھا اور کریٹوں پر ترتیب وار نمبر لگے ہوئے تھے۔ اب کسی ایسے آدمی کی تلاش شروع ہوئی جو اس ممنوعہ مال کو سمگل کر کے پاکستان لا سکے۔ جب یہ اسلحہ وہاں سے لیا جائے گا تو بھارتی بارڈر گارڈز اور کسٹم والے یہ ظاہر کریں گے جیسے انہیں پتہ ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ مصطفیٰ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس علاقے سے بخوبی واقف ہو اور پاکستانی کسٹم والوں اور فوجی چوکیوں سے بچ کر آ جا سکتا ہو۔

ایک روپے کے نوٹ کو دو حصوں میں پھاڑا گیا۔ آدھا حصہ بھارتی رابطے کے حصے میں آیا۔ باقی نصف سمگلر کو دیا جانا تھا۔ اسلحہ کی ڈلیوری لینے اور اس لین دین کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے دونوں ٹکڑوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی چالیں اسی کو سوجھ سکتی ہیں جو سستی قسم کی سنسنی سے بھرپور بھارتی فلمیں دیکھتا رہتا ہو۔ لیکن یہ فلم نہ تھی، عین حقیقت تھی۔

سمگلر کا کردار ادا کرنے کے لیے سیٹھ عابد کے چناؤ میں کسی پس و پیش کی گنجائش نہ تھی۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ اس نے مالی طور پر ہماری مدد کی تھی اور اپنے برونڈز بیری پارک والے گھر میں ہمیں قیام کرنے دیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ محمود ہارون کے بہت قریب ہے جو ضیا کی کابینہ میں وزیر تھا۔ سیٹھ عابد کا بہنوئی/سالا مسعود محمود اس مقدمے میں وعدہ معاف گواہ بنا تھا جس نے بھٹو صاحب کو تختۂ دار تک پہنچا دیا تھا۔ سیٹھ عابد کے بڑے پائے کا سمگلر ہونے میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی لیکن ضیا حکومت سے اس کی راہ ورسم شروع شروع میں ہماری آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ یہ الزام بھی تھا کہ سیٹھ عابد ایٹمی راز اور پرزے پاکستان سمگل کرتا رہا ہے۔

مصطفیٰ کے ایک پرانے ساتھی تصور شاہ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ وہ مصطفیٰ کے ساتھ شکار کھیلتا رہا تھا۔ مصطفیٰ محسوس کرتا تھا کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ تصور شاہ چونکہ اس علاقے میں شکار کھیلتا رہا تھا اس لیے وہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ علاوہ ازیں اس کے بہادر اور دبنگ ہونے کا شہرہ بھی تھا۔ اسے لندن طلب کیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ بھارت سے چند کریٹ سمگل کر کے پاکستان لانے ہیں۔ لیکن یہ

پتہ نہیں دیا گیا کہ کریٹوں میں کیا ہے۔ تصور شاہ مصطفیٰ کے لیے ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ تصور شاہ کا بار بار انٹرویو لیا گیا اور آخر میں مصطفیٰ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ اس میں جتنا جوش یا حوصلہ تھا تجربہ اتنا نہ تھا۔

طے پایا کہ سیٹھ عابد سے رابطہ قائم کیا جائے۔ یہ بہت بڑا جوا تھا۔ مصطفیٰ کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا تھا۔ جنرل ضیا سے نفرت نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ پلان کا دارومدار اس پر تھا کہ اسلحہ بغیر کسی دقت کے پاکستان پہنچ جائے۔ پاکستان میں صرف ایک ہی شخص اسلحہ کو صحیح جگہ پہنچانے کی ضمانت دے سکتا تھا۔ وہ شخص سیٹھ عابد تھا۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں پاکستان سیٹھ عابد کو فون کروں۔ اس سے نہ تو علی نے بات کی نہ مصطفیٰ نے۔ ذرا تصور کریں اس وقت میری کیا ذہنی کیفیت ہو گی۔ میں غداری کے جرم میں اعانت کر رہی تھی۔ میں وسیلہ بن کر ادھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات ادھر پہنچانے میں مصروف تھی۔ میرا شوہر میرے دامن کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا۔ انٹیلی جنس کی ہر بریفنگ میں ٹیپ پر ہمیشہ میری ہی آواز سنائی دیا کرے گی۔ میں نے فون کیا۔

چند بار گھنٹی بجنے کے بعد سیٹھ عابد نے فون اٹھایا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بھی مجھے سلام عرض کیا۔ میں نے اصل مدعا بیان کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگائی۔ "ہم آپ سے فوراً بات کرنا چاہتا ہے۔ مصطفیٰ چاہتے ہیں کہ آپ لندن آ جائیں۔ ہمیں آپ سے بہت اہم کام ہے۔ ہمیں ایک سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ جو بات ہے وہ میں اس طرح کھلے بندوں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتی۔" سیٹھ عابد سہم گیا۔ وہ بہت نروس دکھائی دینے لگا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے پہچاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ "نہیں... میں... میرا خیال نہیں کہ میں... ان سے بات کر سکتا ہوں۔ میرے خیال میں... مجھے بات کرنی بھی نہیں چاہیے۔ میں پاکستان میں رہتا ہوں۔ خدا کے لیے میرے خاندان کا خیال کریں۔ پلیز بات کو سمجھیں۔" اس کے بعد ذرا دیر کے لیے موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر "سنیں... ا... مجھے دوبارہ فون کریں۔ اسی نمبر پر۔ آدھے گھنٹے بعد۔" اس نے فون بند کر دیا۔ میں پریشان ہو گئی۔

میں نے علی، بلو اور مصطفیٰ کو بتایا کہ سیٹھ عابد تو بہت نروس ہے۔ مجھے لگتا نہیں ایسا کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا فون ٹیپ کیا جاتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون کیا۔ اس دفعہ بہت پُرسکون سیٹھ عابد سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کی۔ کرید کرید کر سوال کرتا رہا۔ بعض باتیں مجھ سے دو دو بار کھلوائیں۔ اس کے رویے کی مکمل کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ کہاں آدھے گھنٹے پہلے کا وہ آدمی جو تھر تھر کانپ رہا تھا، کہاں یہ آدمی جو مجسم اعتماد تھا۔ "مصطفےٰ چاہتا ہے کہ آپ اُس سے آکر ملیں۔" میں نے کہا۔ "اوہ، مصطفےٰ صاحب چاہتے ہیں کہ میں ان سے آکر ملوں؟" اس نے دریافت کیا۔ "کام بہت جلدی کا ہے۔" "بہت جلدی کا؟ کیا اس بات کا سیاست سے کوئی تعلق ہے؟ کیا وہ مجھ سے سیاست پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں؟ میں حاضر ہو جاؤں گا۔" مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے ٹیپ چلنے کی آواز میرے کان میں آرہی ہو۔

جب ٹیلی فون پر یہ عجیب وغریب مکالمہ آخر کار اختتام کو پہنچا تو میں نے اپنے خدشات علی، بلو اور مصطفےٰ کے گوش گزار کر دیے۔ "یہ شخص گفتگو ٹیپ کرتا رہا ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سارا انداز صرف آدھ گھنٹے میں بدل گیا۔ وہ اتنا پُرسکون کیسے ہو گیا؟ مجھے اتنی دور سے بھی دال میں کالا نظر آرہا ہے۔ وہ اچانک ہم پر اتنا مہربان کس لیے ہو گیا ہے؟"۔

مصطفےٰ مجھے گھورنے لگا۔ اُس نے کہا کہ میرے اندیشے اعصابی تناؤ کا دورہ پڑنے کا نتیجہ ہیں۔ میں اناڑی ہوں۔ ضرورت سے زیادہ ردعمل ظاہر کر رہی ہوں۔ بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہوں۔ میں نے حیران ہو کر سوچا کہ کہیں وہ خود ہی ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی اور اعتبار کر بیٹھنے والا تو ثابت نہیں ہو رہا۔ میں نے علی اور بلو سے کہا کہ مصطفےٰ کو سمجھائیں کہ سیٹھ عابد پر بھروسا نہ کرے۔ مصطفےٰ ان کے اندیشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ جب انھوں نے سنا کہ سیٹھ عابد لندن آرہا ہے تو ان سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ سیٹھ عابد کی بڑی گرم جوشی سے آؤبھگت کی گئی۔ سب سے اہم مہرہ بساط پر صحیح جگہ پہنچ گیا تھا۔

صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جہاں سیٹھ عابد جیسے لوگ پنپ سکتے ہیں۔ اپنی داغ دار شہرت کے باوجود اتراتے پھرتے ہیں۔ انھیں سماجی طور پر قبول کر لیا جاتا ہے اور وہ اپنا کاروبار بغیر کسی دقت کے جاری رکھتے ہیں۔ ان کی دولت کی وجہ سے لوگ انھیں گوارا کر لیتے ہیں۔ یہی دولت انھیں محاسبے سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں سمگلنگ کوئی جرم نہیں بلکہ ایک طرح کی تجارت ہے جس میں جوکھم بہت زیادہ ہیں اور منافع اس قدر ہے کہ جوکھم اٹھانے میں مضائقہ نہیں۔ جس انتظامی ڈھانچے کو ان کے ناپاک منصوبوں کا تدارک کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے وہ اس میں بدعنوانی کا زہر

گھول کر اپنے بچاؤ کا سامان کر لیتے ہیں۔ تحریری معاہدوں کے بغیر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ دستاویزوں سے تو آدمی پر الزام آ سکتا ہے۔ الفاظ ٹھیرے ہوائی چیز، پکڑ میں نہیں آ سکتے۔ ان کے قول کو زرِ قانونی کی حیثیت حاصل ہے۔

سیٹھ عابد سے قول قرار ہو گیا۔ اس نے کریٹوں کو سرحد کے پار سے اس پار لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے مصطفےٰ کو یقین دلایا کہ ہتھیار مقرر تاریخ کو طے شدہ مقام پر یعنی لاہور کے ایک مکان تک پہنچا دیے جائیں گے۔ پھٹے ہوئے نوٹ کا نصف اور خفیہ نام میرے پاس تھے۔ وہ میں نے سیٹھ عابد کے حوالے کر دیے۔

اس سے پہلے، بائیں بازو کے ایک وکیل، رضا کاظم، کو لندن طلب کیا جا چکا تھا۔ اسے بتا دیا گیا کہ منصوبہ کیا ہے لیکن یہ بات چھپائی گئی کہ اس کا بھارت سے کوئی تعلق ہے۔ اسے مصطفےٰ اور نوجوان فوجی افسروں کے درمیان رابطے دار کا فریضہ سونپا گیا۔ "کرنلوں" کا مورال بلند رکھنے کا کام بھی اسی کے ذمے لگا۔ پارٹی کے سرکاری نظریہ ساز کا کردار بھی رضا کاظم ہی کے حصے میں آیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ "کرنلوں" کو مارکسزم کا سبق دے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ وہ پارٹی کے سرکاری لائحۂ عمل سے ذرا بھی ادھر اُدھر نہ ہوں۔

شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ "کرنلوں" نے مصطفےٰ کو خبر دی کہ رضا کاظم ان کے بارے میں توہین آمیز باتیں کرتا رہا ہے۔ بظاہر کاظم کو یہ ناپسند تھا کہ پارٹی کے سربراہ اعلیٰ کا مقام مصطفےٰ کو حاصل رہے۔ وہ خود کو لینن سمجھتا تھا۔ اس نے "کرنلوں" کو یہی بتایا۔ اس کی دانشورانہ اکڑفوں کا نتیجہ الٹا نکلا۔ نوجوان فوجی افسروں نے مصطفےٰ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

رضا کاظم انقلاب کو ہائی جیک کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا۔ اسے مصطفےٰ نے سرِدست نظر انداز کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ضیا کا خاتمہ کرنے کا عظیم منصوبہ کسی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔

رقوم کا تبادلہ ہوا۔ رضا کاظم کا کام ادھر سے رقم لے کر ادھر پہنچانا تھا۔ رقم جوشی نے فراہم کی تھی۔ وصول "کرنلوں" نے کی۔

جتوئی صاحب کو جزوی طور پر اعتماد میں لیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ کہ وہ تیار رہیں۔ کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہے۔ انھیں ہونے والی فوجی بغاوت کی خبر نہیں دی گئی۔ انھیں بھارتی رابطے کا نہیں بتایا گیا۔ انھیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ جنرلوں کو بم کے دھماکے سے اڑانے کا پلان تیار کیا گیا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ جوشی سے ملنے والی رقم مصطفےٰ نے جتوئی صاحب کو بھجوا دی۔ جتوئی

صاحب نے رقم رضا کاظم کے حوالے کی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ جتوئی صاحب کا مزاج بہت زیادہ پارلیمانی ہے اور وہ تشدد کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی ہر کارروائی کی مخالفت کرتے۔ لیکن ساتھ ہی وہ بہت ہی وفادار دوست بھی تھے۔ انہیں مصطفےٰ پر انتہا کا اعتماد تھا۔

یوم عمل قریب آ پہنچا۔ میں "ٹرکوں" سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھی۔ مجھے یہ احساس تک نہ ہوا کہ میں بھی شریک جرم ہوں۔ میں تمام پیغامات ان تک پہنچاتی رہتی اور کوڈ ایجاد کرنے اور معمائی زبان میں گفتگو کرنے میں خاصی طاق ہو گئی۔ جیسا کتوں، کنیزوں اور کبوتروں کے سلسلے میں ہو چکی تھی۔ مصطفےٰ کی بہ نسبت "ٹرکوں" کی بہبود اور سلامتی کی فکر مجھے زیادہ تھی۔ مجھے ان سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ میں راتوں کو کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہتی۔ مصطفےٰ مزے سے سوتا رہتا۔ وہ فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔

علی، بلو اور مصطفےٰ بیشتر وقت آپس میں صلاح مشورہ کرکے جزئیات کی وضاحت یا پلان کے نقائص دور کرتے رہتے۔ اس بارے میں انہیں کچھ گھبراہٹ تھی کہ وہ ابھی تک کسی سینئر فوجی افسر کو اپنا ہم نوا نہیں بنا سکے تھے۔ کسی ایسے آدمی کو ہاتھ میں لینا انتہائی ضروری تھا۔ فوج کے اعلیٰ ترین افسروں میں کئی کے بارے میں معلوم تھا۔ کہ وہ پیپلز پارٹی سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ طے پایا کہ ان سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کی تائید حاصل کی جائے۔ جنرل رفیع عالم سے رابطہ کیا گیا لیکن اس وقت وہ ہمیں اپنے مطلب کے لیے موزوں نظر نہ آیا۔ وہ انگلینڈ آیا بھی اور ہم سے ملا بھی لیکن اسے منصوبے کی خبر تک نہ دی گئی۔

اب لے دے کر ہمارے پاس جنرل کلو رہ گیا۔ بلو اس سے بات کرنے پاکستان گئی۔ علی اس کے ہمراہ نہ جا سکا کیونکہ اس کے خلاف پاکستان میں ٹیکسوں کے حوالے سے مقدمات درج تھے۔ بلو جنرل کلو سے مل کر خوش خوش واپس آئی۔ اس نے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل مصطفےٰ اور علی کے سامنے بیان کی۔ اس رات مصطفےٰ نے مجھ سے کہا کہ جنرل کلو بھٹو صاحب کا پرستار ہے اور پی پی پی کے جنرل کے طور پر مشہور ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ جنرل کلو ہماری حمایت کر رہا ہے۔ ہمیں اس جیسے کسی سینئر افسر کی ضرورت تھی۔ اب ہم اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر سکتے ہیں۔"

سات سال بعد جنرل کلو کو ریٹائرمنٹ سے واپس بلا کر آئی ایس آئی کا چیف بنا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے جوشی کو اس نئی پیش رفت سے مطلع کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ پاکستانی

فوج میں نفوذ کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اب یہ فوج ایسی تنظیم نہ رہی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک کہیں جوڑ یا رخنہ نظر نہ آتا ہو اور جو اس حقیقت پر استوار ہو کہ ہر حال میں اپنے عہدے کا وفادار رہنا ہے۔ فوج کی آئیڈیالوجی کو کھوکھلا کر دیا گیا تھا۔ مصطفےٰ کھر نے جو کہا تھا کر دکھایا تھا۔ سازش میں کسی جنرل کی شرکت لاجواب کارنامہ تھا۔ جوشی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے پاکستانی فوج کی اعلیٰ ترین صف میں اپنا ایک ایسا آدمی داخل کر دیا تھا جس سے وقت پڑنے پر کام لیا جا سکتا تھا۔ جوشی کو کلو سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ وہ بالمشافہ مل کر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کلو کس قسم کا آدمی ہے۔ مصطفےٰ نے وعدہ کیا کہ جنرل کلو جب بھی لندن آیا وہ اسے جوشی سے ملوا دے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی ہو گی تو یقیناً اسے ایک تاریخی لمحہ سمجھنا چاہیے۔ جوشی ایک دن "را" کا سربراہ بننے والا تھا۔

آخر کار سیٹھ عابد نے جو ہر بار کسی مختلف ٹیلی فون سے بات کرتا تھا، ہمیں مطلع کیا کہ "پارسل" صحیح جگہ پہنچ چکے ہیں۔ انہیں ایسے مکان میں رکھوا دیا گیا ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے۔ مصطفےٰ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سیٹھ عابد نے کام کر دکھایا تھا۔

"ٹرکوں" سے کہا گیا کہ وہ لاہور میں مال روڈ پر چلتے ہوئے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کے بالمقابل پہنچ جائیں جہاں ایک آدمی کاغذ کا پرزہ لیے ان کا منتظر ہو گا۔ پرزے پر کن آباد، لاہور کے اس مکان کا پتہ درج تھا جہاں کریٹ رکھوائے گئے تھے۔ "ٹرکوں" سے کہا گیا کہ وہ اپنی گاڑی بدل لیں اور انتظار کریں۔ شام کو ساڑھے سات بجے انہوں نے مکان پر جا کر ان ہتھیاروں کو اپنی تحویل میں لینا تھا جنہیں جمہوریت کی بحالی کے کام آنا تھا۔

پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ ہم "ٹرکوں" کے فون کے منتظر تھے۔ انہوں نے فون کیوں نہیں کیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق نو بجے فون کریں گے۔ مجھے نظر آیا کہ پسینے چھوٹنے والے ہیں۔ مسلسل چہل قدمی سے قیمتی قالین گھس پس گئے۔ کوئی ہولناک گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔ خاموشی۔ مقبروں جیسے سکوت سے ہمارے حواس گنگ ہو کر رہ گئے۔ میں ان گنت بار کافی بنا بنا کر پیالیوں میں انڈیلتی رہی اور چپ چاپ بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔ میں ان خیالی تصویروں سے لڑنے میں مصروف تھی جو میرے ذہن میں دوڑتی چلی آ رہی تھیں۔ ہم کیا کر بیٹھے تھے؟ "ٹرکے" کہاں تھے؟ خدا کے لیے فون تو کرو۔ ادھر ایسا لگ رہا تھا جیسے فون نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہو۔ ہم جنونانہ

بوکھلاہٹ کے راستے یہاں تک پہنچے تھے اور اب اچانک سراسیمگی نے ہمیں دبوچ لیا تھا۔

سسپنس کا یہ عالم میری برداشت سے باہر تھا۔ مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ میں "ڈرگوں" میں سے کسی کے گھر فون کروں۔ مجھے ڈائل ٹون کے ساتھ اپنا دل بھی دھک دھک کرتا سنائی دے رہا تھا۔ میں نے میجر آفتاب کو فون کیا۔ اس کی بیوی نے فون اٹھایا۔ اس کا لہجہ غیر فطری اور سرد معلوم ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "وہ یہاں نہیں ہیں۔ براہ کرم ہمیں فون نہ کریں۔" میں نے کانپتے ہاتھوں نے اپنی چھوٹی سی نوٹ بک کے ورق الٹے جس میں دوسرے سازشیوں کے فون نمبر درج تھے۔ جانے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ یاالٰہی، تو ہی ان کا نگہبان ہو! میں نے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ بہت بار گھنٹی بجی۔ جواب ندارد۔ پھر ایک آواز آئی۔ نسوانی آواز۔ سکوڈرن لیڈر طاہر کی بیوی کی آواز۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے ماؤتھ پیس میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ سات سمندر پار میں اس کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی۔ "گھر میں ہر طرف فوجی ہی فوجی ہیں۔ وہ میرے خسر اور طاہر کے بھائیوں کو لے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بھائیوں کو لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے تلاشی لینے کے بہانے سارا گھر اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ان سب کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں" میری بھی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ میں نے خود کو بالکل بے بس محسوس کیا۔ میں کمرے میں موجود پژمردہ اور سنجیدہ چہروں کو تکنے لگی۔ انھوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہمیں پتہ کرنا ہو گا کہ کیا ہوا ہے۔ مجھے تو لازمی طور پر پتہ کرنا ہو گا۔ میں نے میجر بخاری کے گھر فون کیا۔ اس بار بھی بیوی سے بات ہوئی۔ "میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے ارد گرد بہت زیادہ لوگ موجود ہیں۔" فون واپس رکھنے کی آواز۔ ہر جگہ ایک ہی وقت میں چھاپا پڑا تھا۔ ہر گھر میں فوجی پہنچے ہوئے تھے۔ بغاوت کچل دی گئی تھی۔ میرے پاس نمبروں کی جو فہرست تھی میں اس کے مطابق فون کرتی گئی۔ ہر جگہ یہی قصہ تھا۔

ہم ایج ویر روڈ سے پرے واٹرگارڈنز میں بلو کے اپارٹ منٹ میں تھے۔ میں اپنا غم ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی۔ بے گناہ خاندانوں کے دلوں میں جو دہشت چھائی ہوئی ہو گی میں اسے محسوس کر سکتی تھی۔ اپنی بے بسی پر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا کہ ہم نے انھیں ایسے جوکھم میں دھکیل دیا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ کام بگڑا کیسے۔ مجھے ایسے لوگوں کی تلاش نہ تھی جن کے سر سارا الزام مڑھ دیا جائے۔ میں اصل مجرم کا پتہ چلانا چاہتی تھی۔ ہم سب مجموعی طور پر قصوروار تھے۔ میر اور شاہنواز کا مہم جوئی کا شوق، جس کا مصطفیٰ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا تھا، بالکل بے حقیقت لگر

آنے لگا۔ ہم سے کہیں بڑی حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ ہمارے "ڈرگے" تو سراسر بے خبری کے عالم میں مار کھا گئے۔ میرے دل نے کہا کہ سیٹھ عابد نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ قصور مصطفیٰ کا تھا۔ میں نے اس شخص کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا اس پر انھوں نے کان نہ دھرے تھے۔ میں بلو سے بار بار کہتی رہی کہ مجھے سیٹھ عابد پر اعتبار نہیں۔ میں نے ضد کی کہ وہ مصطفیٰ کو قائل کرے۔ میں اپنی بات کسی اور کی زبانی کہنا چاہتی تھی۔ مصطفیٰ میری بات کاٹ چکا تھا۔ "بیچ میں مت بولو۔ تمہیں ڈراؤنے خیال آتے رہتے ہیں۔ اپنے ذہن کو لگام دو۔" اس طرح کی سرزنش سے عورت کا وجدان اکثر کند ہو کر رہ جاتا ہے۔ "دخل دینے سے باز رہو اور علی اور بلو کے ذہن میں شکوک ابھار کر میرا کام مت بگاڑو۔"

مصطفیٰ نے آسان راستہ چن لیا تھا سیٹھ عابد کی مدد سے کام جھٹ پٹ ہو جانے کی امید تھی۔ نقشے میں صاف صاف لکھا ہوا تھا کہ "یہاں چھوہ بالو ہے۔" لیکن اس اشتباہ پر توجہ نہ دی گئی تھی۔ چھوٹی کے سیاست دان نے بری طرح ٹھوکر کھائی تھی۔ مصطفیٰ کی کوتہ بینی کے باعث "ڈرگوں" اور ان کے گھر والوں کو بے اندازہ تکالیف اٹھانی پڑیں۔ وہ برباد ہو گئے۔ عین جوانی میں ان کا بیڑا ہو گیا۔ زندگی بھر غداری کا داغ ان کے ماتھے پر لگا رہے گا۔ اگرچہ اب یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے مصطفیٰ کھر کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ داغ لگتے ہی مٹ جاتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ میں اچھل پڑی۔ سیٹھ عابد بول رہا تھا۔ جب اس نے میری آواز سنی تو کہنے لگا۔ "بھابھی۔" اور رونا شروع کر دیا۔ وہ بچ بچ فون پر روتا رہا۔ "میں ابھی ابھی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ نو بجے کی خبروں میں انھوں نے اعلان کیا کہ، مخبری ہونے پر، حسن آباد کے ایک مکان پر چھاپا مارا گیا۔ سمگل شدہ سونے کے کرٹ پکڑے گئے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ مجھ پر بھی الزام آئے گا۔" "سونا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "سونا کیسا؟ اسلحہ کہاں گیا؟" "وہ یہ خبر نہیں دینا چاہتے کہ ہتھیاروں کا ذخیرہ پکڑا گیا ہے۔ وہ پاکستانی عوام کو بتانا نہیں چاہتے کہ خود فوج کے اندر سے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اسلحہ سمگل کرنے کی ناکام کوشش میں فوج ملوث ہے۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ سونے کی کہانی تو حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اب میرے خاندان کا کیا بنے گا؟ کیا میں سرحد پار کر کے بھارت چلا جاؤں؟ مصطفیٰ صاحب میرے لیے سیاسی پناہ کا بندوبست کر سکتے ہیں کیا؟" میرا جی متلانے لگا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ جی چاہتا تھا اسے مار ڈالوں کیونکہ وہ ہمارے سامنے قرآن پر قسم کھا

کر گیا تھا۔ میں اس لیے بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اتنے بہت سے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں۔

بعد میں ہمیں اپنی ناکام مہم جوئی کی تفصیلات کا علم ہوا۔ لڑکے دو جیپوں میں سمن آباد والے مکان پر پہنچے۔ وہاں دو کمرے کریٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک کریٹ کھول کر پڑتال کی۔ مطلوبہ اسلحہ اس میں موجود تھا۔ کریٹ لے جا کر انھوں نے جیپوں پر لادنے شروع کیے۔ کام بڑی سلامت سے انجام پا رہا تھا۔ منصوبے کے عین مطابق کسی رکاوٹ کے بغیر۔ دوسری جیپ لادی جا رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی کام نمٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ "ان سالے جنرلوں کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے۔ ہم اس ملک کو دوبارہ راہِ راست پر لے آئیں گے"۔ وہ جیپ میں بیٹھے۔ اگنی شن میں چابی گھموی۔ پہلا گیر لگا۔ جیپ آگے لپکی۔ اچانک حشر برپا ہو گیا۔

وہاں گھات لگی ہوئی تھی۔ گھر کو فوج نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ "لڑکوں" کے چھکے چھوٹ گئے۔ انھوں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ دنادن فائر ہو رہے تھے۔ ابتری کا ایک لمحہ۔ بیرونی دباؤ کی تاب نہ لا کر ان کی زندگیاں اندر ہی اندر ڈھے گئیں۔ وہ کم تھے؛ ان کے حریف تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ وہ زخمی ہوئے مگر لڑتے رہے۔ بالآخر انھیں ہار ماننی پڑی۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسلحہ کا ذخیرہ پکڑا گیا۔ ٹی وی پر اعلان ہوا کہ سمگلروں کے ساتھ زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے اور بہت بڑی مقدار میں سونا پکڑا گیا ہے۔

حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے پر محمود ہارون نے سیٹھ عابد کو معاوضہ دینے کا بندوبست کیا۔ انیس سو ساٹھ اور انیس سو ستر کے درمیانی برسوں میں اس کے پاس سے بہت سارا سونا برآمد کیا گیا تھا۔ یہ سونا، جو کسٹمز کی تحویل میں تھا، کسی تکنیکی بنیاد پر اسے لوٹا دیا گیا۔ 1971ء سے اب تک سونے کی قیمت بڑھ چڑھ کر کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی۔ سیٹھ عابد کو موجودہ قیمت کے حساب سے معاوضہ ادا کیا گیا۔

سونے کی چمک دمک کے پیچھے شکستہ گھروں اور شکستوں سے چُور انسانوں کی داستان پنہاں تھی۔ "لڑکوں" کو انتہائی سیکورٹی والے قید خانوں میں رکھا گیا۔ ان کے پورے خاندان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ ان کی بیویوں کو لے جا کر ایسی جگہ رکھا گیا جہاں ان سے کوئی مل نہ سکتا تھا۔ ان کے خاندان کے مردوں کو تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ فوج نے اس راز کو خوب اچھی طرح چھپائے رکھا۔ "لڑکوں" کو یہ موقع نہ ملا کہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

انھیں عذاب دیا گیا۔ ان کے دلوں میں شر سے ٹکرا جانے کا جو حوصلہ تھا کچل ڈالا

گیا۔ انھوں بغاوت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے۔ انھیں گولی ماری جا سکتی ہے۔ بعد میں رضا کاظم کو بھی پکڑ کر اٹک کے کسی تنگ و تاریک تہ خانے میں ڈال دیا گیا۔

ان کے قبضے سے بھارتی اسلحہ برآمد ہونے کی وجہ سے ان کے المیے کی الم ناکی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ کم از کم اس معاملے میں "لڑکے" بے قصور تھے۔ انھیں ہمارے بھارتی رابطے کا سرے سے کوئی علم نہ تھا۔ ہم نے انھیں بتایا ہی کب تھا کہ اسلحہ کہاں سے آئے گا۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اسلحہ کسی غیر جانب دار ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ امکان یہی تھا کہ فوج کے اعلیٰ عہدے داروں کو اس بات پر یقین نہ آئے گا۔

مصطفےٰ کی کم بختی آ گئی۔ وہ ناکام ہو گیا تھا۔ یہی نہیں، اُس نے بھارتی حکومت کو بھی جرم میں الجھا دیا تھا۔ اُس کی وجہ سے ایسا وقوعہ ظہور پذیر ہوا تھا جو بین الاقوامی نوعیت کا حامل تھا۔ کسی نے، کسی قریبی ساتھی نے، اُس کے ساتھ دغا کی تھی۔ اُس کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ اُسے زیادہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کا کام تمام نہ کر دیا جائے۔ اس لیے بھی زیادہ ڈر اُسے یہ تھا کہ کہیں وہ بے یار و مددگار نہ رہ جائے۔ وہ ایسا رابطہ ثابت ہوا تھا جس سے تعلق رکھنا سخت خطرناک تھا۔ بھارتی شاید آئندہ اُس پر اعتبار نہ کریں۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو اُسے بھوٹو کے عظیم چیمپئن کے نام سے یاد کیا جاتا۔ ناکامی نے ان کے سینے پر غداری کا تمغا چسپاں کر دیا تھا۔ مصطفےٰ کے ردعمل پر میں حیران رہ گئی۔ میں تو "لڑکوں" اور ان کے گھر والوں کے لیے غم زدہ تھی، اُدھر مصطفےٰ نے انھیں بالکل بھلا دیا تھا۔ اُسے فکر تھی تو یہ کہ بھارتی ردعمل جانے کیا ہو گا۔

اُس نے جوشی سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی ملاقات ہوئی۔ مصطفےٰ بہت بڑبڑاتے اور سٹپٹاتے ہوئے واپس آیا۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان بے لاگ قسم کی گفتگو ہوئی ہے۔ جوشی کی نکتہ چینی کا سارا بوجھ مصطفےٰ کو برداشت کرنا پڑا ہو گا۔ بھارتی واضح طور ناخوش تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی لگی لپٹی نہ رکھی لیکن نہ جانے کیوں مصطفےٰ سے تعلق بالکل منقطع نہیں کیا۔

سنگ دلی ایک حد سے بڑھ جائے تو ظلم میں بدل جاتی ہے۔ مجھے ہر وقت "لڑکوں" اور لوگوں کا خیال ستاتا رہتا جنھیں مصطفےٰ نے کچھ عرصہ پہلے تحریک بحالی جمہوریت کے سلسلے میں گرفتاریاں پیش کرنے واپس پاکستان بھیجا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے قریب ترین ساتھی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ فوج تازہ دم ہو کر انھیں دبوچ لے گی اور معلومات اگلوانے کی کوشش کرے گی۔ مجھے پوچھ گچھ کرنے والے کی آنکھیں چمکتی نظر

آنے لگیں۔

ضیا کا تختہ الٹنے کی جدوجہد 14 اگست 1983ء کو شروع ہوئی۔ 1981ء میں تحریک بحالیٔ جمہوریت کے نام پر آپس میں اتحاد کرنے والی سیاسی پارٹیوں نے فیصلہ کیا کہ ایجی ٹیشن کا آغاز کیا جائے۔ وہ سیاسی جلسوں جلوسوں پر عائد پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کریں گے۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کراچی میں قائداعظم کے مزار سے جلوس نکالیں۔ انھوں نے یہی کیا۔ انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک شروع ہو گئی۔ پاکستان کے عوام کو بھٹو صاحب کی گرفتاری کے وقت سے اٹھ کھڑے ہونے کے جس پیغام کا انتظار تھا وہ موصول ہو گیا تھا۔

پاکستان بھر سے ہزاروں کارکنوں اور رہنماؤں نے ضیا کے جیل بھر دیے۔ بھٹو صاحب کے اپنے صوبے، سندھ، میں تحریک ایک سنگین رخ اختیار کر گئی۔ سندھیوں کی جدوجہد ذاتی نوعیت کی تھی۔ انھیں اپنے قائد کی لاش موصول کرنی پڑی تھی جسے پنجاب میں پھانسی دی گئی تھی۔ فوج پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اسے خودبخود برپا ہو جانے والی دیہی بغاوت کو کچلنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کرفیو، گشتی دستے اور طاقت کے مظاہرے ملک کے اندرونی حصوں میں کام نہ دے سکتے تھے۔ نوجوان سندھی اقدام پسندوں نے سیاست میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ تھانوں میں ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ وہ بے چہرہ اور بے نام تھے۔ وہ اپنے لہو سے ظلم کے سامنے ڈٹ جانے اور بے جگری کا ثبوت دینے کا ایک نیا باب رقم کرتے رہے۔ سندھیوں کے بارے میں یہ گھڑا گھڑایا تصور کہ وہ اطاعت گزار اور ڈرپوک ہوتے ہیں اور جنگجو قوم کہلانے کے اہل نہیں نظر ثانی کا محتاج ہو گیا۔ نوشیروفیروز، سکرنڈ، نیو سعید آباد اور خیرپور ناتھن شاہ کے نام مزاحمت کی فرہنگ میں درج ہوئے۔ کئی دن تک قومی شاہراہ، جو پاکستان کی شہ رگ ہے، سیاسی طور پر آتش بجاں ہجوموں کی موج درموج یلغار کی زد میں رہی۔ سندھ کے ساتھ خاصے عرصے تک زیادتیاں روا رکھی گئی تھیں۔

مرنے والوں کی تعداد میں جوں جوں اضافہ ہوا سندھ میں غیظ وغضب بڑھتا گیا۔ اندراگاندھی نے اس سلسلے میں بیان دیا۔ اس نے سندھیوں کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے ان کے کاز کے لیے اپنی اخلاقی حمایت کا اعلان کیا۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں یہ بیان فاش سیاسی غلطی تھی۔ پاکستان ہمیشہ بھارت کے خوف میں مبتلا رہا ہے۔ فوج نے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے بھارت پر الزام لگایا کہ وہ علیحدگی پسندی کی آگ بھڑکا کر ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ ہمارے تمام قومی مسائل کے پس پشت جو خفیہ ہاتھ تھا وہ اس بیان کے بعد کھلم کھلا نظر آنے لگا۔ تحریک کے لیے

پنجاب کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ سندھ کے شہری علاقوں نے، جن پر بھارت دشمن مہاجروں کا غلبہ ہے، ایم آر ڈی کو ترک کر دیا۔ سندھ کو تن تنہا تحریک کا بوجھ اٹھانا پڑا۔

درحقیقت اندراگاندھی کا بیان بڑے کمال کی چال تھی۔ اس نے پنجاب اور سندھ میں پھوٹ ڈلوا دی جو اب تک باقی ہے۔ اس نے کامیابی سے سندھ کے شہری علاقوں کو دیہی علاقوں سے بیگانہ کر دیا۔ 1983ء کی ایم آر ڈی کی جدوجہد تاریخ کی کتابوں میں سندھی اور صرف سندھی تحریک کے طور پر رقم ہوئی۔ اس کی بدولت صوبے کو ماتم کے لیے مزید شہید مل گئے۔ یوں سندھ ان دوسرے چھوٹے صوبوں کی صف میں آ کھڑا ہوا جو فوج سے ٹکر لے چکے تھے۔ پاکستانی فوج کی حیثیت قابض فوج کی ہو کر رہ گئی۔

مصطفیٰ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہو گی جب تک پنجاب اس میں دل وجان سے حصہ نہ لے گا۔ لاہور کی سڑکوں پر چند اموات بالا میں ہزار اموات کے برابر تھیں۔ فوج، جس پر پنجابیوں کا غلبہ ہے، آمادہ بہ پیکار پنجابی ہجوم پر فائرنگ نہیں کرے گی۔ اگر اسے مجبور کیا گیا تو فوج کے جوان اپنے بھائی بندوں پر گولی چلانے کے بجائے رائفلوں کی نالیوں کا رخ جنرلوں کی طرف پھیر دیں گے۔

مصطفیٰ نے اپنے سات قریب ترین ساتھیوں کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں چوہدری ارشاد، چوہدری حنیف، میاں ساجد، نورمائی اور دوسرے شامل تھے۔ یہ سب جلاوطن تھے اور ان پر ان کی غیر موجودگی میں فوجی عدالتوں میں مقدمہ بھی چل چکا تھا اور سزا بھی دی جا چکی تھی۔ یہ بہادر لوگ 5 ستمبر 1983ء کو لندن سے روانہ ہوئے۔ ان کی منزل مقصود: قید خانہ۔ مصطفیٰ نے اعلان کیا کہ حکومت کو للکارنے کے لیے پنجاب سے تعلق رکھنے والے پی پی پی کے نو دلیر کارکن گرفتاریاں پیش کرنے کی غرض سے وطن جا رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ روانہ ہونے والا ٹولا نو پر نہیں سات افراد پر مشتمل تھا جلد ہی ایک بھیانک سیاہ طربیے کا روپ اختیار کرنے والی تھی۔

چوہدری حنیف کو یاد ہے کہ ان کے ساتھی سارے راستے جمہوریت اور مصطفیٰ کھر کی حمایت میں نعرے لگاتے آئے جو سیاسی طور پر ناوابستہ مسافروں پر بڑے گراں گزرے۔ بقول چوہدری حنیف طیارہ کراچی اترا۔ اسے ٹرمینل سے کچھ فاصلے پر ٹھیرایا گیا۔ طیارے کو فوراً کمانڈوز اور بکتر بند گاڑیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ "ہمارے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا گیا جیسے ہم خطرناک تخریب کار ہوں۔ طیارے کی سیڑھیوں سے اترتے ہی پولیس کا سامنا ہوا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ باقی دو رہنما کہاں ہیں۔ میں نے انھیں یقین دلانا چاہا کہ ہم صرف سات ہیں۔ پولیس افسر کو ہمارے کہے پر یقین نہ آیا۔ اسے نو آدمیوں کو گرفتار کرنے کا حکم ملا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ گنتی پوری کرنے

کے لیے میاں ساجد پرویز کے سیاسی طور پر ناوابستہ بھائی، طارق، اور گوجرانوالے سے تعلق رکھنے والے ایک اور بیچارے بے گناہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ وہ بیچارہ نوجوان لندن اپنی آنٹی سے ملنے گیا تھا۔ اور ضیا الحق کا پر جوش حامی تھا۔ لیکن قانون تو عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے۔ اس نوجوان کو بھی دھر لیا گیا۔ پہلے پہل ہم اس نوجوان سے دور دور رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اسے جاسوسی کرنے کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سے نہ میل جول بڑھائیں نہ بات کریں۔ اس بے گناہ نوجوان کی حالت کسی چنڈال کی سی ہو گئی جسے کوئی پاس بٹھانے کا روادار بھی نہ ہو۔ ایک تو اس کی بے گناہی، دوسرے اس طرح باقی سب سے کٹ کر رہ جانے کا عالم۔ اس کے اعصاب اور ذہن دونوں جواب دے گئے۔ ہم نے اس کے بارے میں اپنے رویے پر نظرثانی کی۔ ہم قائل ہو گئے کہ وہ صرف اسی لیے ہمارے ساتھ تھا کہ مصطفٰے کھر نے پریس کو ہماری تعداد میں بڑھا کر بتائی تھی۔ اس نوجوان کو بائیس مہینے بعد نجات ملی۔ باقی تمام لوگ، جو حقیقی معنی میں سیاسی رہنما تھے، اس سے دو مہینے پہلے رہا ہو کر رخصت ہوئے۔ وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

"پاکستان آنے کے چار ماہ بعد میں نے سہن آباد والی ناکامی کا حال سنا۔ میں سمجھ گیا کہ آگے چل کر کیا درگت بننے والی ہے۔ میجر آفتاب کو مصطفٰے سے ملوانے والا میں ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اوجھری میں آئی ایس آئی کیمپ میں دیے جانے والے عذاب کی ان لڑکوں میں سے کوئی بھی تاب نہ لا سکے گا۔ ان سے اسی کیمپ میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ وہ سب کچھ قبول چکے ہوں گے۔ کچھ ہی دیر کی بات ہے کہ وہ مجھے پکڑ کے کیمپ لے جائیں گے۔"

چوہدری حنیف نے اوجھری کیمپ کی جس کوٹھری میں چار مہینے گزارے اس کے بارے میں بتایا، "تمہارے ذہن میں جہنم کا جو بھی تصور ہو گا وہ کوٹھری اس سے بدتر تھی۔" اس سے بار بار گھنٹوں تابڑ توڑ سوال پوچھے گئے اور اس مسلسل پوچھ گچھ کے دوران وہ مختلف انٹیلی جنس ایجنسیوں کو آپس میں الجھاتا رہا۔ چوہدری حنیف نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملے سے بے شمار ایجنسیوں کا تعلق ہے۔ "مجھے نہ تو بھارتی رابطے کا کچھ علم تھا۔ نہ مجھے یہ پتہ تھا کہ "لڑکوں" نے کیا کہا ہے۔ ہر قیدی کو جس دبدبے کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ اس کی کلاسیکی مثال تھی۔ معلوم تو مجھے کچھ بھی نہ تھا لیکن ظاہر یہی کرتا رہا کہ بہت کچھ پتہ ہے اور اپنی کوشش میں بس کسی طرح کامیاب ہو ہی گیا۔ میں ایسی سیلی گیلی کوٹھری میں قید تھا جس میں ہوا کے آنے جانے کا کوئی رستہ نہ تھا۔ بغیر شیڈ کے ایک لیمپ لگا ہوا تھا جو چوبیس گھنٹے جلتا رہتا تھا۔ میرے حواس بالکل منتشر ہو گئے

تھے۔ گدے کے طور پر ایک بدبودار کمبل ملا ہوا تھا جس کے نیچے کیڑے مکوڑے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرسراتے رہتے تھے۔ آری سے کٹا ہوا ایک ٹین، جو پہلے دنوں میں ڈالڈا سے پُر ہو گا، حاجت رفع کرنے کے لیے رکھا تھا۔ کئی کئی دن تک مجھے اس میں سے اٹھنے والے زہریلے بھبکے برداشت کرنے پڑتے۔ مجھے نہانے کی اجازت نہ تھی۔ جسم سے کسی مردار کی سی بُو آتی۔ سر کے بال بڑھ کر کندھوں سے نیچے تک لٹکنے لگے۔ داڑھی ناف تک جا پہنچی میں سو نہیں سکتا تھا۔ ہر بار جونہی آنکھیں بند کرتا اتنا ڈر لگتا تھا کہ اچھل کر اٹھ بیٹھتا۔ اوجھری کیمپ میں پوچھ گچھ کی کوٹھری بھارتی جاسوسوں کے لیے ہے۔ بھارت کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں سب سے زیادہ مشکوک آدمی مجھے سمجھا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کا گزارا ہوا ایک دن لاہور کے شاہی قلعے کی کال کوٹھریوں یا اٹک میں سب سے خاص سیکورٹی والے قید خانے میں گزارے ہوئے ایک سال کے مساوی ہے۔ وہاں گزارا ہوا ایک سال عام جیل میں گزارے ہوئے بیس برسوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

لڑکوں کو جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ انہیں پیٹ کے بل ننگا لٹا دیا جاتا۔ اس کے بعد ان کی رانوں پر فولادی رولر چلاتے جس کے دباؤ سے کھال پھٹ جاتی۔ انہیں الٹا لٹا کر مارا پیٹا جاتا۔ وہ ان اذیتوں کی تاب نہ لا سکے۔ مجھے نفسیاتی نوعیت کی اذیت دی جاتی تھی۔ میرے حواس کو جس کمال طریقے سے پوری طرح کند کر دیا گیا تھا اس پر کسی ل کا گمان ہوتا تھا۔

"بعد میں، بہت عرصے بعد، میں نے ان لوگوں سے بات کی جو اس عذاب سے گزر چکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس ہولناک زمانے میں وہ کیا دعائیں مانگتے رہے تھے وہ سب یہی دعا مانگا کرتے تھے کہ انہیں موت آ جائے۔ میں بھی گھٹنوں کے بل جھک کر یہی دعا مانگتا رہا تھا۔ ہم سب موت کے طلبگار تھے۔"

چوہدری حنیف کو یاد ہے کہ تمام قیدیوں میں ایک بات اور مشترک تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مصطفٰے کھر نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ وہ مصطفٰے کو اُس کی نری سنگ دلی دیکھ کر، گالیاں اور بددعائیں دیتے تھے۔ "ہم محسوس کرتے تھے کہ ہمیں، اپنا کام نکل جانے کے بعد پرے پھینک دیا گیا ہے۔"

یہ احساس میرا جانا پہچانا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب مصطفٰے پر کنیریاں پالنے کا خبط سوار تھا۔ ایک روز وہ ان سے اکتا گیا اور اُس نے طے کیا کہ کنیریوں کو آزاد کر دیا جائے۔ مجھے اس میں شک تھا کہ یہ کنیریوں کے حق میں اچھا ہو گا یا نہیں۔ گھر میں پلی ہوئی چڑیاں، کھلی فضاؤں میں اڑنے کا جوکھم کیا جانیں۔ مصطفٰے نے باغ میں لے جا

کر ان سب کو چھوڑ دیا۔ کنیریاں اڑ گئیں۔ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ کھلی فضا ان کے حق میں خار زار سے کم نہیں۔ انہیں پر کھولنے کا موقع بھی نہ ملا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے شکاری پرندے انہیں دبوچ کر لے گئے۔ بھولی بھالی کنیریاں ہمارے لان میں منتظر بیٹھیں تھیں کہ موت کب ان پر جھپٹا مارے۔ یہ قتل عام تھا۔ میں جانتی ہوں کہ "لڑکے" اور مصطفےٰ کے جیوٹ ساتھی کیا محسوس کرتے ہوں گے۔

اپنی اس کڑی آزمائش کے سات سال بعد جب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا، چوہدری حنیف نے ایک روز، جب وہ میرے گھر آیا ہوا تھا، مجھے بتایا کہ موت کے اس کھود گڑھے جیسے قیدخانے میں اسے میری آواز سنوائی گئی تھی۔ "آپ کی آواز ٹیپ پر موجود تھی۔ آپ کا ٹیلی فون ٹیپ کیا جاتا تھا۔ آپ نے "لڑکوں" سے، ان کی بیگمات سے، سیٹھ عابد سے جو بھی گفتگو کی تھی، سب ریکارڈ ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ایک روپے کے پھٹے ہوئے نوٹ تک ہر اطلاع موجود تھی۔ وہ پہلے دن سے ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ ضیا معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم کتنے اندر تک نفوذ کر چکے ہیں۔ وہ تمام سازشیوں کو بے نقاب کرنے کا خواہاں تھا۔ اس نے ساتھ میں ہمیں بھی رگڑ دیا۔

ضیا کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ بغاوت کو کچلنے کے تین ماہ بعد اسے اور اس کے جنرلوں کو راولپنڈی میں پبلک کے سامنے آنا تھا۔ اسے 23 مارچ کو جو یوم جمہوریہ ہے، شاندار مارچ پاسٹ کی سلامی لینی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انور سادات کے قتل کی کہانی دہرائی جائے۔ آرمی سٹیڈیم کو قلعے میں تبدیل کر دیا گیا۔ ڈیس بلٹ پروف تھی۔ تماشائی زیادہ تر فوجی جوان تھے جنہوں نے شہری لباس پہن رکھا تھا۔ حد یہ کہ خٹک ناچ ناچنے والوں تک کو تلواروں کی جگہ چوبی پھٹیاں تھما دی گئی تھیں۔ ایسے حالات میں، جب مصطفےٰ کھر اور اس کے بھارت سے رابطہ رکھنے والے لوگ کھلے پھر رہے ہوں، ضیا کسی قسم کا جوکھم اٹھانے پر آمادہ نہ تھا۔

مصطفےٰ جیسے آدمی کو بھلا نچلا بیٹھنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا! وہ دیکھتے ہی دیکھتے دوبارہ خم ٹھونک کر میدان میں آ دھمکا۔ جو ناکامی اس کے حصے میں آئی تھی وہ قصہ پارینہ قرار پائی اور اسے زیادہ دیر پریشان نہ رکھ سکی۔ اس کا علی اور بلو سے جھگڑا ہو چکا تھا اور اب اسے اپنا سوجھتا آپ کرنا تھا۔

جلد ہی وہ دوبارہ بھارت گیا۔ اندرا گاندھی نے اس کی میزبانی کی۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اب اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ دوبارہ اہمیت حاصل کر لے گا۔ اس سفر سے وہ خوش خوش لوٹا۔ بغاوت کے پلان کی بری طرح ناکامی میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا وہ اسے بھلا چکے تھے۔ اس نے مجھے اس ملاقات کے بارے میں بتایا۔ "اندرا بہت خوش خلقی سے پیش آئی۔ کہنے لگی کہ میں عظیم محب الوطن ہوں اور پاکستان کو میرے جیسے رہنماؤں کی ضرورت ہے۔ ہم جس بحران سے دوچار ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوراندیش اور دیدہ ور رہنماؤں کو اقتدار سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس نے اپنا یہ نظریہ دہرایا کہ پاکستانی فوج کو دو وجوہ سے تباہ کرنا ضروری ہے۔ وہ پاک بھارت امن اور پاکستان میں جمہوریت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ عوام کے دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچل دینے کے واسطے جنگ ناگزیر ہے۔

برصغیر کے افق پر اچانک جنگ کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر اس زبردست آگ کا ذکر تھا جو عنقریب بھڑکنے والی تھی۔ مصطفےٰ کہنے لگا کہ بھارت کے ساتھ جنگ ہی وہ معجزہ ثابت ہو گی جس کے لیے ہم دعائیں مانگتے آئے تھے۔ اس کی اس رائے کے بارے میں میرے تحت الشعور میں طرح طرح کے شکوک وشبہات موجود تھے۔ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں بھیجیں تھیں۔ 1971ء میں پاکستانی فوج کی شکست کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ "ہزار سال کی غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔" وہ اشارتاً کہنا یہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں نے بھارت کے عوام کو۔۔۔۔ غیر منقسم ہندوستان کے عوام کو۔۔۔۔ غلام بنا رکھا تھا۔ اندرا کا تعلق اس مکتب فکر سے تھا جس کے نزدیک "بھارت ماتا کی چیر پھاڑ (تقسیم)" مذہبی بے حرمتی کے مترادف تھی۔ اندرا کا سیکولرازم مسلم قوم پرستی کے خلاف رد عمل تھا یہ کوئی دانشورانہ پہل قدمی نہ تھی۔ محض ایک موقع پرستانہ جوابی عمل تھا۔

بھٹو خاندان ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ جب اس کا نہرو خاندان سے موازنہ کیا جاتا تو خاندان کے افراد کے سر فخر سے بلند ہو جاتے۔ ان کا تعلق بھی اشرافیہ سے تھا۔ اور حکومت کرنا تو ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا۔ وہ بھی حکمران خاندان بنتے جا رہے تھے۔ جب بے نظیر 1984ء میں انگلینڈ آئی تو علی محمود نے بے نظیر اور سنور سنگھ کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ مسٹر سنگھ پاکستان میں بھارتی سفیر رہ چکے تھے۔ بعد ازاں انہیں بھارت کے وزیر خارجہ بننے کا موقع بھی ملا۔

یہ خفیہ ملاقات تھی۔ معلوم نہیں اس میں کیا بات چیت ہوئی۔ تاہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مضائقہ نہیں کہ بات چیت بھارتی پالیسی کے متعین کردہ خطوط کے مطابق ہوئی ہو گی۔ اندرا گاندھی حکمران خاندانوں کی ساحرانہ کشش سے باخبر تھی۔ وہ خود اس کشش سے فائدہ اٹھا چکی تھی۔ وہ اس شخص کی بیٹی کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتی تھی جس کے ساتھ اس نے شملہ دستخط کیے تھے۔

جنگ پسند سکھ ازم کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا۔ "آپریشن بلیو سٹار" کا حکم دے کر وہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھی۔ امرتسر میں سکھوں کے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا گیا۔ سکھوں کے مقدس ترین مقام کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کا رہنما بھنڈراں والا اس لڑائی میں کام آیا۔ سکھوں نے قسم کھائی کہ وہ انتقام لے کر رہیں گے۔ یہ الزام لگا کر سکھ علیحدگی پسندوں کو پاکستان میں کیمپوں میں تربیت دی جا رہی ہے۔ لاہور میں گردوارا انہیں مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں جا کر سکھ پناہ لیتے ہیں اور جہاں سے وہ بھارتیوں پر حملہ کیا کریں گے۔ جنرل ضیا پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ علیحدگی پسندوں کی معاونت کر رہا ہے۔ سکھ پنجابی ہیں۔ سکھوں کے مرکزی علاقے کے ساتھ ہماری طویل سرحد ہے جس میں اتنے رخنے ہیں کہ لوگ آسانی سے ادھر اُدھر آ جا سکتے ہیں۔ بھارت میں جو علیحدگی پسند رجحانات ابھر رہے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اندرا قوم کو متحد کرنا چاہتی تھی۔ روایتی دشمن کے خلاف جنگ ہمیشہ ملک کے مختلف حصوں کو جوڑے رکھنے کے لیے اچھا مسالہ ثابت ہوتی ہے۔ پاکستان پر فتح سے اسے وہی عظمت دوبارہ نصیب ہو جائے گی جو بنگلہ دیش بنانے پر اس کے حصے میں آئی تھی اور بعد ازاں اس سے چھن گئی تھی۔

اندرا کو یہ قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ اسے اپنے ہی گھر کے احاطے میں اپنے ہی پہرے داروں نے بے دردی سے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ یہ پہرے دار سکھ تھے۔

مصطفےٰ جوگنگ کرنے نکلے ہوا تھا۔ میں ناشتے کے وقت دکھایا جانے والا ٹی وی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ میں نے اندرا کے قتل کی خبر سنی مصطفےٰ گھر آیا۔ میں نے خبر اُسے سنا دی۔ وہ صوفے پر جا گرا، سر پکڑ لیا اور کرب میں ڈوبی آواز میں کہا، "خدایا"۔ وہ اس طرح بیٹھے رہ گیا جیسے اندر سے بل گئے ہو اور کھوئی کھوئی نظروں سے آنے والے دنوں کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ مصطفےٰ کی غدارانہ سرگرمیوں میں شریک رہنے کے باوجود میں دل ہی دل میں بھارتیوں کے خلاف تھی۔ آپ کتنی ہی فرماں بردار اور دہشت زدہ بیوی کیوں نہ ہوں لیکن ان کیفیات کو جو سالہا سال تک آپ کے ذہن پر اثر انداز ہوتی رہی ہوں، بے اثر نہیں بنایا جا سکتا۔ اب مجھے اپنی ذہنی حالت پر حیرت ہوتی ہے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ مصطفےٰ اس قدر ناخوش کیوں ہے۔ "اندرا تو پاکستان کی جانی دشمن تھی۔" مجھے اس عورت کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کر کے خوشی ہوئی جس نے ہماری زندگیوں میں داخل ہو کر سب کچھ تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ "ہمیں سارا کام ازسرنو اور بالکل ابتدا سے کرنا پڑے گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اقتدار کون سنبھالے گا۔ اگر راجیو کامیاب ہوا

تو کانگریس کی پالیسی وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ ہمیں دلی میں نئے حکمران سے نئے سرے سے تعلقات قائم کرنے پڑیں گے۔ اس عمل کا سست رفتار ہونا یقینی ہے کیونکہ نیا وزیراعظم دوسرے معاملات میں بہت مشغول ہوگا۔ جنگ کو ملتوی کرنا پڑے گا۔"

تاریخ "اگر مگر" پر مبنی نہیں۔ تاہم بہت ڈر لگتا ہے یہ سوچتے ہوئے کہ ان گولیوں کی بدولت، جنھوں نے اندرا گاندھی کا کام تمام کر ڈالا پاکستان کس مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گیا، ورنہ پاکستان پر جانے کیا گزرتی۔

انتقامی قتل وغارت کے نتیجے میں دلی کی سکھ آبادی کے بہیمانہ کشت وخون کے بعد جب راجیو نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تو پاکستانی فوج کو تباہ کرنے کا منصوبہ پھر منڈھے چڑھتا نظر آیا۔ مصطفےٰ نے "دلیپ" بن کر "آصف علی" سے رابطہ قائم کیا اور تقاضا کرنے لگے کہ ان کو نئے وزیراعظم کے حضور میں باریاب ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔

وہ گرم ملک بھارت تھا جس کا مصطفےٰ نے میرے بیٹے حمزہ کی پیدائش کے تین دن بعد دورہ کیا۔ لبرٹی کے تیار کردہ لباس پہن کر، جنھیں میں نے زچگی سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اُس کے لیے خریدا تھا، مصطفےٰ مسز گاندھی کے بیٹے اور وارث سے ملا۔ اُس نے بھارت میں چھ دن قیام کیا۔

واپس آ کر اُس نے بتایا کہ راجیو نے ان سے خفیہ طور پر ملاقات کی تھی۔ "مجھے ایک ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا۔ راجیو وہاں آ گئے۔ ہم نے مسئلے کے ہر پہلو پر انتہائی تفصیل سے بات کی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ راجیو اب بھی اپنی والدہ کے منصوبے پر عمل درآمد کا خواہاں ہے۔ اندرا نے جو پلان تیار کیا تھا اسے بدلا نہیں ہے۔ صرف مؤخر کر دیا گیا ہے۔ ہم یہ نہ طے کر پائے کہ اس پلان کو کس وقت عملی جامہ پہنایا جائے لیکن سٹریٹجی وہی ہے جو پہلے تھی۔"

مصطفےٰ کا خیال تھا کہ بھارت پاکستان کو اپنے میں ضم نہیں کرے گا۔ فوجی شکست کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ پاکستان ختم ہو گیا۔ بھارتی ہمیں آزاد مملکت کے طور پر باقی رہنے دیں گے لیکن ہم آئندہ بھارت کے لیے کبھی خطرہ نہیں بنیں گے۔ ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہو جائے گی۔ بھارت ہمیں ضروری تحفظ فراہم کرے گا۔ پھر ہمیں اتنی بڑی فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ مجھے یہ ساری باتیں دوراز کار معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سیدھا سیدھا بھارتی بالادستی کا نسخہ تھا۔ یہ اندرا کے اس سیاسی عقیدے کا ایک اور روپ تھا جس میں فرض کر لیا گیا تھا کہ بھارت جنوبی ایشیا کا پولیس مین ہے اور آس پاس کے چھوٹے ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت کر سکتا ہے اور کرے گا۔

راجیو نے اپنے چھپ کر آنے والے مہمان کے لیے دو شکاری مہموں کا اہتمام بھی کیا۔ مصطفےٰ کو پرندوں کے لیے بنی ہوئی ایک پناہ گاہ میں لے جایا گیا اور شکار کھیلنے کی اجازت دی گئی۔ وہ بڑے جانوروں کے شکار کی غرض سے ترتیب دی گئی سفاری پر بھی گئے۔ ان کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا گیا اور انھیں پروٹوکول کی وہ تمام سہولتیں حاصل رہیں جو کسی بھی آنے والے معزز مہمان کو فراہم کی جاتی ہیں۔ انھیں ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تاکہ بھارت کے آزاد پریس کو ان کی آمدورفت کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

حمزہ کی ولادت کے بعد مجھ پر اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کی دھن سوار ہو گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ میری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا ہے۔۔۔ میں خوش ہوں۔ لوگ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ میرے ساتھ یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ ایک آواز سنائی دی کہ معجزے کا سبب یہ ہے کہ میں نے اجمیر کے خواجہ کے دربار میں حاضری دی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ خواب کے ذریعے دراصل مجھے مزار پر طلب کیا جا رہا ہے۔ شاید اس معجزے کی بدولت میری زندگی میں، میری ازدواجی زندگی میں بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

مصطفےٰ کے جوشی سے تعلقات اچانک میری نظر میں بہت اہمیت اختیار کر گئے۔ بھارت جانے کی جو بھی امید تھی اسی شخص سے وابستہ تھی۔ وہ مجھے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ یہ دنیوی طاقت کی مدد سے عرشی قوتوں تک رسائی کا معاملہ تھا میں نے مصطفےٰ کو تنگ کرنا شروع کیا کہ وہ میرے سفر کا بندوبست کرا دے۔ مصطفےٰ نے حامی بھر لی۔ میرا معجزہ شاید اتنا ہی ہو کہ میرے شوہر کی، جن میں درندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، کایا پلٹ جائے۔

ایک اور دعوت، ایک اور ملاقات۔ اس بار میں ساتھ ہو لی۔ الگ میز پر جا بیٹھی اور بڑی جانکاہی سے کوشش کرتی رہی کہ نمایاں بالکل نہ نظر آؤں۔ جوشی آ کر مصطفےٰ کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی طرف نہ دیکھوں۔ بلاشبہ امورِ مملکت زیرِ غور ہوں گے۔ مجھے صرف اجمیر سے غرض تھی۔ مصطفےٰ نے جوشی سے میرا تعارف نہیں کرایا۔

بالآخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے بل ادا کیا اور میرے پاس سے گزرے۔ جوشی رک کر مسکرایا۔ اس نے مصطفےٰ سے کہا کہ اپنی بیگم کو نہ بھول جائیے گا۔ مصطفےٰ جھینپ کر مسکرایا۔ میں کھڑی ہو گئی اور میرا "را" کے مستقبل کے سربراہ سے رسمی تعارف کرایا گیا۔

ہم ایک ساتھ بار سے باہر آئے۔ اجمیر۔ اس سے اجمیر کے بارے میں بات کرو۔ مصطفےٰ نے ایسا ہی کیا۔ جوشی کہنے لگا کہ دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ میں جان گئی کہ مجھے جلد ہی بھارت جانے کا موقع مل جائے گا۔ میرے کانوں میں آواز آ رہی تھی۔ کہ میرے پیرومرشد مجھے اجمیر کی متبرک سرزمین کی طرف بلا رہے ہیں۔

دو دن بعد میرا خواب حقیقت بن گیا۔ میں نے پہلی بار اکیلے سفر کیا۔ ویزا کی ضرورت نہ پڑی۔ مصطفےٰ نے مجھے ایرانڈیا کا ٹکٹ لا دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اپنے ساتھ میک اپ کا کوئی سامان نہ لے جاؤں۔ لپ سٹک تک کی اجازت نہ ملی۔ ہوائی اڈے روانہ ہونے سے پہلے مجھے گھر پر ہی اپنے سامان کی تلاشی دینی پڑی۔ مصطفےٰ نہیں چاہتا تھا کہ میں ان ممنوعہ چیزوں میں سے کوئی سمگل کر کے لے جاؤں۔ اُسے ہر وقت دوسرے مردوں سے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اُسے یہ پسند نہ تھا کہ میں کسی اور مرد کو دلکش نظر آؤں۔ بہر صورت، عورت اکیلی ہو تو مردوں کی نگاہوں کا نشانہ بن ہی جاتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مقناطیس کا کام بھی کرنے لگے۔

مصطفےٰ کے عدم تحفظ کے احساس سے مجھے چڑچڑاہٹ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ وہ محض احمقوں کی سی بات کر رہا ہے۔ اگر میک اپ کا سامان میں نے بھارت میں خرید لیا تو اُسے کیا پتہ چلے گا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اُس کے جاسوس تو وہاں بھی موجود ہوں گے۔ آخر اُس کا جن لوگوں سے میل جول تھا ان کا کام ہی یہ تھا کہ کوئی بات ان سے چھپی نہ رہے۔ میں نے چوری چھپے دل کھول کر خریداری کرنے کے خیال کو ذہن بدر کر دیا۔

پرواز کے دوران کوئی قابل ذکر بات پیش نہ آئی۔ ہم نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر اترے۔ ٹرمینل عمارت کے اندر دو آدمی میری پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے میرا سامان کلیر کرایا اور مجھے امی گریشن سے نکال کر لے گئے جہاں کم مراعات یافتہ لوگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ ہم کار میں تاج ہوٹل پہنچے جہاں میرے لیے ایک خوبصورت سوٹ ریزرو کرایا جا چکا تھا۔

دس منٹ بعد ایک خاتون داخل ہوئی۔ اس نے خود کو مسز سنگھ کے نام سے متعارف کرایا۔ ادھیڑ عمر کی عورت جس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ میں نے دل میں کہا، لو میرے لیے رابطہ افسر آ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ اس کے فرائض میں صرف میرا خیال رکھنا ہی نہیں بلکہ مجھ پر نظر رکھنا بھی شامل ہے۔ اس نے معلوم کرنا چاہا کہ میں دلی میں قیام کے دوران کیا کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت متانت آمیز اور مستعد معلوم ہوتی تھی۔ میرا پروگرام ترتیب پانے لگا: تاریخیں، وقت، مقامات۔

میرے دونوں "سائے" دوبارہ نمودار ہوئے۔ انھوں نے غیر ضروری طور پر تکلف آمیز لہجے میں مطلع کیا کہ ایجنسی کے ڈائرکٹر جنرل آدھے گھنٹے میں مجھ سے ملنے آئیں گے۔ وہ میرے ساتھ چائے پئیں گے۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ ڈائرکٹر جنرل کون ہے؟ اس نے کوئی براہ راست جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ وہ اس کے باس ہیں اور بہت اہم شخص ہیں۔

میں مصطفیٰ کی طرف سے ڈائرکٹر جنرل کے لیے ایک پیغام لے کر آئی تھی۔ مجھے یہ رپورٹ دینی تھی کہ سیاسی صورت حال ایک جگہ آ کر ٹھہر گئی ہے۔ بطور صدر جنرل ضیا کی مسلسل موجودگی سے اچھے اثرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں۔ پاکستان جس افغان پالیسی پر عمل کر رہا ہے اس کے نتائج پورے علاقے کے لیے تباہ کن ثابت ہوں گے۔ افغانستان سے روسی فوج کے انخلا سے انجام کار ہمارے مشترکہ مفادات کو گزند پہنچے گی۔ روسی پسپائی سے علاقے میں امریکی اثر زیادہ قوی ہو جائے گا۔ مصطفیٰ نے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کی جو تشخیص کی تھی یہ پیغام اس کا خلاصہ تھا۔ انھوں نے بھارتیوں پر زور دیا کہ قدم اٹھائیں اور جنرل ضیا کو ہٹا دیں جو بڑی بے ڈھب مصیبت ثابت ہو رہا تھا۔

ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ اسے مصطفیٰ کی تشخیص سے اتفاق ہے اور وہ صورت حال کو سمجھ گیا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ پیغام ان حلقوں تک پہنچا دیا جائے گا جو اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں اور خود پندرہ دن کے اندر مصطفیٰ سے رابطہ قائم کرے گا۔ اس نے اشارتاً کہا کہ وہ جلد ہی لندن آئے گا۔

مصطفیٰ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ راجیو گاندھی سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ یہ استدعا میں نے ڈائریکٹر جنرل تک پہنچا دی۔ ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ وہ اس ملاقات کا بندوبست کر دے گا اور مصطفیٰ کو معمول کے ذرائع سے مطلع کر دیا جائے گا۔ پھر اس نے تھوڑا سا مشورہ دیا۔ "بہت زیادہ گھومنے پھرنے سے احتراز کریں۔ شاید کوئی واقف کار آپ کو پہچان لے۔ یہ بات ہمارے لیے پریشانی اور خفت کا باعث ہو سکتی ہے۔" ڈائرکٹر جنرل اٹھ کھڑا ہوا، امید ظاہر کی کہ بھارت میں میرا قیام خوشگوار ثابت ہو گا اور چلا گیا۔

اس کے مشورے پر سختی سے کاربند رہنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ میں بھارت صرف اجمیر شریف جانے کے لیے آئی تھی۔ باقی سب معاملات دنیوی اور ہیچ تھے۔

اگلی صبح میں طیارے کے ذریعے اجمیر روانہ ہو گئی۔ دونوں "سائے" میرے ساتھ

تھے۔ جب میں مزار پر حاضر ہوئی تو وہ میرے ساتھ اندر گئے۔ اور جب میں نے دعا مانگی تو میرے پہلو میں کھڑے رہے۔ ان کی موجودگی سے میری یکسوئی میں خلل پڑا۔ میں بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ میں دعا مانگنے آئی تھی۔ یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے میری زندگی میں تھوڑا سا گزر عقل و خرد کا بھی ہو جائے۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اور کہیں نہ سہی کم از کم وہاں تو میری خلوت کو قابل احترام سمجھا جاتا۔ دونوں "سائے" میرے پاس سے ہٹنے سے انکاری تھے۔

بہت آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ میں ٹھوس حقیقت سے دور ہٹتی جا رہی ہوں۔ مجھے لگا کہ میں تسکین کی طرف بڑھنے لگی ہوں۔ زیارت گاہ کے سکون نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اب مجھے صرف اپنے ارد گرد کے لوگوں کا مدہم شور سنائی دے رہا تھا یا فاختاؤں کے پھڑپھڑانے کی آواز آ رہی تھی اور یہ شور اور آواز بھی دور ہٹتے جا رہے تھے۔

میں اپنے میاں کے لیے دست بدعا تھی۔ میں نے اللہ سے التجا کی کہ میرا شوہر نارمل ہو جائے۔ اُسے تشدد اور دیوانگی کے جو دورے پڑتے رہتے ہیں ان پر روک لگ جائے۔ میں نے اللہ کی منت کی کہ میرے میاں کو ایسا بنا دے کہ وہ میرا اور میرے بچوں کا خیال رکھنے لگے۔ "مجھے ایک نارمل گھر چاہیے جہاں امن بھی ہو اور ہم آہنگی بھی۔" میں نے دعا کی کہ مصطفیٰ کی توقیر میں اضافہ ہو اور ان کی جلاوطنی ختم ہو جائے۔ میں نے دعا کی کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میں نے اپنے والدین کی بھلائی کی دعا مانگی اور یہ کہ ان سے میری صلح صفائی ہو جائے۔ میں نے عظیم ولی اللہ کے مزار پر دعا مانگی کہ امی مصطفیٰ کو معاف کر دیں۔ میری آرزو تھی کہ میرے میاں میرے والدین کی نظر میں مثالی داماد بن جائیں۔ میرے آنسو نکل آئے اور رخساروں پر بہنے لگے۔ ہر آنسو خود منت تھا۔ اور جہاں کوئی قطرہ تحلیل ہوا وہاں زیارت گاہ بن گئی۔ میرے ذہن میں سیاست کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ مجھے اپنے ذہن کو شاداب کرنے کے لیے روحانی قوتوں کی ضرورت تھی۔

وقت اب ہتھکڑیوں کی طرح میری کلائیوں سے بندھا ہوا نہ تھا۔ میں ان باقی لوگوں میں گم ہو چکی تھی جو اپنے آپ کو تلاش کرنے کی خاطر زیارت پر آئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ "سائے" بار بار پہلو بدل رہے ہیں۔ ان کی گراں بار موجودگی سے میں کبیدہ خاطر ہوئی۔ وہ بے چین نظر آ رہے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود انھیں ایک ایسی ہستی کے فانی آثار کے سامنے مجبوراً کھڑے ہونا پڑ رہا تھا جس نے بھارت میں اسلام کی ترویج کے لیے جتنا کام کیا تھا اتنا کسی خون چکاں تلوار لہرانے

والے سپہ سالار سے نہ بن پڑا تھا۔ انھیں ضرور خواجہ صاحب کی کشش محسوس ہوئی ہو گی۔ انھوں نے کشش کی مزاحمت کی۔ وہ وہاں سے چلے جانا چاہتے تھے۔ ایسا کرنے میں ناکامی کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ خود بھی خواجہ صاحب کی مقناطیسیت کے سامنے جھک جائیں۔ رات مزار پر گزارنے کے خیال کو دل سے نکالنا پڑا۔ "سائے" مجھے ساتھ لے گئے۔ میں سر جھکائے، زمین پر لیٹے لوگوں کو پھلانگتی مزار سے باہر آئی۔ مجھ میں نئی جان آ گئی تھی۔ میرے ساتھ خواجہ اجمیری کی رحمتیں تھیں۔ میں نے خود کو توانا محسوس کیا۔

ہم نے جے پور کے ایک محل میں، جسے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ڈنر کھایا۔ ہم دلی واپس آ گئے۔

وقت کم اور مصروفیات زیادہ۔ مسز سنگھ نامی خاتون آ پہنچی۔ ہم نے ہوٹل میں ساتھ ہی لنچ کھایا۔ شاپنگ کرنے گئے۔ میں نے ایک پینٹنگ اور کمبل خریدا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا مجھے خریداری کے لیے روپے درکار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔

اب ہم بس دو عورتیں تھیں جنھیں ایک دوسرے کا ساتھ میسر آ گیا ہو۔ ہم نے اپنی زندگیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اس کی زندگی نے میرے دل کو گدگدایا۔ میرا پرانا تجسس پھر بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے گھر والوں کی باتیں کرتی رہی مگر اپنی ملازمت کے ذکر سے صاف دامن بچا گئی۔

میں نے دریافت کیا کہ اسے لندن سے کوئی چیز بھجوائی جا سکتی ہے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چمڑے کا بیگ مل جائے تو کیا ہی مزہ آئے۔ پھر مایوسی۔ پھر خوف۔ کہنے لگی کہ وہ مجھے اپنا پتہ نہیں دے سکے گی۔ "اگر انھیں پتہ چل گیا تو میری شامت آ جائے گی۔ آپ کے بھارت سے چلے جانے کے بعد مجھے آپ سے رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں۔"

میں نے سوچا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے لندن کا کوئی پتہ دے دو۔ میں بیگ وہاں بھجوا دوں گی۔ وہ ہچکچائی۔ بیگ حاصل کرنا تو وہ چاہتی تھی لیکن۔ "یہ بغل میں چھری، منہ پر نقاب کا ڈراما کس لیے؟ ہم دوست کیوں نہیں بن سکتے؟"
"یہ ناممکن ہے۔ براہ کرم، یہ ذکر دوبارہ نہ چھیڑیے۔ مجھے اپنے رابطوں سے دوستی کی اجازت نہیں۔ مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔" اس زمانے میں میری جو ذہنی سطح تھی اس کی واضح عکاسی اس امر سے ہو جاتی ہے کہ میں ٹک ٹک یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھی کہ یہ سارا بکھیڑا کس لیے ہے۔ میں واقعی خاصی بے عقل عورت ہوں گی۔

آخر کار اس نے چوری چھپے مجھے انگلینڈ کا ایک پتہ فراہم کر دیا۔ جلدی سے نظر

دوڑائی۔ دائیں بائیں۔ پیچھے۔ بیگ کا لالچ بہت زیادہ ثابت ہوا۔ ایسی چابک دستی سے جو مشق کا نتیجہ ہی ہو سکتی تھی، اس نے پتہ میری طرف کھسکا دیا۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ نروس نظر آ رہی تھی اور کچھ کچھ مطمئن بھی۔

روانگی کا وقت آ پہنچا۔ دونوں "سائے" دبے پاؤں گویا ہوا میں تیرتے ہوئے اندر آئے۔ پُراسرار سمجھ میں نہ آنے والے۔ ہم ایک کار میں جا بیٹھے۔ کالے رنگ کی ایمبیسیڈر۔ اور ہوائی اڈے کی طرف چل دیے۔ مسز سنگھ کھسیائی۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ میرا بھولپن حماقت کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ وہ ضرور دل ہی دل میں دعا مانگ رہی ہو گی کہ اے بھگوان، کہیں یہ عورت کچھ بک نہ دے۔ "سایوں" کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے کوئی ماتحت سمجھتے ہیں۔ وہ میری طرف جھکی اور مجھ پر اعتماد کے ایک پیمان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مسز سنگھ نہیں ہے"۔ پھر خاموشی۔ انھوں نے اسے راستے میں سڑک کے کنارے اتار دیا۔ "تمھیں یہاں سے بس مل جائے گی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خدا حافظ کہا۔ وہ کچھ کچھ اداس نظر آ رہی تھی۔ جب ہم شاپنگ کرنے نکلے تھے تو میں اس کا گھر دیکھ چکی تھی۔ اس نے اشارہ کر کے اپنا گھر مجھے دکھایا تھا۔ اب ہم نے اسے گھر کے سامنے اتار دیا۔ مسز سنگھ، یا اس کا جو بھی نام تھا، فٹ پاتھ پر کھڑی کار کے نکڑ سے مڑ کر نظر سے اوجھل ہو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر جو آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی اسے مکمل کرنے کے لیے چند قدم چل کر اپنے گھر کے لکڑی کے بنے ہوئے دروازے تک گئی۔ اب اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

نہ سرخ فیتے سے واسطہ پڑا۔ نہ قطار میں کھڑے ہونے کی نوبت آئی۔ نہ اکتائے اکتائے سرکاری عہدے داروں کے چہرے دیکھنے کو ملے۔ مجھے فرسٹ کلاس لاؤنج لے جایا گیا۔ میرے "سائے" میری سفری دستاویزات کو ٹھیک کرانے کے لیے دوڑ بھاگ کرتے رہے۔ جب تک میں طیارے پر بحفاظت سوار نہ ہو گئی وہ میرے ساتھ ساتھ رہے اور بعد ازاں غالباً ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ایک نیم تاریک ادارے سے تعلق رکھنے والی آسیبی صورتیں۔

واپس پہنچ کر ایک ایک بات بتائی۔ مصطفےٰ خوش ہوا جو دعائیں میں نے اجمیر شریف میں مانگی تھیں وہ پوری تو ہوئیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح میری خواہش تھی۔ بیس دن بعد میں مصطفےٰ سے الگ ہو چکی تھی۔ مجھے دوبارہ اپنی بنانے کے لیے اُسے میرے بچے اغوا کرنے پڑے۔ مجھے بہت زیادہ رازہائے درون معلوم تھے۔

میں اکثر حیران ہوتی ہوں کہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مصطفےٰ کو اس انتہا

تک جانے کی کیا ضرورت تھی۔ انھوں نے جو چال بھی چلی اس سے یہی لگتا تھا جیسے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، جیسے اُس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ رہا ہو۔ اُس نے اپنے کیریر کو خطرے میں ڈالا، برطانوی حکومت کے حسنِ سلوک سے محروم ہونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مجھے زبردستی واپس لے جانے کے لیے بچوں کو استعمال کیا۔ بعد میں جب ہم پاکستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تو جو کچھ اُس نے بتایا اس سے میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ دو ہی باتیں ممکن تھیں۔ یا میں اُس کے پاس لوٹ آتی یا وہ مجھے ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے بہت زیادہ رازوں کا علم تھا۔

جب ہماری علیحدگی کی خبر اخباروں کی شہ سرخیوں کی زینت بن گئی تو جوشی نے مصطفیٰ سے بات کی۔ "جب آپ کی شادی کو استحکام حاصل نہیں تھا تو آپ نے اپنی بیوی پر بھروسا کیسے کر لیا؟" میں نے اپنی ازدواجی زندگی پر کس کامیابی سے پردہ ڈالے رکھا تھا۔ میں "را" کو غچا دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مصطفیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے واپس لا کر چھوڑیں گے۔ "اگر میں واپس نہ آتی تو کیا ہوتا؟" مصطفیٰ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پوری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو جاتا"۔ "کیا صرف اس لیے تم نے یہ سب کچھ کیا؟" "نہیں۔ اس لیے کیا کہ مجھے تم سے محبت ہے"۔ "اگر میں تمہیں چھوڑ بھی جاتی تو بھی کبھی کسی کو کچھ نہ بتاتی"۔ "ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یہ امکان ہمیشہ رہتا کہ تم ہمارے لیے خطرہ ثابت ہو گی۔ تم غیر ذمے دارانہ گفتگو کر سکتی تھیں۔ تم بے خیالی میں کوئی بات کہہ سکتی تھیں۔ اس انکشاف کی بھارتی حکومت متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ فوجی سازش کے ذریعے کسی غیر ملکی حکومت کا تختہ الٹنے میں شریک ہے۔ اس طرح کا سکینڈل تباہ کن ثابت ہوتا۔ یہ بات ہرگز منظر عام پر نہ آنی چاہیے کہ بھارت کسی ملک کی حکومت کا تختہ الٹنے کی غرض سے وہاں کی حزب اختلاف کو مادی امداد فراہم کرتا رہا ہے۔ سازش کی سب سے کمزور کڑی تم تھیں۔ تمہیں تو اس بات کا ہوش تک نہیں کہ تم نے اپنے آپ کو کیسے بھاری خطرے میں ڈال رکھا تھا۔"

مصطفیٰ کے انکشافات سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس بری طرح سے خطرات میں گھری رہی تھی۔ میں نے خود کو اُس کی معیت میں محفوظ محسوس کیا۔

پاکستان لوٹنے سے پہلے مصطفیٰ نے بعض دوسری جگہوں کا نام لیا۔ ہم وہاں بھی جا سکتے تھے۔ کہنے لگا کہ وہ کابل کے حکمران طبقے سے انتہائی کارآمد رابطے قائم کر چکا ہے۔ دوستی کے اظہار کے طور پر افغانستان کے صدر نے اُسے دو خوبصورت قالین بھجوائے ہیں۔ صدر کی خواہش تھی کہ مصطفیٰ کابل چلا آئے۔ میر مرتضیٰ پہلے ہی وہاں موجود

تھا۔ کابل حکومت نے ایک پوری اقلیم میر کے سپرد کر دی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا علاقہ تھا جسے باقی ماندہ کابل سے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے لامحدود فنڈ تھے۔ بیشتر رقم شام کے حافظ الاسد نے فراہم کی تھی۔ مصطفیٰ کے کابل پہنچنے سے پیپلز پارٹی کے کاز میں نئی جان پڑ جائے گی۔ میر مصطفیٰ سے صلح صفائی کی کوشش کر چکا تھا۔ اس نے کابل سے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "مفاد پرست لوگوں نے ہمارے درمیان مسائل کھڑے کر دیے تھے۔" اس نے لکھا کہ وہ اب بھی مصطفیٰ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے لیے بھارت جانا بھی ممکن تھا۔ بچوں کے ساتھ دہلی جا سکتے تھے۔ وہاں ہمارا بہت خیال رکھا جاتا۔ مصطفیٰ کو ایک ریڈیو ٹرانسمٹر فراہم کر دیا جاتا جس کی مدد سے وہ پاکستانی عوام کے نام پیغامات نشر کر سکتا۔ "ہم بڑے آرام سے رہیں گے۔ کابل یا دہلی..." میرا دل ان دونوں جگہوں کو قبول نہ کر سکا۔ میں پاکستان اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ "اگر ہم بھارت چلے گئے تو پھر ہماری زندگی میں پاکستان کا کوئی حصہ رہے گا یا نہیں؟ کیا ہمیں کبھی وطن لوٹنے کی اجازت مل سکے گی؟ کیا ہمارے پاس بھارتی پاسپورٹ ہوں گے۔؟" "وہ دن آئے گا جب ہم عزت و احترام کے ساتھ واپس لوٹیں گے۔"

ہم پاکستان چلے آئے۔

باب - ۵

مامتا بھی ہے ستم ایجاد کیا

1953ء - 1971

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زر و زمرد و گوہر نہیں ہوں میں

پال بیون پیٹ مین نے ۱۹۵۷ء میں ایک خاتون کی پینٹنگ تیار کی تھی جو آج بھی میرے گھر کی دیوار پر آویزاں ہے۔ اس میں ایک ہوشربا حد تک حسین عورت کو زمردیں سبز ساڑھی میں لپٹا دکھایا گیا ہے۔ خدوخال کی رعنائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فنکار نے پہلے وہم وخیال کی کسی دنیا کی سیر کی اور پھر ایک ذہنی کرشماتی صورت کی تصویر کھینچی۔ اس کے باوجود پینٹنگ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کرتی۔ اس بات کا مجھے نہیں تو اور کسے پتہ ہوگا۔ یہ تصویر میری امی کی ہے۔

میری امی، شمونہ، جیتی جاگتی داستان ہیں۔ جتنی حسین اتنی ہی سحر آگیں اور لستعلیق۔ ان خصوصیات سے ان کے ذہن کی برائی میں مزید نکھار آیا۔ خوش گفتاری کا یہ عالم کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ بقول والد صاحب، ہمارا گھر ان کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ سورج تھیں اور ہم سب ان کے گرد گھومنے والے سیارے۔ ہماری جو بھی شناخت تھی ان کے حوالے سے تھی۔ اور جب وہ ہمارے مدار سے دور ہو جاتیں تو ہمارا وجود قائم تو رہتا مگر گھٹنا جاتا۔ ان کی شخصیت میں تحکم بہت تھا۔ ابروؤں کی خفیف سی جنبش بھی دوسرے کو لرزہ براندام اور حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ گھر بار کے سب قاعدے قانون آپ وضع کرتیں اور پھر دیکھتی رہتیں کہ ان پر سختی سے عمل کیا جا رہا ہے

یا نہیں۔ حکم عدولی بغاوت کے مترادف تھی۔ وہ ہم پر چھائی رہتی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے ہم میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ ہمارے دن دائمی مرعوبیت کے عالم میں گزرتے تھے۔ ہم بہت زور مارتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ ان کی دھندلی سی نقل بن کر رہ جاتے۔

امی کا تعلق واہ میں آباد کھٹڑ قبیلے کے حیات خاندان سے تھا۔ "واہ" کلمۂ تحسین ہے۔ سنا ہے جب شہنشاہ جہانگیر کی نظر پہلی بار اس علاقے پر پڑی تو وہ بے اختیار "واہ" کہہ اٹھا۔ وہ یہاں اپنی بیگم نورجہاں کے ساتھ آیا اور آتے ہی اس علاقے کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ حیات خاندان کے افراد انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے اور انہوں نے تاجِ برطانیہ کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کے صلے میں استعماری آقاؤں نے انہیں بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ حیات ہسپانیہ میں عربوں کے دوش بدوش لڑتے رہے تھے۔ اور یورپ میں قیام کے دوران انہوں نے ہسپانوی عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ ہسپانیہ کی قدیم بندرگاہوں میں سے ایک میں ایک دروازہ آج بھی باب کھٹڑ کے نام سے مشہور ہے۔ حیات خاندان کا دعویٰ ہے کہ ان کا جاذب نظر حسن وجمال مختلف نسلوں کے آپس میں شادی بیاہ کا ثمرہ ہے۔

امی کا خاندان خوب تعلیم یافتہ تھا اور اس کے افراد راجوں اور نوابوں کی ریاستوں کی سیاست میں سرگرمی کا حصہ لیتے تھے۔ تقسیم سے پہلے یہ ریاستیں ہندوستان کے طول وعرض میں بکھری ہوئی تھیں۔ امی کے نانا، رائے بہادر، گیارہ برس تک پٹیالے کے وزیراعظم رہے۔ امی کے والد کو، خسر کے انتقال کے بعد، اسی عہدے پر مامور کیا گیا اور وہ مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے اٹھارہ سال وابستہ رہے۔ میرے نانا کا نام نواب سر لیاقت حیات خاں تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی، سر سکندر حیات خان، تقسیم سے پہلے پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے۔ دونوں بھائیوں کو برطانوی راج کی خدمات انجام دینے کے صلے میں سر کا خطاب ملا تھا۔ ایسے خاندان کا استعماری اقدار سے وابستہ رہنا فطری امر تھا۔ امی نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی جہاں برطانوی طرز زندگی کی نقل غلامانہ انداز میں اتاری جاتی تھی اور سانولے صاحب ٹھیٹ "پکا" صاحب بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے اپنی الگ تھلگ دنیا میں بعض مقامی لوگوں کو تھوڑی سی رسائی کا موقع دے دیا تھا۔ جن خاندانوں پر انگریزوں کی سب سے زیادہ نظر عنایت تھی ان میں حیات خاندان بھی شامل تھا۔ انگریزوں کی طرف سے یہ اذن باریابی اہم تھا کیوں کہ مقامی لوگوں کی بھاری اکثریت کی تقریبی رہنمائی کے لیے انہیں مراعات یافتہ خاندانوں کی طرف تکنا پڑتا تھا۔ انگریزوں تک رسائی بجائے خود اقتدار تھا۔

حیات خاندان کے مردوں کے وہی مشاغل تھے جو فارغ البال امیروں کے ہوا کرتے ہیں۔ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا کہ کپڑے نہایت عمدہ سلے ہوں۔ وہ پولو کھیلتے، تازہ ترین ناچ سیکھتے، شکار کھیلنے جاتے اور پُرتکلف ضیافتیں دیتے۔ خواتین نے اپنی مشرقی دل فریبی برقرار رکھی۔ وہ عجیب عجیب وضع قطع کے لباس زیب تن کرتیں۔ لیکن ان کی گفتگو اور رویے میں انگریزی پن آ گیا۔ بیشتر ہندوستانی، جنہیں ملک کے چیدہ طبقے سے کسی قسم کے معاشرتی میل جول کا موقع نہ دیا جاتا تھا، ان عورتوں کو "نئے رنگ کی" یا "چہ رانگ" سمجھتے تھے۔ حیات خاندان کی عورتیں چونکہ بہت خوبصورت تھیں اس لیے انہیں اور زیادہ مشکوک سمجھا جانے لگا۔ باہر والوں کا خیال تھا کہ جس عورت نے برقع اتار دیا اسے بدچلن ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

امی پندرہ سال کی ہوئیں تو انہیں نواب ٹانک کے بڑے بیٹے سے بیاہ دیا گیا۔ شادی خاندانوں کے بڑوں نے طے کی تھی۔ اس کے کچھ سیاسی پہلو بھی تھے۔ نواب کے ساتوں بیٹے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ گھوڑوں کی نسل افزائی کرتے، پولو، گولف اور کروکے کھیلتے اور برطانوی زمینداروں کی طرح رہتے سہتے۔ انہیں ہوابازی سے بھی لگاؤ تھا اور ان کے پاس طیاروں کا اپنا بیڑا تھا۔ مغرب کی ہوا لگنے کے باوجود ٹانک کا نوابی خاندان انتہائی قدامت پسند تھا۔ عورتوں کا غیروں کے سامنے آنا تو کجا، انہیں یہ بھی منظور نہ تھا کہ ان کی آواز کسی نامحرم تک پہنچے۔ عورت کا صرف ایک ہی کام تھا۔ بیٹے پیدا کرنا۔ بچی کی پیدائش کو لعنت سمجھا جاتا تھا۔ امی جلد ہی حاملہ ہو گئیں۔ انہیں اس بارے میں بڑی تشویش تھی کہ پہلوٹھی اولاد کیا ہو گی۔ لڑکا یا لڑکی؟ ٹانک میں واقع کونونٹ کی راہباؤں نے انہیں بتایا کہ اگر بچی پیدا ہوئی تو نواب اسے جان سے مار دے گا۔ امی کو ہول اٹھنے لگے۔ انہیں اچانک سجھائی دیا کہ نواب کے کوئی بیٹی تو ہے ہی نہیں کیا انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا؟ محل میں جو اڑتی سی خبریں سننے میں آئی تھیں انہوں نے اور راہباؤں کے کہے نے ان کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔

زچگی کے لیے لاہور آنے سے پیشتر وہ تہیہ کر چکی تھیں کہ اس وحشیانہ گھرانے میں ہرگز لوٹ کر نہ جائیں گی۔ ان کا فیصلہ درست تھا۔ جب میری بہن، روبینہ، پیدا ہوئی تو ٹانک بھر میں کالے جھنڈے لہرائے گئے۔ امی کے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بہت عرصے بعد میرا ایک ایسے مرد سے تعلق ہوا جس کا خاندان بھی شیر خوار کشی کی اسی زمانۂ وسطیٰ کی رسم پر عمل پیرا تھا۔ بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا۔

امی نے شوہر سے تعلق ختم کر لیا اور لاہور میں ٹھیر گئیں۔ وہ ابھی بالکل نوجوان تھیں اور ان کے حسن پر روز بروز مزید نکھار آ رہا تھا۔ بے شمار مرد ان سے شادی کرنے

کے مستنی تھے۔ میرے والد صاحب بھی، جو فوج میں کپتان اور اس وقت کے پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر کے اے ڈی سی تھے، امیدواروں میں شامل تھے۔ میرے والد کا تعلق ابدالی خاندان سے ہے جو اپنا شجرۂ نسب افغانستان کی شاہی خاندان سے ملاتے ہیں۔ پوپل زئی درانی قبیلے کی ایک شاخ ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ افغانستان کے حکمرانوں کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ والد صاحب کے اب وجد صوبہ سرحد میں چارسدہ کے مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ وہ پشتو بولتے ہیں اور خود کو پختون کہتے ہیں۔

والد صاحب کا پس منظر نہایت قدامت پسندانہ تھا۔ ان کے آباواجداد سیدھے سادے لوگ تھے جو اپنی الگ تھلگ دنیا بسائے بیٹھے رہتے تھے۔ میرے دادا خان عبدالغفار خان کی سرخ پوش پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ یہ پارٹی ہندوستان کی کانگریس پارٹی کا ضمیمہ تھی۔

والد صاحب نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں تعلیم حاصل کی جو بیوروکریٹ حضرات، ثقافتی اعتبار سے مایہ ناز افراد اور ٹیکنوکریٹ صاحبان کی نرسری ہے۔

امی اور ان کی ملاقات لاہور کے ایک ریستوراں میں ہوئی۔ وہ امی کے پیچھے پیچھے پھرنے لگے۔ انہیں شادی پر آمادہ کرنا چاہا۔ امی کو اس چھیلے بانکے نوجوان پٹھان کو اپنا بنانے کا کوئی خاص اشتیاق نہ تھا۔ ابھی ابھی وہ شادی کا مزہ چکھ چکی تھیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ میری نانی کی مداخلت سے کام بن گیا۔ انہوں نے والد صاحب کو دیکھتے ہی پسند کر لیا۔ ان کے نزدیک اچھی شکل صورت کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہ تھی۔ والد صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کا خاندان اس رشتے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی مخالفت کی پروا نہ کی اور شادی کر لی۔ پٹھان نوجوان پنجابیوں میں شادی نہیں کرتے۔ ان کے بیٹے نے جو لڑکی پسند کی تھی وہ نہ صرف پنجابی تھی بلکہ مطلقہ بھی تھی اور ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بھی۔

۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ امی کو، جو متمول گھرانے میں پلی بڑھی تھیں، کپتان کی تنخواہ پر گزارا کرنا مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا معیار زندگی گرتا جا رہا ہے اور تہیہ کر لیا کہ اسے نمایاں طور پر بہتر بنا کر ہی دم لیں گی۔ میں ۱۹۵۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ والد صاحب ابھی فوج میں تھے اور وہی کپتان کے کپتان۔ میرے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی زندگی کا چارج امی نے سنبھال لیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ والد صاحب کو ذہنی اور مالی طور آگے بڑھنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ والد صاحب کو اپنے بیچ کے ساتھیوں اور پینے پلانے کی محفلوں کے یاروں دوستوں کو خیر باد کہنا ہو گا۔ انہوں نے طے کیا کہ اب وہ اپنے سے بڑی عمر کے ایسے

لوگوں کی صحبت اختیار کریں جن کی زندگی کامیابی سے عبارت تھی، جو صنعت کے رہنما تھے، سیاست داں تھے یا نامی گرامی جاگیردار تھے۔ انہوں نے امی کی پسند اور ناپسند کے مطابق چلنا شروع کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی اور مستقبل کی بہتری اسی میں ہے۔ تاہم ان جیسے اکھڑ فوجی آدمی کو میاں ممتاز دولتانہ جیسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت اکھرتا ہوگا۔

امی کے تقاضے اور پہل قدمی پر والد صاحب لائیڈز بینک میں ملازم ہو گئے انہیں تربیت کے لیے انگلینڈ بھیجا گیا۔ میرا اکلوتا بھائی، عاصم اللہ درانی، لندن میں پیدا ہوا۔ والد صاحب لائیڈز بینک میں کام کرتے رہے لیکن جب بینک کے گرنڈلیز بینک میں ضم ہونے کی نوبت آئی تو انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ امی کی نظر میں بینکر ہونا کافی نہ تھا۔ انہوں نے والد صاحب کے لیے کچھ اور منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ انہیں ابھی بہت سی سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ سیڑھیوں اور سانپوں کے اس کھیل میں امی نے سانپوں کو ان سے دور رکھا تاکہ وہ کسی قسم کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر قدم آگے بڑھاتے جائیں۔

وہ پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹ منٹ کارپوریشن لمیٹڈ (PICIC) میں چلے آئے۔ یہ مالیاتی ادارہ پاکستان کی شیرخوار صنعت کو قرضے فراہم کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں انہیں ایسے ہونہار صنعت کاروں سے ملنے جلنے کا موقع ملا جو جلد ہی ارب پتی کاروباری بن گئے۔ انہوں نے دلکش شخصیت کے مالک، ذہین و فطین شاکراللہ درانی سے اپنی کاروباری معاملت کو کبھی فراموش نہ کیا۔ میرے والد پکک کے ڈپٹی منیجنگ ڈائرکٹر بن گئے۔ جب ایوب خاں کے دور میں انویسٹ منٹ کارپوریشن آف پاکستان (ICP) کا قیام عمل میں آیا تو منیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے کے لیے انہیں کو سب سے موزوں خیال کیا گیا۔ انہوں نے انتہائی تیزی سے ترقی کی۔ ان کی کامیابی کا بیشتر سہرا امی کے سر تھا۔ انہوں نے والد صاحب کے اس جذبے کو کبھی سرد نہ پڑنے دیا کہ مزید کچھ کر کے دکھانا چاہیے۔ آئی سی پی والد صاحب کے لیے زبردست چیلنج تھی۔ انہوں نے اس اولین تجارتی بینک کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے ان تھک محنت کی اور انہیں کی نگرانی میں یہ کامیاب ہوا۔

والد صاحب کو دو اور عہدے تفویض کیے گئے۔ دونوں عہدے نہایت قدرومنزلت کے حامل تھے اور بہت لوگوں کو ان پر فائز ہونے کی حسرت تھی۔ انہوں نے پہلے پی آئی اے کے منیجنگ ڈائرکٹر کے طور پر کام کیا اور بعد ازاں یحیٰ خاں کے دورِ حکومت میں سٹیٹ بینک کے گورنر رہے۔

جب بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تو والد صاحب کو چن کر زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

ان پر سنگین الزامات لگائے گئے۔ کہا گیا کہ پی آئی اے کے منیجنگ ڈائرکٹر کے طور پر ان کے سی آئی اے سے تعلقات تھے۔ پی آئی اے واحد بین الاقوامی ایرلائن تھی جسے عوامی جمہوریہ چین آنے جانے کے حقوق دیئے گئے تھے۔ سی آئی اے کو چین سے دلچسپی تھی جو سٹ سٹا کر مکمل عزلت نشینی اختیار کرنے کے بعد باقی دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ مبینہ طور پر والد صاحب کے تعاون سے ایک سازش کی گئی۔ سازش یہ تھی کہ چین پر پرواز کرنے والے طیاروں کے پروں کے نیچے فوٹو گرافی کے انتہائی جدید آلات نصب کر دیے جائیں۔ ان کیمروں کی مدد سے چینی تنصیبات اور ہوائی اڈوں کی فضائی تصویریں اتاری جاتی تھیں۔ یہ نہایت پیچیدہ جاسوسی کاروائی تھی جس کے لیے کہتے ہیں، رقم سی آئی اے نے فراہم کی تھی۔ بظاہر یہ رقم ناتراشیدہ ہیروں کی صورت میں ادا کی گئی تھی۔ چینی حکومت کو جلد ہی اس خفیہ کاروائی کا پتہ چل گیا اور اس نے پاکستان سے احتجاج کیا۔

اس زبردست دغابازی کی کہانیاں ملک کے بالائی طبقے میں کھلم کھلا گردش کرتی رہیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ان کا اس نامعقول معاملے سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔ انہیں عدالت نے تمام الزامات سے بری تو کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ چھ مہینے جیل میں پڑے رہے۔ رہائی کے بعد بھٹو صاحب نے انہیں منانے کی کوشش کی۔ والد صاحب نے انکار کر دیا۔ وہ پاکستان سے چلے جانا چاہتے تھے۔ ان کی طبیعت متنفر ہو چکی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ ان کی تذلیل کی گئی ہے۔ ان کا پاسپورٹ لوٹا دیا گیا اور وہ امریکہ جا کر فرسٹ نیشنل سٹی بینک میں بطور وائس پریذیڈنٹ شامل ہو گئے۔ انہیں نیویارک میں بینک کے صدر دفتر میں تعینات کیا گیا۔

کچھ تو نمود خواہی کا تقاضا تھا اور کچھ مالیات کے شعبے میں اپنی مہارت پر اعتماد کا۔ والد صاحب نے بینک آف مونٹریال کے ساتھ مل کر انگلینڈ میں ایک بینک تشکیل دیا جس کا نام انٹرنیشنل ریسورس اینڈ فنانس بینک لمیٹڈ (IRFB) تھا۔ بینک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ والد صاحب اپنی پہلی پیشہ ورانہ ناکامی سے دوچار ہوئے۔

فوجی بغاوت کے بعد، جس میں بھٹو صاحب کا تختہ الٹا گیا، وہ پاکستان لوٹ آئے انہوں نے صوبہ سرحد اور سندھ میں صنعتیں لگائیں اور کچھ وقت پاکستان میں گزارنا شروع کر دیا۔ انگلینڈ میں جو گھر تھا وہ بھی انہی نے قائم رکھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرا بچپن بڑے عیش و آرام سے گزرا تھا۔ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اگر کوئی مالی بحرانی درپیش بھی ہوتا تو بچوں تک اس کی خبر پہنچنے ہی نہ پاتی۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ برقرار رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔ ہم ماڈل خاندان تھے؟ اس قسم کے

بچے جنہیں شیطان لڑکے لڑکیوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے بڑی سیر و سیاحت کی اور بیرونِ ملک بھی آسودگی سے رہے۔ ملک سے باہر چھٹیاں منانے جاتے تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہوتا تھا کہ وہاں جا کر بڑی کفایت شعاری سے کام لیں گے۔

عدیلہ، زرینہ اور امینہ کی دیکھ بھال میری بڑی بہن روبینہ کے ذمے تھی۔ جب تک اس کی شادی نہ ہو گئی وہ یہ فرائض انجام دیتی رہی۔ گھر اس کے لیے تربیت گاہ تھا۔ بچیوں کو پال پوس کر بڑا اسی نے کیا۔ ہم سب کی آیائیں موجود تھیں لیکن امی بضد تھیں کہ روبینہ کو اپنے گھر کی ہونے اور اپنے بچے سنبھالنے سے پہلے بچوں کو پالنے پوسنے کے ہنر میں طاق ہو جانا چاہیے۔ اس عمر میں، جو کھیل کود اور خوش وقت ہونے میں گزرنی چاہیے تھی، روبینہ کمال مستعدی سے اپنے کام میں منہمک رہتی۔

امی کے خلوت خانے کی دیکھ بھال کی ذمے داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ مجھے خیال رکھنا پڑتا کہ ان کے ملبوسات صحیح حالت میں ہیں اور توشک خانے کا بندوبست ان کے اعلیٰ معیاروں کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ جو کام مجھے سونپا گیا تھا اس سے مجھے سخت چڑ تھی۔ روبینہ کے ذمے کام ہی ایسا تھا کہ لوگوں کی نظر اس پر زیادہ پڑتی تھی۔ وہ ہر وقت ادھر ادھر پھرتی۔ کبھی بچیوں کو کھلانے پلانے کا انتظام ہو رہا ہے تو کبھی انہیں نہلانے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا ہے۔ کلوٹ بدلے جا رہے ہیں۔ کبھی "ٹھمکتے، ابکائیاں لیتے" بچے کو گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ گھر میں اور آنے جانے والوں میں ہر وقت اس کے محنتی ہونے کا ذکر ہوتا رہتا۔

میرا کام نرا بلڈ پریشر بڑھانے اور قلبی بیماری کا نسخہ تھا۔ امی کا توشک خانہ اور ان کے زیورات میرے سر پر سوار رہنے لگے۔ میرے ذہن پر ہر وقت زبردست بوجھ رہتا۔ میں خاصی مخبوط الحواس واقع ہوئی ہوں۔ اکثر میں ان کے جواہرات کی صندوقچی کی یا توشک خانے کی چابیاں غلط جگہ رکھ کر بھول جاتی۔ یہ سوچ کر میری روح فنا ہونے لگتی کہ اگر امی کو توشک خانے سے کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو میں تعمیلِ ارشاد سے قاصر رہوں گی۔ میں نے انہیں کبھی برہم ہوتے دیکھا تو نہ تھا لیکن اس خیال ہی سے میری سٹی گم ہو جاتی کہ امی ناراض ہوں گی۔

امی کے توشک خانے کی نگران بی بی (یعنی مجھے) کچھ اور کرنے کے لیے مشکل ہی سے وقت ملتا تھا۔ ہر روز میں ان کا صبح کا لباس، میچ کرنے والے جوتے، دوسرے لوازمات کے ساتھ نکال کر رکھنے کے بعد سکول جاتی تھی۔ مجھے یہ بھی ملحوظ رکھنا پڑتا کہ جو زیورات چنے گئے ہیں وہ ان کے لباس پر یا لباس کے رنگوں پر بدنما تو نہیں لگیں گے۔

سکول سے واپس آتے ہی ان کی ڈنر کا لباس نکالنا اور سنوارنا پڑتا۔ میں خاص خیال رکھتی کہ کپڑوں پر ٹھیک طرح استری کر دی گئی ہے۔ جو بل باقی رہ جاتے تھے وہ صرف میرے ماتھے پر پڑے ہوتے۔

امی کو کپڑے پہنانا نہایت لمبی چوڑی اور پیچیدہ رسم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے فرانسیسی طرز کا کھانا تیار کیا جا رہا ہو۔ ان کے ملبوسات کو ایک خاص ترتیب سے رکھنا پڑتا تھا۔ ہر چیز، جوتوں سے لے کر بٹنوں تک، بالکل ٹھیک جگہ پر رکھ دی جاتی۔ میں پہلے سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ چیزیں انہیں کس ترتیب سے تھمانی ہیں۔ وہ صرف ہاتھ پھیلاتیں اور میں ان کا حکم بجا لانے کے لیے دوڑ پڑتی۔ کوئی چیز وہ خود نہ اٹھاتی تھیں۔ یہ کام میرے ذمے تھا۔ وہ پوری توجہ اگر دیتی تھیں تو صرف میک اپ اور بالوں کی سجاوٹ پر۔ باقی باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بعینہ جیسے روبینہ لائق فائق گورنس بننے کا کورس کر رہی تھی اسی طرح میں مستعد خواص کی تربیت حاصل کرنے میں مشغول تھی۔

شام کو جب وہ اپنے خلوت خانے سے باہر چلی جاتیں تو میں ان کا شب خوابی کا لباس بستر پر اور بیڈروم سلیپر ٹھیک جگہ پر رکھ دیتی تاکہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔ اگلی صبح میں ان کے کپڑے اٹھا کر سنگواتی اور تمام نگوں کو گننے کے بعد ان کی جیولری مقفل کرنے کا خاص خیال رکھتی۔ ان تمام مصروفیات کے دوران جو وقت ملتا اس میں اپنا ہوم ورک کرتی۔

اپنی بلوغ زندگی کے دوران بیشتر وقت میں امی کی خوش لباسی کی نقل اتارتی رہی۔ میں نے جو ملبوسات جمع کر رکھے تھے انہیں دیکھ کر بھی شک یہی ہوتا تھا کہ کہیں میں امی کا توشک خانہ تو نہیں اٹھا لائی۔ میں نے بالآخر رنگوں کو جو خیرباد کہا اور سفید رنگ کے سادہ سوتی کپڑے پہننے کا فیصلہ کیا تو اس کا جزوی سبب بھی یہی تھا کہ توشک خانہ سے وابستہ تمام علتوں میں ضرورت سے زیادہ مبتلا رہ چکی تھی۔ توشک خانے سے اس سابقے نے مجھے خوف زدہ بھی کیا اور حواس باختہ بھی۔ بارہ برس کی لڑکی کے لیے یہ عظیم الشان بوجھ اٹھانا کارے دارد تھا۔

تیرہ برس کی ہوئی تو بیمار پڑ گئی۔ ہر شام مجھے تیز بخار چڑھ جاتا۔ ڈاکٹر اسے ٹائیفائڈ سمجھ کر علاج کرتے رہے یہاں تک کہ میری بیماری نے بحرانی صورت اختیار کر لی۔ والد صاحب نے مجھے انگلینڈ لے جانے کے انتظامات کیے۔ بچوں کی خصوصی معالج، ڈاکٹر مبارکہ شاہ نے تشخیص کی کہ مجھے گردن توڑ بخار (MENINGITIS) ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مبارکہ نے کہا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ سفر کرنا بیکار ہے۔ مجھے لمبر پنکچر ٹیسٹوں،

کے عذاب سے گزرنا پڑا جو نہ صرف بہت خوف ناک بلکہ بہت تکلیف دہ بھی تھے۔ خدشہ یہی تھا کہ میں جلد ہی اللہ کو پیاری ہو جاؤں گی۔ میں نے ڈاکٹر کو والد سے باتیں کرتے سنا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "غالباً یہ بچ نہیں سکے گی" والد صاحب میرے سرہانے بیٹھ کر رونے لگے۔ مری میں سکول میں ننوں نے خصوصی اسمبلی بلائی جس میں میری زندگی کی دعائیں مانگی گئیں۔

میں چھ مہینے تک بستر پر پڑی رہی۔ امی کے ہاں چھٹے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ میری بیماری کی وجہ سے یہ حمل ضرور خاصا خوف ناک ثابت ہوا ہوگا۔ گھر پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ والد صاحب مجھے ہسپتال میں داخل کرانے پر رضامند نہ ہوئے۔ انھوں نے میرے لیے نرسوں کا بندوبست کیا جو دن رات میرے پاس موجود رہتیں۔ اور مہمانوں کے کمرے کو ہسپتال میں بدل دیا۔

میں صحت یاب ہو چلی تھی تو امی کے بچی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا نام عدیلہ رکھا۔

گردن توڑ بخار میں مغز کے گرد تنی ہوئی جھلی متورم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس بیماری کا تعلق میرے دماغ سے تھا اس لیے اسے ہتھیار کے طور پر پہلے امی نے اور بعد میں مصطفےٰ نے میرے خلاف استعمال کیا۔ ڈاکٹر مبارکہ شاہ کا کہنا تھا کہ میں ان کی معجزاتی طور پر تندرست ہو جانے والی مریضہ ہوں۔ اس بیماری سے میری سماعت، بینائی، دماغ متاثر ہو سکتا تھا۔ میں مفلوج ہو سکتی تھی۔ مگر میں پوری طرح صحت یاب ہو گئی۔ دو برس تک دوائیاں کھاتی رہی اور امی کی کڑی نگہداشت میں کراچی جیززس اینڈ میری کونونٹ میں تعلیم حاصل کی۔

میری نانی موجود نہ ہوتیں تو میرے خیال میں مجھے کبھی پتہ ہی نہ چل سکتا کہ غیر مشروط محبت نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نانی کے بہت قریب تھی۔ والدین جب بھی کسی باہر کے ملک جاتے ہمیں نانی کے پاس بھجوا دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اور زرمینہ کو انھیں نے پالا پوسا۔ ان کے پاس جا کر رہتے تو یوں لگتا جیسے کسی ایسے بیگار کیمپ سے چھٹی مل گئی ہو جہاں مجھے ہر وقت اپنے ذہن سے بیگار لینے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ نانی کے ہاں میں اپنی سرشت کے ان پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لے سکتی تھی جنھیں گھر پر گھونٹ کر رکھنے پر مجبور تھی۔ نانی ہی وہ ماں تھیں جن کی مجھے ضرورت تھی، مجھے تمنا تھی۔ ان کی محبت میرے لیے سلامتی کا پیام تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو ان کے بستر میں سونا چاہتی تھی۔ ان کے سائے تلے مجھے کسی چیز کا ڈر نہ تھا۔ وہ میری زندگی میں سب سے اہم شخصیت تھیں۔ میں ایسی محبت

کی جاؤں میں چین کا سانس لے سکتی تھی جو مجھ سے کسی پہلے سے لکھے ہوئے رول کو ادا کرنے کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

میرا فنکارانہ رجحان نانی اماں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ انھیں یقین تھا کہ تمام فنکار اگر پاگل نہیں تو خبطی ضرور ہوتے ہیں۔ انھیں یہ ناپسند تھا کہ میں دل بہلانے کے لیے رنگوں سے کھیلوں۔ ہر بار جب میں برش اٹھا کر کینوس کا رخ کرتی تو انھیں یوں لگتا کہ میں پاگلوں کی سرزمین میں قدم دھر رہی ہوں۔ کبھی کبھار وہ پاس بیٹھ کر مجھے پینٹ کرتے دیکھتی رہتیں۔ مجھے مشورے دیتیں۔ انھوں نے میری تصویروں میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور بار ہا اصرار کیا کہ میں کینوس پر لگے رنگوں کو بدل دوں۔ میری تصویریں بالعموم مریضانہ اور دل اچاٹ کرنے والی ہوتی تھیں۔ نانی اپنے طور پر مجھے خفقانی ہونے سے بچانے میں لگی رہتیں۔

ایسی ماں کے ساتھ رہنے کے بعد جسے بظاہر بہت کم باتیں اچھی لگتی ہوں، کوئی آدمی بھی MANIC DEPREMINE (جو کبھی انتہائی پرجوش اور خوش نظر آئے اور کبھی بالکل پژمردہ اور مایوس) ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے رویے نے ہم گھر والوں کو ایسی زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیا تھا جو ہمارے مزاج کے بالکل منافی تھیں۔ ہم سب ان کے حضور میں کچھ نہ کچھ ثابت کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وہ توقع رکھتی تھیں کہ ہم ان کے معیار اور توقعات پر پورا اتریں گے۔ یہ آسان نہ تھا۔ وہ کاملیت پسند تھیں۔ اور چاہتی تھیں کہ جو کام ہو وہ بالکل بے عیب ہو۔ میں نے زندگی بھر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ میں نے ان کے معیار کے مطابق زندگی گزارنی چاہی اور اس کوشش میں فریب اور اذیت سے بھری زندگی بسر کی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی آدمی اپنے فطری انداز پر قائم رہ کر ان کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ وہ حقیقی تپاک اور چاہت پر تصنع کو ترجیح دیتی رہیں۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ان دونوں میں فرق کرنے کی اہلیت ہی کھو دی۔

ہمارے والدین بہت حسین و جمیل تھے۔ ہم سے بھی حسین و جمیل ہونے کی امید رکھی جاتی تھی۔ یہ ہمیشہ تو ممکن نہیں ہوتا ہمارے GENES ہمارے کنٹرول میں نہیں تھے۔ ہمارا ہر وقت والدین سے موازنہ کیا جاتا۔ ہمارے ماموں چچا، ممانیاں چچیاں وغیرہ ہم پر ایک نظر ڈال کر اس طرح آنکھیں جھپکنے لگتے جیسے انھیں اپنے دیکھے پر یقین نہ آ رہا ہو۔ "تہمینہ، تم تو اتنی خوبصورت ہو۔ تمہارے ہاں یہ مری مری چھپکلیاں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔" ہم تینوں کے چھوٹے چھوٹے رخسار شرم سے جل اٹھتے۔

یاد آتا ہے کہ اس وقت مجھے بہنوں میں سب سے گئی گزری کہا جاتا تھا۔ میں

اس وقت بمشکل بارہ برس کی تھی اور اس اوکھی عمر میں ہر بات یا تو بہت بڑی لگتی ہے یا بہت چھوٹی۔ ان موازنوں سے مجھے نفرت تھی۔ کوئی ہمیں یہ سمجھ کر نہ دیکھتا کہ ہم جیسی ہیں ویسی ہی سہی۔ ہمیں گویا آئینے کے روبرو بٹھا دیا جاتا اور ہر کوئی یہ توقع رکھتا کہ آئینے میں ثمینہ کی صورت نظر آ جائے گی۔

جب میں سولہ برس کی ہوئی تو میرے بارے میں لوگوں کی رائے بدلنے لگی۔ اب میرا امی سے مثبت انداز میں موازنہ کیا جانے لگا۔ لوگ اب بھی بات امی کے حوالے ہی سے کرتے تھے۔ "تہمینہ تو اپنی ماں سے خاصی ملتی ہے۔"

مجھے یہ ذرا نہ بھایا۔ میں امی جیسی نظر نہ آنا چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی جیسی لگوں۔ اس موازنے کا امی نے برا مانا۔ انھوں نے میری کایا کلپ کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان کے خیال میں میں اب بھی خاندان بھر کی نظر بٹو تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کی معمولی شکل صورت کی بیٹی کا ان سے کیوں موازنہ کیا جا رہا ہے۔ جب بھی میرے بارے میں اس طرح کا کوئی فقرہ کہا جاتا وہ خاموش رہتیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھیں کہ مجھ میں ان کی مشابہت آتی جا رہی ہے۔ انھیں مجھ سے جو عار تھا وہ کہیں اب جا کر میری سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ والد صاحب سے شادی کے بعد میں ان کی پہلی اولاد تھی اور پیدائش کے وقت کوئی عجیب الخلقت چیز معلوم ہوئی ہوں گی۔ امی لازمی طور پر دہشت زدہ ہو گئی ہوں گی۔ وہ اپنی بچی کو دنیا والوں کے سامنے فخر سے پیش نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے اس کا قصور وار مجھے ٹھہرایا اور یوں ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے بدمزگی راہ پا گئی۔ ان کی زندگی میں سماجی سطح پر قبولیت اور حیثیت کی بڑی اہمیت تھی۔ یہی معاملہ حسن و جمال کا تھا۔ انھوں نے اپنی جو ستھری ستھری ترشی ترشائی امیج بنائی تھی اسے ان کی بےبی نے آ کر بگاڑ دیا تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کیے بغیر کہ میری آمد سے انھیں صدمہ پہنچا ہو گا میں امی سے اپنے کشیدہ تعلقات کو نہیں سمجھ سکتی۔ میری زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں وہ مجھ سے آزردہ ہو گئی ہوں گی۔

یاد نہیں آتا کہ امی نے مجھے کبھی گلے لگایا ہو یا اپنے ساتھ چمٹایا ہو یا مجھے کبھی امی کی جسمانی قربت حاصل رہی ہو۔ ایک بھی ایسا موقع یاد نہیں جب بچپن میں انھوں نے مجھے چوما ہو۔ مدتوں بعد جب میری زندگی میں ایسا وقت آیا کہ انھوں نے محبت ظاہر کرنی چاہی تو میں جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ان کی اچانک شفقت کا بوجھ مجھ سے اٹھایا نہ گیا۔ مجھے شرمندگی اور پریشانی کا ملا جلا احساس ہوا۔

حیات خاندان کے بارے میں ایک دلچسپ بات میرے علم میں آئی۔ کھٹڑ قبیلہ

نسلی خطوط پر دو مخاصمت رکھنے والے گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک "چٹے" کھٹڑ کہلاتے تھے، دوسرے "کالے" کھٹڑ۔ چٹوں کا تعلق واہ خاندان سے ہے اور کالوں کا دھریک خاندان سے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ چٹے کھٹڑ خالص مسلمان ہیں۔ یوں چٹے کھٹڑوں کی فوقیت کا تعلق نسلی اور دینی خالص پن سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چٹے خاندان میں کالے کی پیدائش سیاپے سے کم نہیں۔

حد یہ کہ میری نانی کو بھی، جو اس قدر محبت کرنے والی روح تھیں، سانولے رنگ کی اولاد سے نباہ کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ امی اور ان کی بہن ثمر، ثمر خالہ بہت دلکش تھیں لیکن امی تباہ کن نقص کی حامل۔ ان کی رنگت سانولی تھی۔ رنگ کے بارے میں اس کمپلیکس کا انگریزوں کے ساتھ ربط ضبط سے بھی تعلق تھا بلکہ اس تعلق کی وجہ سے کمپلیکس اور چوکھا ہو گیا تھا۔ ہر اس شخص کو جس کی رنگت مطلوبہ معیار پر پوری نہ اترتی، پورے کا پورا حیات خاندان ٹھکرا دیتا۔ یہ ایک غیر معمولی طور پر خوش شکل خاندان تھا جس کے افراد کی خوبصورت آنکھیں اور ترشے ترشائے خدوخال مشہور تھے۔ رشتے داروں سے مجھے پتہ چلا کہ رنگ کے حوالے سے یہ تعصب میرے قریبی خاندان تک محدود نہ تھا۔ حیات برادری کے تمام گروہ اس پر عمل پیرا تھے۔ ایسی باتوں پر بچوں کی زندگیاں بنائی اور بگاڑی جاتیں جو ان کے اختیار سے باہر تھیں۔ فطرت اپنے کھیل تماشے جاری رکھتی جن سے بچے کی پوری شخصیت متاثر ہوتی۔ یہ GENETICS اور ماحول کا نامراد سنگم تھا۔

میں کم سنی میں آج کل کی بہ نسبت زیادہ سانولی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری رنگت کیسے صاف ہوئی۔ شاید مجھ پر اتنا دباؤ ہو کہ میں قوت ارادی سے کام لینے پر مجبور ہو گئی ہوں اور صرف ارادے کی قوت سے اپنا رنگ بدل لیا ہو۔ رنگت کی وجہ سے میری دوسری بہنوں، زرمینہ اور روبینہ کی جان بھی عذاب میں تھی۔ عدیلہ اور امینہ اور میرا بھائی بہت گورے چٹے تھے۔ حیات خاندان نے نسلی امتیاز کی پالیسی اپنا رکھی تھی اس پر میرے پاس کہنے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ "صاف" ناانصافی۔

جب ہم پندرہ سولہ برس کی ہو گئیں تو نہ جانے کیا ہوا ہم پر شگفتگی آ گئی۔ یوں لگا جیسے ہم کینچلی اتار کر گوری ہو گئی ہوں۔ یاد رہے کہ استعماری حکمرانوں کو "گورا" کہا جاتا تھا۔ زرمینہ اور میں اس کایا پلٹ پر اکثر حیران ہوتے۔ دو بدصورت بہنیں یکایک گویا جادو کے زور سے، "سنڈریلاؤں" میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری نانی اصل وہی دینی ماں ہیں جس کا پریوں کی کہانیوں میں ذکر آتا ہے۔ ان کی دعاؤں سے یہ معجزہ ممکن ہوا تھا۔ آج جب دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنا رنگ، جو ضرورت سے زیادہ

صاف ہے، تھوڑا سا سانولا تو مجھے اچنبھا ہوتا ہے۔ میں انھیں بتاتی ہوں کہ انسان کس غضب کی قوت ارادی کا مالک ہے۔ اسے بروئے کار لایا جائے تو یہ نہ صرف جسم کے اندر اپنا کمال دکھائے گی بلکہ ظاہری سطح کو بھی بدل سکے گی۔

امی مکمل اطاعت گزاری پر یقین رکھتی تھیں۔ انھیں پلٹ کر جواب دینا یا ان سے بحث کرنا گناہ تھا۔ اگرچہ میں ان کا حکم ماننے پر مجبور تھی لیکن ہمیشہ تاثر یہی دیتی کہ بغاوت پر تلی ہوئی ہوں۔ میرا باغی پن چہرے اور حرکات وسکنات سے جھلکتا رہتا تھا۔ امی جانتی تھیں کہ میں ان کی من موج کے سامنے پوری طرح جھک جانے سے ہچکچاتی ہوں۔ میری شکل دیکھ کر پتہ چل جاتا تھا کہ میں ان کے احکام طوعاً و کرہاً بجا لا رہی ہوں۔ مجھے وہ احکام زہر لگتے۔ میرا پورا وجود والدین کی طرف سے مسلط کی ہوئی اس آمریت کے خلاف نبرد آزما تھا۔ امی کو میری ترش روئی سے نفرت تھی۔ نہ جانے کیوں میں کبھی خود کو ان سے اپنے مسائل پر بات چیت کرنے کے لیے آمادہ نہ کر سکی۔ میں انھیں بتا دینا چاہتی تھی کہ میرے خیال میں ان کے احکام غیر منصفانہ تھے لہٰذا میرے لیے چہرے پر ایسی کیفیت طاری کرنا ناممکن تھا جیسے میں نے انھیں کھلے دل سے قبول کیا ہو۔

ہم کسی چیز کے بارے میں بحث نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے ذہنوں کو کشادہ فضا میں پروان چڑھنے سے روک دیا گیا۔ ہم خیالات کو چھپانے لگے۔ ذہن چھپنے کی جگہ، جائے اماں بن گیا۔ میں بہت سوچتی رہتی۔ میں جان گئی کہ ایک غیر منصفانہ ماحول میں زندگی گزار رہی ہوں لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

امی کے ساتھ باتیں تو ہم کبھی کر ہی نہ سکتے تھے۔ بس احکام کا ایک تانتا تھا۔ جو ان کی زبانی ہمارے کانوں تک پہنچتا رہتا تھا۔ جب ہم انھیں کا کام کر رہے ہوتے تب بھی خاموش ہی رہتے کہ ہمیں اسی کی تعلیم دی گئی تھی۔ کھانے کی میز پر وہ بولتی رہتیں۔ ہم سنتے رہتے۔ ان سے بحث کرنے کی ہم میں جرات نہ تھی۔ اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ گھر میں ہر طرف پُر تصنع رکھ رکھاؤ کی فضا مسلط رہتی۔

ٹھٹھول اور مذاق کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ انتہا یہ کہ بچوں جیسی شرارتوں یا بڑ دنگے پن کو دیکھ کر بھی ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ ہنسی تو بہت کم سنائی دیتی تھی۔ امی ہماری موجودگی میں ضرورت سے زیادہ درشت انداز اپنائے رہتیں۔ الکساہٹ کے مظاہرے منع، بستر میں پڑے اینڈتے رہنا منع، اوندھے لیٹ کر ٹانگیں ہوا میں جلا جلا کر کومک پڑھنا منع۔ ہم ننھی بیبیاں تھیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی کہ محفل میں پہنچ کر امی بالکل اور ہی بن جاتیں وہ ایسا چلبلاہٹ بھرا رویہ اختیار کرتیں جو اس

مزاج سے قطعاً کوئی لگا نہ کھاتا جسے وہ گھر میں اپنے پر طاری کیے رکھتیں۔

ان کی بھتیجیاں بھی تھیں۔ روبینہ، زرمینہ اور خود مجھ میں تو کسی نہ کسی درجے خرابیاں ہی خرابیاں تھیں۔ امینہ اور خاص طور پر عدیلہ پر انھیں ناز تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ میری سمجھ میں یہ کبھی نہ آ سکا کہ انھیں زرمینہ سے کیوں چڑ ر. جو انتہائی خوش مزاج دوسروں کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی اور بہت ہی پیاری بچی اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رنگ اتنا صاف نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔

ہمارے گھر میں کہیں تنکا بھی پڑا نظر نہ آتا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اس طرح موجود ہوتی جیسے بس ابھی ابھی اس کا فوٹو اتارا جانے والا ہو۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہمیں بڑی جان مارنی پڑتی۔ پھوہڑ پن کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ جرم کے مترادف تھا۔

امی مثالی میزبان تھیں۔ ان کے پاس ملازموں کی پوری فوج تھی اور ورثے میں ہم ننھے ننھے مددگار مل گئے تھے۔ ہمیں ذمے داریاں تفویض کی جاتیں۔ ہم مستعدی سے کام بھگتاتے۔ ہمیں سکھایا گیا کہ ڈنر کے لیے میز کیسے چنی جاتی ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ پانچ کورسوں پر مشتمل کھانا کس طرح پیش کیا جانا چاہیے اور اس کے لیے کس قسم کی کراکری اور چھری کانٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہم گنگنے پانی میں گلاب کی پنکھڑیاں بکھیر کر فنگر بول تیار کرتے۔ بول کے کنارے پر لیموں کی قاش رکھنا کبھی نہ بھولتے۔ ہمیں پھول سجانے کی تربیت دی گئی تھی اور ہمیں پتہ تھا کہ ہر مہمان کے روبرو نمک دان، کالی مرچ دان، فنگر بول، مختلف قسم کے اچار چٹنیاں اور سلاد موجود ہونے چاہئیں۔ امی سارا سال کی تگ ودو کے بعد روز نیتھال اور ویج وڈ کراکری کی ایک حیرت ناک رینج اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں جس کی وہ فخریہ نمائش کرتی رہتیں۔

امی کی رات کی محفلوں میں بڑے لوگ آتے۔ اچھی شاعری ان پر جادو کا سا اثر کرتی۔ وہ غزلوں اور نظموں کی باریکیوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ ہمیں بٹھا کر جمیل الدین عالی اور زہرہ نگاہ جیسے شعرا کا کلام سنوایا جاتا۔ یہ دونوں ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ ہمارے ہاں اکثر آیا کرتے۔ جب بھی ہمارے حبیب جالب کو جیل جانا پڑتا اور جیل جانا ان کا معمول بن ہی چکا تھا، امی ان کی کیسٹ لگا دیتیں جس میں وہ اپنی انقلابی نظمیں پڑھتے سنائی دیتے۔ دوسرے صحافیوں کو بھی پاکستان کی ممتاز شخصیتوں میں سے چنا جاتا۔ امی کی تیز بینی کا یہ عالم تھا کہ وہ پہلے سے بھانپ لیتیں۔ کہ کون آگے چل کر کیا بنے گا۔ روبینہ اور میں مری کے جیزس اینڈ مری کونونٹ میں پڑھتے رہے۔ سکول ہمارے لیے گھر

مانند تھا، گھر سکول کے مانند۔ میں نے 1960ء میں، جب میں سات برس کی تھی، بورڈنگ سکول میں داخلہ لیا اور 1970ء میں تک جس سال میں نے اولیول کا امتحان دیا، وہیں رہی۔

سکول میں نو مہینے گزارنے کی وجہ سے ہم والدین کے پاس گرمیوں میں صرف پندرہ دن اور جاڑوں کی تعطیلات میں تین مہینے کے لیے رہ سکتے تھے۔ ان کی مصروف زندگی کے پیش نظر ہمیں ان سے ملنے کا موقع کم ہی ملتا۔ میں نے سکول میں ننوں کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کر لیا اور ازدواجی زندگی کے دوران مایوسی کے عالم میں اکثر رو رو کر انھیں یاد کرتی۔ مدر اینڈریو اور مدر برکمینز مجھے بہت یاد آتیں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ مدر کیمل کہلاتی ہیں۔

بہت برسوں بعد جب میں خود ماں بن چکی تھی، میں نے ایک بار پھر مری کونونٹ کا رخ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی بیٹیوں کو مدر برکمینز کے حوالے کر آؤں گی۔ وہ ان کا خیال رکھیں گی۔ بدقسمتی سے واقعات کچھ ایسے پیش آئے کہ مری کونونٹ میں ان کا قیام ادھورا رہا۔

سکول میں میری زیادہ تر سہیلیاں پٹھان لڑکیاں تھیں۔ نفسیاتی طور پر میں نے اپنے پٹھان پس منظر کو زیادہ پُرکشش پایا۔ کسی وجہ سے میری ان کی بہتر بنتی تھی اور میں محسوس کرتی تھی کہ میں بھی پٹھان اکثریت کا حصہ ہوں۔ پٹھانوں کو اپنی برتری کا کمپلیکس تھا۔ ان کے خاندان امیر تھے اور اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ صوبہ سرحد کے خان اور سردار ایک مدت سے اپنی لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے اس قدامت پسند اور سخت گیر ادارے میں بھیجتے رہے تھے۔ فیلڈمارشل ایوب خان کی پوتیاں، نواسیاں، بے نظیر بھٹو اور صنم بھٹو، پنجابی جاگیرداروں کی بیٹیاں، سب وہاں تھیں مگر غلبہ پٹھانوں کا تھا۔ جس کا غلبہ، اسی کے ہاتھ میں قیادت۔ یہ تو جانا پہچانا اصول ہے۔

میں بہت ہی نٹ کھٹ تھی اور ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہتی۔ میری تعلیمی زندگی کا حال یہ تھا کہ کبھی بلندیوں کو چھو لیتی، کبھی پستیوں میں پڑی نظر آتی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے سینیئر کیمبرج کے نتائج کو آنکتے ہوئے مدر اینڈریو نے ایک فقرہ کہا جو بہت برمحل تھا۔ انھوں نے کہا "تہمینہ درانی کی صلاحیتوں کا اندازہ ماہانہ ٹیسٹوں کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ہاں اوسط نام کی کوئی شے نہیں۔ اس کی بہت گھٹیا تھرڈ ڈویژن بھی آ سکتی ہے اور بہت اچھی فرسٹ ڈویژن بھی۔ اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی"۔ 1970ء میں صرف دو لڑکیوں کی فرسٹ ڈویژن آئی۔ ان میں سے ایک میں تھی۔

ہم سب بہت دیندار تھے۔ ابی کے کہنے پر ہم پانچوں وقت کی نماز پڑھتے۔ عام
اور میں ابھی چودہ پندرہ برس ہی کے ہوئے تھے کہ حج کر چکے تھے۔ ہم تھے تو سنی لیکن محرم کے دوران سنجیدہ رویہ اپنانے کا بہت خیال رکھتے۔ اس مہینے میں ہم نہ تو موسیقی سنتے نہ کوئی ریکارڈ بجاتے۔ ابی کو قوالیوں، مرثیوں اور نعتوں کا بڑا شوق تھا۔ ہمیں یہ سب اصناف سنوائی جاتیں اور رفتہ رفتہ اچھی بھی لگنے لگیں۔

مذہب نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا۔ اس کی بدولت مجھے کچھ دیر کے لیے ظلم و ستم سے نجات مل جاتی۔ میں زندگی کی ابتدا ہی میں مذہب کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ نماز کی صورت میں مجھے خدا کے حضور باریابی کا وسیلہ ہاتھ آ گیا۔ یہ بہت ہی نجی قسم کا رشتہ تھا۔ مقدس بھی اور لازوال بھی۔ میں نے دیکھا کہ میں نے اللہ کو اپنا رازدار بنا لیا ہے۔ میں اپنے تمام مسائل اللہ کے سامنے رکھ دیتی اور التجا کرتی کہ ان سے چھٹکارا پانے کا کوئی راستہ سجھا دیا جائے۔ میں ابی کے استبدادی رویے کا گلہ کرتی، کہتی کہ اس ماحول میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے، زبان بات کرنے کو ترستی ہے، ذہن پر ابتری چھائی رہتی ہے۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ ابی نے مجھے زندگی کے ایک ایسے رخ سے روشناس کرایا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور یہ سب انھوں نے ایک جدید اور انگریزیت زدہ ماحول میں رہتے ہوئے کیا تھا۔ جب بھی میں برے حالات میں خدا سے رجوع کرتی ہوں تاکہ تقویت حاصل کر سکوں تو ابی کے حق میں احساس تشکر سے بھری دعا ضرور مانگتی ہوں۔

میرے والدین کے باہمی تعلقات سطحی طور پر مکمل ہم آہنگی کے آئینہ دار تھے۔ والد صاحب دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر خوش خوش، پوری طرح چونچال لوٹتے۔ ابی کی موجودگی میں وہ یکایک سنجیدہ ہو جاتے۔ ہر وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا جتن کرتے نظر آتے۔ ایسا لگتا کہ وہ روز گھر آ کر ابی کو سارے دن کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ ابی بڑے غور سے ان کی باتیں سنتیں اور اس دوران ان کا ذہن ایک ایک چیز نوٹ کرتا جاتا۔ کبھی کبھی والد صاحب جرأت سے کام لے کر کوئی لطیفہ سناتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ابی کو ہنسی آ جائے۔ ابی برف کی سل بنی رہتیں۔ والد صاحب کوشش کرنے سے کبھی باز نہ آئے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ انھوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ تو تو میں میں سے پہلو بچاتے، خواہ ایسا کرنے کے لیے انھیں اپنی انا کی قربانی کیوں نہ دینی پڑتی۔ ابی کی غیر موجودگی میں بھی وہ ہمیشہ انھیں گھر کے سب سے اہم فرد کی حیثیت سے یاد کرتے۔ بتدریج انھوں نے بھی اپنی رائے رکھنی چھوڑ دی۔ انھوں نے امر سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ یوں ہم اس واحد لطیف سے محروم ہو گئے

جو ہمیں میسر آ سکتا تھا۔ ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد امی کی خود سرانہ حکمرانی کو ختم کرنے کا آخری موقع بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔

اتوار کو دہشت کا راج ہوتا۔ امی نے فیصلہ کیا تھا کہ اتوار بچوں کے ساتھ گزرا جائے گا۔ فلمیں دیکھی جائیں گی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں گھر سے اڑانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ تو ایسا تھا کہ جیسے ہمیں خوش ہونے کی چابی دے دی گئی ہو کہ لو بھئی، تھوڑی دیر خوش ہو لو۔ کیا مجال جو کوئی غیر متوقع بات پیش آ سکے۔ ہر چیز کی پیش گوئی ممکن تھی، حتیٰ کہ یہ بھی بتایا جا سکتا تھا کہ جب پوپ کارن کے پیکٹ بانٹے جائیں گے تو پہلے کے ملیں گے اور بعد میں کسے۔ ہم چپ چاپ گھومتے پھرتے، چپ چاپ کھاتے پیتے۔

ہم سکردو بھی گئے اور یہ ایک ایسا سفر یا سیر ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتی۔ امی نے فیصلہ کیا کہ جب پی آئی اے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو کیوں نہ ہم سب ایک دن کی سیر پر کے ٹو کی چوٹی دیکھنے چلیں۔ ہم ٹھنڈے کپڑے پہن کر کراچی سے براستہ لاہور راولپنڈی پہنچے۔ لاہور کے وی آئی پی لاؤنج میں سارے ننھیال والے ہمارے منتظر تھے۔ اس کے بعد ہم اچانک بڑے بڑے کوٹ، مفلر، سکارف اور سویٹر پہن کر سکردو روانہ ہوئے۔ ہم سکردو اترے، جلد جلد ارد گرد نظر ڈالی اور پھر براستہ پنڈی واپس چل دیے۔ لاہور میں رہنے والے رشتے داروں سے ایک بار اور ملے اور کراچی پہنچ گئے۔ یہ تھا امی کے ذہن میں سیر و تفریح کا تصور جیسے جیٹ طیارے میں سفر سے پیدا ہونے والی تھکاوٹ اور موسمی حالت میں اتنا بڑا فرق کوئی معنی ہی نہ رکھتا ہو۔

ہمارے گھر میں کسی کی پٹائی نہیں ہوتی تھی۔ امی نے اپنے خیالات ہمارے ذہنوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دیے تھے۔ اس کے بعد انہیں راج کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ وہ حکم دیتیں، ہم حکم بجا لاتے۔ کبھی کبھار کوئی غلط کام کر بیٹھنے پر ہمیں لیکچر پلایا جاتا۔ لیکچر کے تدارک سے ہم اس طرح بدکتے جیسے لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں۔ لیکچر سننے کے بعد ہمیں جواب میں کچھ کہنے یا کوئی رد عمل ظاہر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں کوشش کرتی رہتی۔ جل تھل کر کے بیچ میں ایک آدھ جملہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے کہہ دیتی۔ اس جسارت سے صورتحال مزید بگڑ جاتی۔ دلائل پیش کرنے کا خسروانہ حق تو کلی طور پر امی کو حاصل تھا۔

کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ ہم سب امی کے ننھے ننھے جاسوس بن گئے۔ کسی کو رازدار بنانا مشکل ہو گیا۔ امی اتحادوں کو بنانے بگاڑنے میں ماہر تھیں۔ ہمیں اکثر طلب کر کے مطلع کیا جاتا کہ ہمارا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ "میں ہر چیز کا پتہ لگا سکتی ہوں۔ تم نے

میری دوسری بیٹی کے ساتھ جو راز کی باتیں کی تھیں وہ مجھ تک پہنچ چکی ہیں"۔
گھر مکمل طور پر پولیس ریاست بن کر رہ گیا جہاں ہر فرد مخبر تھا۔ امی کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اب ہمیں سازش بھی خاموش رہ کر تیار کرنی پڑتی۔ امی ہرگز نہ چاہتی تھیں کہ ہمارے مابین اتحاد قائم ہو۔ اتحاد نراج اور بغاوت کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جا سکے تو کوئی چیز کنٹرول سے باہر نہ ہو۔ یہ میکیاولی کے انداز کی سٹریٹجی تھی، اگرچہ امی نے میکیاولی کی تصنیف "شہریار" کبھی دیکھی بھی نہ تھی۔

روبینہ 1969ء میں اولیول کا امتحان دینے کے لیے پڑھ رہی تھی کہ اس کے والد مری آئے۔ اس سے پہلے وہ کبھی روبینہ سے ملنے نہ آئے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ روبینہ کے والد اور ہیں، میرے اور۔ والد صاحب نے ہمارے درمیان کبھی کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا تھا۔ روبینہ اپنے والد کے ساتھ چلی گئی اور گرمیوں کی چھٹیاں ان کے ساتھ گزاریں۔ اس اچانک صلح صفائی پر امی بڑی سٹپٹائیں اور روتی دھوتی رہیں۔ ٹائنک کے ہیبت خاں نے اپنی بیٹی روبینہ کا بیاہ کر دیا۔ امی کو خبر تک نہ کی۔ اس کا شوہر، کیپٹن کمال الکریمی پی آئی اے میں پائلٹ تھا۔ روبینہ نے اس لیے شادی کر لی کہ وہ ہمارے گھر کی جابرانہ فضا سے تنگ آ چکی تھی۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اولیول کا امتحان دینے سے ڈرتی تھی۔ روبینہ اور کمال کی شادی کامیاب رہی۔

منو نے اپنی خوبروئی کے خلاف شدید رد عمل ظاہر کیا۔ اسے اپنے خوبصورت چہرے کے حوالے سے پہچانے جانے سے چڑ ہو گئی۔ اسے ہمیشہ یہ فکر رہتی کہ زرینہ کو ذرا سی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دکھنی لڑکی بن کر رہے گی۔ اس نے ڈٹ کر کھانا شروع کر دیا جس سے اس کا وزن بڑھ گیا۔ ہر طرح کے میک اپ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے ملبوسات لے دے کر چند پھٹی پرانی، پیوند زدہ جینز اور کھدر کی شلوار قمیض کے دو جوڑوں پر مشتمل تھے۔ فوٹوگرافی کے فن پر اس کی گہری نظر تھی اور اس نے ٹھان رکھی تھی کہ یہی شوق بالآخر اس کا پیشہ بنے گا۔ والدین نے اسے آئل آف وائٹ میں واقع سکول میں داخلہ لینے کی اجازت نہ دی کیونکہ وہاں مخلوط تعلیم تھی۔ آخر ہوا یہ کہ اس نے فوٹوگرافی کے ایک بڑے زیرک طالب علم سے، جو نیم فرانسیسی اور نیم انگریز تھا، شادی کر لی۔ یوں وہ اپنے سکول ہی کو گھر اٹھا لائی۔ اس کے شوہر، فلپ جولشہ نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام علی حبیب رکھا۔

میرے بھائی عاصم نے کم عمری میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ والد کا دست نگر نہیں

رہے گا۔ وہ جینیوا چلا گیا اور جلد ہی ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا جو بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں۔ اس نے بڑی خاموشی سے سعودی عرب کے شاہ سعود کی ایک پوتی سے شادی کر لی۔ عاصم نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس بات کو بھلا کر ہی دم لے گا کہ اس کی رگوں میں پنجابی خون بھی ہے اور بات بے بات اپنی پٹھانیت جتانی شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ وہ افغان گذریا ہے اور بڑے فخر سے دوستوں کو اپنے اسلاف کے اوئی پس منظر کی کہانیاں سناتا رہا۔ بھٹو صاحب نے والد صاحب کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس پر عاصم کو شدید رنج ہوا۔ 1972ء کے بعد اس نے کبھی پاکستان آنا پسند ہی نہیں کیا۔

زرمینہ نے روایتی انداز میں شادی کی۔ نواب صادق حسین قریشی کا بیٹا، ریاض، امی کا بھانجا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی دلہن سے پہلی بار ملنے آیا۔ زرمینہ نے تو عام لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے برعکس، عدیلہ، جو چودہ برس کی تھی، امی کی ساڑھی زیب تن کر کے پوری کوشش کرتی رہی کہ جو رشتہ زرمینہ کے لیے آیا ہے کسی طرح اسے خود اچک لے۔ ریاض کا دوست، جو اخلاقی سہارا دینے کے لیے ساتھ آیا تھا، پوری شام بیٹھا زرمینہ سے باتیں کرتا رہا تاکہ ریاض کو اپنی ہونے والی دلہن سے بات چیت کا موقع مل سکے۔ ریاض نے بعد میں اپنے دوست سے شکوہ کیا۔ وہ پریشان تھا کہ زرمینہ کا سارا وقت تو دوست نے لے لیا اور اسے بات کرنے کا موقع تک نہ مل سکا۔ بہرحال، عدیلہ کا یہ وار خالی گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد زرمینہ اور ریاض کی انگلینڈ میں شادی ہو گئی۔

عدیلہ امی کی لاڈلی تھی۔ وہ اسے ساتھ چمٹائے رکھتیں اور اس کی ہر بے تکی خواہش کو مان لیتیں۔ وہ جب بھی طیش میں آ کر اودھم مچاتی تو اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے جاتے، اس کی ہر خوشی پوری کی جاتی۔ وہ جو جی چاہے کرتی پھرتی، کوئی اسے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ایک ہم تھے کہ آہ کرنے پر بھی بدنام ہو جاتے تھے۔ عدیلہ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کی صفائی پیش کرتے ہوئے امی کہتیں کہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کو ان سے بہت پیار ہے۔ وہ ہمیشہ امی سے چمٹی رہتی۔ ہماری تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم امی سے ہم آغوش ہوں تو کیسے۔ ان کی طرف سے ہمیں پرے پرے رہنے کے بین اشارے جو ملتے رہتے تھے۔

یاد آتا ہے کہ مجھ سے کہا گیا کہ عدیلہ کو ایک ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں۔ وہ بمشکل چھ برس کی تھی۔ امی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس پر جو خفگی کے دورے پڑتے رہتے ہیں ان کی وجہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے صرف ایک عدد پینٹ بکس اور رنگ کرنے کی کتاب درکار ہے۔ اسے کسی نہ کسی شغل میں لگائے رکھنا ضروری تھا۔ وہ لاڈ پیار سے بگڑ گئی تھی اور چاہتی تھی کہ توجہ کا مرکز بنی رہے۔ وہ فیل مچا کر امی

کو بلیک میل کرتی۔ وہ صرف ملازموں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی کیونکہ ان پر حکم چلا سکتی تھی۔

پھر عدیلہ کے ایک اور پہلو کا انکشاف ہوا۔ اس نے چند چوزے پال رکھے تھے۔ چند روز تو وہ ان سے کھیلتی رہی اور پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ اب وہ اپنی دل فریبی بالکل کھو چکے ہیں۔ اس نے ان ننھے چوزوں کو لے جا کر زندہ دفنا دیا۔ وہ ان کی اجتماعی قبر کے پاس کھڑی ہو کر خوفزدہ چوزوں پر کھرپے سے مٹی ڈالتی رہی۔ چوزے ادھر ادھر پھڑپھڑاتے پھرتے رہے یہاں تک کہ ان کے لیے ہلنا جلنا بھی مشکل ہو گیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ جھرجھری لی اور دم گھٹنے سے مر گئے۔ عدیلہ کھڑی مسکراتی رہی۔ سب نے اسے محض شرارت سمجھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس سے عجیب بھیانک حرکت سرزد ہوئی ہے۔ بدیہی طور پر یہی نظر آتا ہے جیسے اس میں اور مصطفےٰ میں بہت سی باتیں مشترک ہوں۔

امی کا خاندان ان سے اس طرح سفلیانہ پیش آتا جیسے وہ کسی شاہی خاندان کی فرد ہوں۔ اگر وہ لاہور میں ہوائی اڈے پر تھوڑے دیر کے لیے بھی رکتیں تو پوری ننھیال اڈے پر حاضر ہو جاتی۔ ننھیال والوں کو وہاں ہونا ہی چاہیے تھا۔ امی توقع رکھتی تھیں کہ وہ بڑی تعداد میں حاضر ہوں گے۔ اس کے برعکس، اگر ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی، اور ان میں ہماری تائی بھی شامل تھیں، کراچی آتا تو صرف بچے ہی اسے لینے ہوائی اڈے جاتے۔

ہماری جدید وضع کی طرزِ زندگی کے باوجود ہمیں مشرقی انداز اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ امی کو بالکل اچھا نہ لگتا تھا کہ وہ خود یا ہم میں سے کوئی مغربی وضع قطع کا نظر آئے۔ وہ آپ بھی اپنے بال گوندھتیں، سوتی ساڑھیاں یا شلوار قمیض پہنتیں اور شفون کے بڑے سے دوپٹے سے سینے کو ڈھکے رکھتیں۔ اپنے انتہائی نفیس اور بیش قیمت جواہرات میں سے ایسے نگ چنتیں جنہیں دیکھ کر لوگ تعریف کے پل باندھے اور اپنی اپنی رائے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکتے۔ جواہرات اور قیمتی پتھروں کے بارے میں انہیں خاصی معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے کسی جوہری کی نظر پائی تھی۔ پتھر میں خفیف ترین نقص کا پتا چلا لیتا، پتھر کی آب و تاب کی گہرائی کا اندازہ لگاتا اور یہ فیصلہ کرنا کہ تراشنے کے بعد پتھر شفاف اور آب دار نکلے گا یا غیر شفاف، ان کے لیے معمولی بات تھی۔ یہ ایسا علم تھا جس پر وہ مکمل عبور حاصل کر چکی تھیں۔ عبور حاصل کیوں نہ ہوتا کہ اپنی سارتوں کو آزمانے کے لیے ان کے پاس جواہرات کا ایک شاندار ذخیرہ موجود تھا۔

کیا کرتا ہے، کیا نہیں کرتا، اس طرح کے احکام کی کبھی ختم نہ ہونے والی

فہرست ہمارے سامنے رہتی تھی۔ ہمیں لمبی آستینوں والے لباس پہننے اور بڑے دوپٹے اوڑھنے کی ہدایت کی جاتی اور یہ کہ اپنے لمبے بال گوندھنے ہیں، کوئی میک اپ استعمال نہیں کرنا، نیل پالش نہیں لگانی، نماز پڑھنی ہے، لڑکوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا، ایسی لڑکیوں سے دوستی نہیں کرنی جو زیادہ ماڈرن ہوں، اپنی بوڑھی انا کے بغیر کسی سہیلی کے گھر نہیں جانا، ٹیلی فون کبھی خود نہیں اٹھانا، ایسی لڑکیوں کو سہیلیاں نہیں بنانا جن کے بھائی ہمارے ہم عمر ہوں یا عمر میں ہم سے بڑے ہوں۔ ہمیں تن تنہا ڈرائیور کے ساتھ کہیں جانے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ باورچی خانے میں ملازموں کے اردگرد منڈلانے کی بھی ممانعت تھی۔

والد صاحب سے ہمارے جو بھی تعلقات استوار ہوئے ان کی بنیاد دوری اور کم آمیزی پر رکھی گئی۔ شفقت تو موجود تھی لیکن بیچ میں فاصلہ بہت تھا۔ امی ہمیں، خصوصاً مجھے، والد صاحب سے دُور رکھتیں۔ وہ خود بھی ہم سے، خصوصاً مجھ سے، دُور دُور رہتے کیونکہ امی کو ان کا مجھ سے قریب ہونا ناپسند تھا۔ شاید اس بنا پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مسائل لے کر میرے پاس آ جائیں اور میں اس لیے ان کی مدد کرنے لگوں کہ مجھے ان سے ہمدردی تھی اور امی کی پروا نہ تھی۔

ہم ہمیشہ سے یہ سوچتے آئے تھے کہ ایک نہ ایک دن والد صاحب کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان جیسا زورآور پٹھان ہر وقت کے ان طعنوں تشنوں کو ہمیشہ تو برداشت نہیں کر سکے گا۔ بعض دفعہ رات کے وقت میں انھیں بند دروازے کے پیچھے بحث کرتے سن لیتی۔ امی کا لہجہ ہمیشہ جارحانہ اور والد صاحب کا معذرت خواہانہ ہوتا۔ ایک بار میں اپنے تمام حوصلے کو بروئے کار لا کر ان کی خواب گاہ میں جا دھمکی۔ میں امی کے عتاب کا نشانہ بننے کو تیار تھی۔ میں والد صاحب کو بچانا اور سہارا دینا چاہتی تھی۔ امی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میری دخل اندازی پر وہ آگ بگولا ہو گئیں۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ چلی جاؤ اور ہماری باتوں میں مخل نہ ہو۔ اس رات میں نے اللہ سے دعا کی کہ والد صاحب کو امی کی بدمزاجی سے محفوظ رکھنا۔

والد صاحب کے دفتر کے عملے سے امی اس طرح پیش آتیں جیسے وہ سب ان کے نوکر چاکر ہوں۔ وہ ہر وقت انھیں فون کرتی رہتیں۔ اگر فریج کام نہ کر رہا ہو یا ایئر کنڈیشنر میں بول گیا ہو تو ان آلات کی مرمت اور درستی دفتر کے افسران کے ذمے داری تھی۔

گھر سے باہر تو کام کا دباؤ تھا ہی، گھر میں بھی دباؤ کچھ کم نہ تھا اور میں سمجھتی تھی کہ اتنا زیادہ دباؤ والد صاحب برداشت نہ کر پائیں گے لیکن وہ سب کچھ سہار گئے۔ امی انھیں کبھی رات کو ڈنر پر زیادہ دیر باہر نہ رہنے دیتیں۔ شراب کو ہاتھ لگانے کی اجازت

نہ تھی۔ گھر پر بھی نہ پی سکتے تھے۔ ان پر بھی اتنی ہی زیادہ قدغنیں تھیں جتنی ہم پر تھیں۔ زندگی ان کی تھی لیکن ہر بات کا تعین امی کرتی تھیں۔ ہمیں اپنے ددھیال والے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ والد صاحب کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے میں مزہ آتا۔ امی نے یہاں بھی روڑے اٹکائے۔ والد صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنے بھائیوں بہنوں کے ساتھ اکیلے نہیں رہ سکتے۔ ان کے بھائیوں بہنوں کو ان سے خاصی دور رکھا جاتا۔ وہ ہمارے گھر آتے تو بس کھڑے کھڑے اور بالکل رسمی انداز میں۔ امی کا نہ جانے کیوں خیال تھا کہ ان سے میل جول کا والد صاحب پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ امی کو ددھیال والے اور ان کی زندگی کے معیار گنوار اور غیر شستہ معلوم ہوتے۔

تمام مالی وسائل و مسائل پر امی کا کنٹرول تھا۔ وہی طے کرتی تھیں کہ والد صاحب کو شام کو کس سے ملنا ہے اور کن لوگوں سے میل جول بڑھانا ہے۔ والد صاحب خوش شکل اور خوش پوش تھے۔ ان کے لباس میں کوئی ذرہ برابر نقص نہ نکال سکتا۔ وہ سویل رو کے سلے سوٹ اور ٹرن بل اور ایسر کی قمیضیں اور ہاتھ سے بنے ہوئے انگریزی جوتے پہنتے۔ ان کا طرز حیات قدامت پسندانہ تھا۔ ناخن قرینے سے ترشے، ہاتھ صاف ستھرے۔ اپنا مفہوم بیان کرنے پر پوری طرح قادر۔ انگریزی بولتے وقت لفظوں کو تھوڑا کتر کتر کر ادا کرتے۔ لب و لہجہ بہت صاف تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے ان کا خاصا احترام کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا رعب داب بڑی قوی جارحانہ شخصیت کی غمازی کرتا تھا۔ امی اکثر ان سے کہتیں کہ وہ اتنی جارحانہ روش اختیار نہ کریں۔ اس طرح ان کے بدخواہوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

والد صاحب کے کام کو امی اپنا کام سمجھتیں۔ ہر بات میں اس طرح دخل دیتیں جیسے ایسا کرنے کا انھیں حق حاصل ہو۔ ان کے کام کے حوالے سے ٹیلی فون پر تبادلۂ خیال کرتیں اور بضد ہوتیں کہ ان کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ پی آئی اے میں جن دنوں ہڑتال ہوئی تو والد صاحب کی طرح امی بھی معاملات کو سلجھانے میں پوری طرح منہمک رہیں۔ بحرانی حالت میں امی کے جوہر کھلتے تھے۔ ان کی اپنی زندگی بحرانِ مسلسل جو ٹھہری۔ جب کبھی والد صاحب کو پیشہ ورانہ سطح پر کسی بحران سے واسطہ پڑتا تو باگ ڈور امی سنبھال لیتیں۔ عام حالات میں بھی وہ والد صاحب پر کچھ زیادہ اعتماد نہ کرتی تھیں لیکن بظاہر بحران کے وقت اس اعتماد میں مزید کمی آ جاتی۔ پی آئی اے کی ہڑتال اور راولپنڈی میں طیارے کا کریش دو ایسی ہی مثالیں ہیں۔ میں دیکھتی کہ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے یہ دعا مانگتی رہتیں کہ ذہنی سکون نصیب ہو۔

یحییٰ کی حکومت کے دور میں والد صاحب نے اپنے فوجی پس منظر کی وجہ سے، اپنے تمام پرانے دوستوں سے رابطہ قائم کر لیا۔ وہ خود سرکاری افسر تھے اور ان کے پرانے یار دوست، مارشل لا کی بدولت، حکومت چلا رہے تھے۔ والد صاحب زیادہ وقت اسلام آباد میں یا میٹنگوں میں گزارنے لگے۔ امی نے ان کے دوستوں کی ضیافتوں میں شاید ہی کبھی شرکت کی ہو۔ انھیں ان لوگوں کی بلانوشی اور عورت بازی کی شہرت سے گھن آتی تھی۔ انھوں نے والد صاحب کو ان دوستوں سے دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ یحییٰ خاں سے امی کی ملاقات صرف چند بار ہوئی اور وہ بھی یا تو سرکاری ضیافتوں پر یا یحییٰ خاں کے بیٹے کی شادی کے استقبالیے کے موقع پر، جو ہمارے ہی گھر پر، یعنی پی آئی اے ہاؤس میں دیا گیا تھا۔ اردگرد جو خواتین نظر آتی تھیں امی ان سے بدرجہا حسین تھیں، مگر ان لوگوں کا تعلق امی کی سماجی کلاس سے نہ تھا۔

ہمارے والدین کی جھک جھک ہمارے نوٹس میں زیادہ آنے لگی۔ پی آئی اے کے آخری سال کے دوران اور پھر اس مختصر عرصے میں، جب وہ سٹیٹ بینک کے گورنر رہے، ایسا لگا جیسے ان پر امی کے کنٹرول اور بالادستی میں کمی آ چلی ہو۔ وہ امی کے دلائل کا ڈٹ کر جواب دینے لگے۔ وہ اپنے خیالات اور آرا کا زیادہ شدومد سے اظہار کرتے، خصوصاً جب ان باتوں کا تعلق ان کے اپنے کام سے، حکومت سے یا جنرلوں سے ان کے یارانے سے ہوتا۔ امی پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ ان کے اوسان خطا ہونے لگے۔ انھیں ہم سے پہلے سے بھی زیادہ نفرت ہو گئی اور جو غصہ والد صاحب پر آتا تھا وہ بھی ہم پر اترا جانے لگا۔ انھیں والد صاحب کی چھوٹی سی آزادی بری لگی۔ امی کے خیال میں آیا کہ ان کے فوجی دوست انھیں تقویت دے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا رہے ہیں۔ یہی دوست انھیں لبنیٰ بیگم سے لڑا رہے ہیں۔ میرے خیال میں والد صاحب کے حق میں یہ بہت ہی اچھا ہوا تھا۔

اپنے گھر میں، گو وہ امر بنی ہوئی تھیں، ہمارے روبرو والد صاحب کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا جیسے تمام اصول وہ بناتے ہیں اور ایسے پٹھان ہیں جنھیں کسی صورت میں غصہ نہیں دلانا چاہیے۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ والد صاحب ہم سے جو تحمل انداز میں پیش آتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امی ہماری حفاظت کے خیال سے ہمیں ان سے دور رکھتی ہیں۔ چند ایک بار جب امی نے ہم میں سے کسی کی شکایت ان سے کی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ ان کی خفگی بناوٹی تھی۔ وہ محض امی کو خوش کرنا چاہتے تھے۔

باہر کی دنیا کے سامنے وہ ایک مستحکم شادی کی تصویر پیش کرتی رہیں۔ ہم ایسا

خاندان تھے جس میں کوئی عیب نہ تھا، جو شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔

ایک بار میرے سامنے والد صاحب کے ذاتی ملازم، امیر خان، نے انھیں وہسکی لا کر دیا۔ انھوں نے بوتل خالی کر کے ایک اور طلب کی۔ مجھے پتہ چلا کہ بوتل میں اصل تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ پی آئی اے کے سربراہ کو خود اپنے گھر میں شراب چھپا کر رکھنی پڑتی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھ پر بھروسا کریں۔ میں "امی" کو نہیں بتاؤں گی۔ اس وقت وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئے۔ مجھے امی سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔

وہ قید سے چھوٹ کر آئے تو امی نے پھر ان کی جان کھانی شروع کر دی۔ تاثر یہ ملتا تھا جیسے والد صاحب کی وجہ سے امی کی سبکی ہوئی ہے۔ اب اس میں والد صاحب کا کیا قصور اگر بھٹو صاحب کی شخصیت ان کی شخصیت سے ٹکرا گئی تھی۔ ان کی راتیں اس طرح بسر ہوتیں کہ امی والد صاحب کو لعنت ملامت کرتی رہتیں، قصوروار ٹھہراتیں---- اور یہ عقوبت جیل کی سزا سے بھی بدتر تھی۔ بات کوئی ہوتی، قصور ان کا نکل آتا۔ انھوں نے امی کی گھیر بھری اور اقتدار سے عبارت زندگی میں کھنڈت ڈال دی تھی۔

یحییٰ خاں کی معزولی کے بعد جب والد صاحب جیل میں تھے، اخباروں میں سابق صدر کی نجی زندگی کے بارے میں سنسنی خیز کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں۔ بتایا گیا کہ وہ عورتوں کا رسیا تھا اور نشے میں دھت رہتا تھا۔ والد صاحب یحییٰ کے قریبی ساتھی تھے۔ چنانچہ انھیں بھی عیش و نشاط کی محفلوں میں حصہ لیتے دکھایا گیا۔ امی بھی لپیٹ میں آ گئیں۔ وہ چند بار اپنے شوہر کے ساتھ ضیافتوں میں یا رات کے کھانوں پر دیکھی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی سکینڈل گھڑ لیے گئے۔ صدر یحییٰ کا نواب جوناگڑھ کے پاس آنا جانا تھا جس کا مکان سٹیٹ بینک ہاؤس سے تھوڑا سا آگے تھا۔ اخباروں میں آیا کہ یحییٰ خاں کو سٹیٹ بینک ہاؤس کے قرب و جوار میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اشارتاً کیا سمجھایا جا رہا ہے۔ میرے والدین نے فیصلہ کیا کہ وہ ان الزامات کی تردید میں کچھ نہ کہیں گے۔ تردید جاری کرنے سے معاملہ بد سے بدتر ہو جاتا۔ چنانچہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے ان باتوں کا الزام بھٹو صاحب پر دھرا۔ امی نے اس سلسلے میں ہم سے یا کسی اور سے کبھی کوئی بات نہ کی۔ یہاں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ والد صاحب سے امی کی وفاداری اور لگاؤ کلی طور پر شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ حقیقت میں ان پر بس یہی دھن سوار رہتی تھی کہ وہ بیگم درانی کی حیثیت سے پہچانی جائیں اور اپنے شوہر کی امیج کو بنا سنوار کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ امیج ہی امی کی آبرو کی ضامن تھی۔ والد صاحب کی توقیر، ان کے اصول، ان کی کامیابی-----

سب امی کی نظر میں محترم تھے۔

مجھ سے کبیدہ رہنے کا انداز اپنانے کے باوجود امی ہر وقت میرے لیے بڑے بڑے منصوبے گھڑتی رہتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میری ذات میں انھیں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ ہماری شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔ امتا انھیں بھی پتہ تھا کہ اپنے تحکم کے باوجود وہ مجھے ذہنی طور پر اپنا حلقہ بگوش بنانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ بہرحال یہ بات سمجھنے اور اسکے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں مجھے سینتیس سال لگے ہیں۔۔۔ یعنی ان کے تصرف کے اثرات کے رفع دفع ہونے کے لیے سینتیس سال درکار ہوئے۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی نحس ستارہ ایک جگہ آ کر رک گیا ہو اور ہر طرف نحوست کا سایہ ڈھل رہا ہو۔ اب اس ستارے نے میرے برج سے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرا زبردست دباؤ جو ہم سب کو سہنا پڑا وہ یہ تھا کہ ہمیں کس قسم کی شادی کرنی ہو گی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے لیے مثالی مرد وہ ہو گا جو بہت تعلیم یافتہ ہو۔ آکسفورڈ یا کیمبرج کا پڑھا ہو تو بہتر، اور اس کا تعلق کسی اچھے، عالی مرتبت خاندان سے ہو یعنی ایسے خاندان سے جسے سماجی طور پر پذیرائی حاصل ہو۔ ہمارے والدین کو یہ اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس ہونا چاہیے کہ فلاں خاندان کے فلاں لڑکے سے نسبت ٹھہرائی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شادیاں ہم نے کرنی تھیں ان کا ہم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جن مردوں سے ہم بیاہی جائیں گی وہ ایسے ہونے چاہئیں کہ ان سے سماج میں ہمارے والدین کا رتبہ مزید بلند ہو سکے۔ اگر شادی کے بعد ہم خوش اور زندگی میں کامیاب رہے تو ہماری بدولت والدین کی سماجی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ ہم محض موضوع گفتگو تھے۔ ان کی زندگی کی توسیع تھے۔

مرد کسی اور سیارے کی مخلوق تھے۔ ہمیں تربیت دی گئی تھی کہ ایک اصول یاد رکھیں۔ مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے بھروسے کے لائق ایک ہی مرد ہو سکتا ہے۔ وہی جسے ہمارا شوہر بننا ہو۔ ہمیں سکھایا گیا کہ شادی ایک مقدس ادارہ ہے اور ہم ساتھ رہنے کا جو عہد باندھیں گے اسے کسی بھی صورت میں توڑنا نہیں ہے۔ اگر ہمارا مرد بعد میں بہائم صفت ثابت ہو تو بھی ہمارا فرض ہے کہ اس سے نباہے جائیں اور اس کے کردار کو بدلنے کی کوشش کریں۔ شادی کی ناکامی سے ہم عورتوں کی کمزوری آئینہ ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

میں سولہ سال کی ہو چکی تھی اور پہلی مرتبہ مجھے اس نظر سے دیکھا گیا کہ اگر اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جائیں تو کیسا رہے۔ شادیاں اور سماجی تقریبات عموماً بڑی پرتکلف شادی منڈیوں سے مشابہ ہوتی ہیں جہاں عورتیں اپنی بیٹیوں کے مستقبل کا سودا

کرنے آتی ہیں۔ اہل بن بیاہیوں کو وہ لڑکیاں دکھائی جاتی ہیں جن سے ان کا رشتہ طے ہو سکتا ہے۔ کھلم کھلا ملنے جلنے کے مواقع کم تھے۔ ہر چیز پر اخفا کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ ہم آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔

میں ایک شادی میں شریک ہونے لاہور گئی تھی۔ وہاں میری انیس خاں سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ میں اس طرح کی خاطرداری کی عادی نہ تھی۔ شادی میں موجود بہت سے لوگ یہ بتانے کے لیے خاص طور پر میرے پاس آئے کہ میں امی سے مشابہ ہوں۔ انھوں نے میرا نام "چھوٹی شہینہ" رکھ دیا کہ وہ اپنی دانست میں کسی نوجوان لڑکی کو اس سے بڑا خراج تحسین پیش نہ کر سکتے تھے۔ جہاں بیٹوں والی بہت سی مائیں مجھ پر نظر ڈال رہی تھیں۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرا جائزہ لے رہی ہیں، انھیں مجھ سے دلچسپی ہے۔ انیس کی امی بھی وہاں موجود تھیں اور وہ مجھ پر لٹوٹ ہو گئیں۔ انیس میرے پاس آیا اور باتیں کرنے لگا۔ یہ بہت ہی مختصر اور مبہم سی ملاقات تھی۔ میرے لیے نہ یہ ملاقات کوئی خاص معنی رکھتی تھی نہ انیس۔ گفتگو کی ابتدا انیس کی طرف سے ہوئی۔ "ہیلو آپ ابھی پڑھ رہی ہیں؟" "ہاں"۔ "کہاں پر؟" "مری میں۔ کونونٹ میں"۔ "اوہ۔ آپ کس کلاس میں ہیں؟" "میں سینیئر کیمبرج کر رہی ہوں"۔ بالکل سیدھی سیدھی باتیں، بالکل رسمی باتیں۔

اس ملاقات کے بعد میں جلد ہی مری لوٹ گئی۔ ایک اتوار میری کلاس کی لڑکیوں کو مال پر سیر کرنے کی اجازت ملی۔ وہاں دیکھتی کیا ہوں کہ انیس موجود ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کدھر دیکھوں کدھر نہ دیکھوں۔ ہم ان نوجوانوں سے بالالتزام دور رہتے جو لڑکیوں اور عورتوں پر ڈورے ڈالنے کے لیے مال کے چکر لگایا کرتے تھے۔ مال پر گھومنے والے ان تمام دل پھینک پروانوں کو ہم پہچانتے تھے اور وہ، ہماری خاطر، جس طرح مرغ زریں بنے اکڑتے تنتے پھرا کرتے تھے اس پر ہماری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ یہ شخص مختلف تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بات کرنے لگا۔ میری تو شرمندگی اور گھبراہٹ کے مارے جان ہی نکل گئی۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ سہیلیوں میں سرگوشیاں جاری ہیں اور دبے دبے قہقہے لگ رہے ہیں۔

انیس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس کی امی نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ میری رائے معلوم ہی نہیں کی گئی تھی۔ امی نے اس بہانے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ میں ابھی چھوٹی ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ کم عمری کی بات سے محض ٹالنا مقصود تھا۔ انیس امی کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس کا کسی امیر گھرانے سے تعلق نہ تھا نہ اس نے آکسفورڈ یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ

رہائی کے موقع پر

ایشیاٹک ایڈورٹائیزنگ کمپنی میں ایک ایگزیکٹیو تھا۔ اس ملازمت میں کوئی گیر تو تھا نہیں۔ کل ملا کر آٹھ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

انیس نے مجھے اور میری سہیلیوں کو دعوت دی کہ چل کر اس کے ساتھ مری کے مشہور ریستوراں "سامز" میں چائے پئیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی بات تھی۔ بورڈنگ سکول میں دیکھے جانے والے خوابوں میں کیک پیسٹریوں کے سوا رکھا ہی کیا ہوتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہ نوجوان تو بہت بانکا اور سخی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے ووٹ اس کے حق میں پڑے کہ یہ فیصلہ ہم نے دماغ سے نہیں پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا۔ ہم سامز پہنچے۔ وہاں ہم رومان لڑانے نہیں گئے تھے۔ کیک پیسٹریاں اڑانی مقصود تھیں۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے خیال میں مجھے انیس سے صرف اس لیے محبت ہو گئی کہ وہ مجھے کھلا پلا رہا تھا۔ میرے ناز اٹھائے جا رہے تھے۔ ہم نے اس کے پلے سے کھایا پیا اور پھر خوفزدہ ہو کر کلاک کی طرف دیکھتے ہی ناروا عجلت کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ انیس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہی۔ اسے اگلے دن کراچی جانا تھا۔ وہ نہیں گیا۔

اگلے روز میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ انیس ہمارے سکول کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ وہ کسی مدعا کے تحت وہاں منڈلا رہا تھا۔ اس کا مدعا میں تھی۔ سکول کے ضابطے بہت سخت تھے۔ ہمیں اجنبیوں سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انیس وہاں کھڑا ہوا ان باؤلے عاشقوں سے خاصا مشابہ نظر آیا جن کا ذکر ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ فرق تھا تو یہ کہ اس کی وضع قطع ماڈرن تھی۔

انیس کو بڑی ترکیبیں آتی تھیں۔ اس نے اپنی جاننے والی ایک ڈے سکالر کو مجھ تک اپنی چٹھی پہنچانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ پہلا عاشقانہ خط تھا جو میرے نام آیا۔ اس میں شعرو شاعری یا آرزومندی کی بھرمار نہ تھی۔ بالکل سیدھی سیدھی بات کی گئی تھی۔ "میں لاہور اپنی ملازمت پر واپس نہیں جا رہا کیونکہ میں تمہارے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میں مری میں ٹھہرا رہوں گا۔ یہاں کم از کم مجھے تمہاری جھلک تو نظر آ سکتی ہے۔" اس نے میرے اور میری سہیلیوں کے لیے کیک اور پیسٹریاں بھجوائیں۔ میں اپنی اہمیت کے احساس سے مست ہو گئی۔ وہ میری طرف متوجہ ہونے والا پہلا مرد تھا۔ مجھے مزے مزے کی چیزیں کھانے کا شوق بھی تھا اور میں محبت کی بھوکی بھی تھی۔ انیس کی وجہ سے میری دونوں آرزوئیں بر آئیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔

امی ہم سب سے وعدہ لے چکی تھیں کہ انہیں بتا دیں گے کہ ہم کن سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی طرف سے انھوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں فوراً ہماری پسند

اپنی بیٹیوں وفا، نصیبہ اور ثنا کے ساتھ
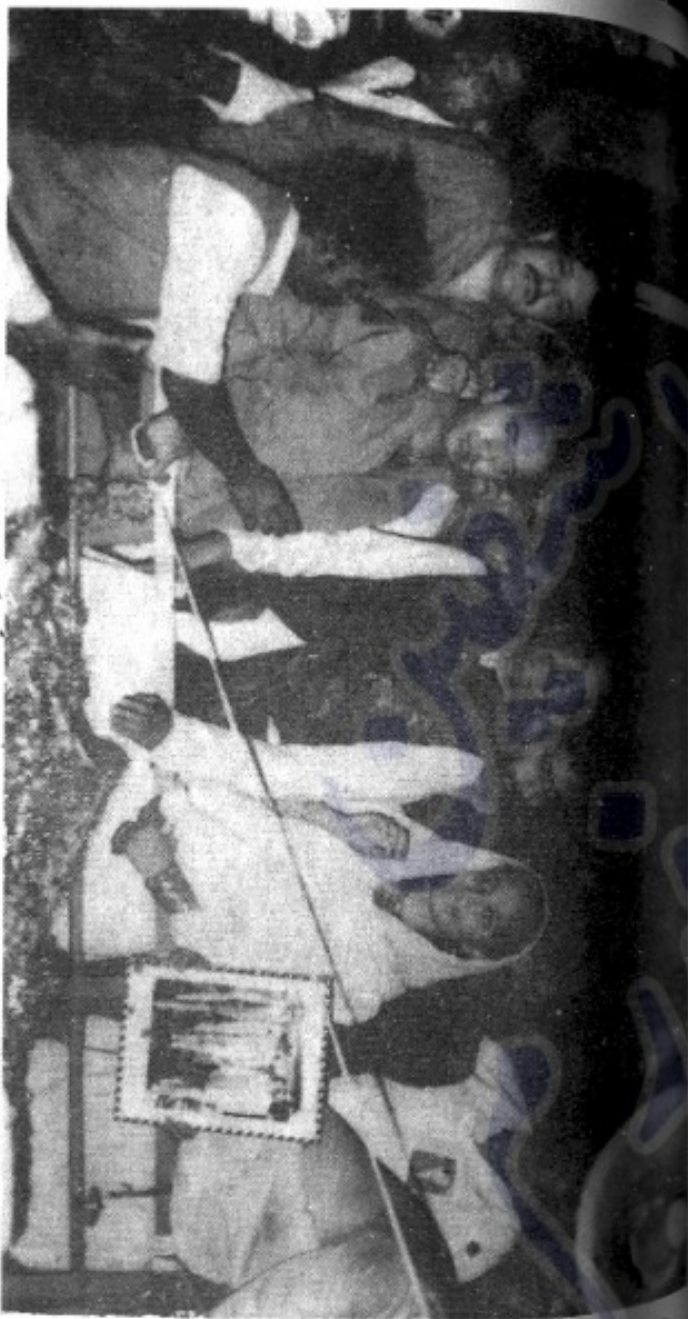
مصطفٰے کھر کی رہائی کے بعد راولپنڈی میں

کے مرد سے بیاہ دیں گی۔ میں سمجھی کہ وہ سچ بول رہی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ انھیں اس نوجوان کے بارے میں بتا دوں گی جس نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میں جب گرمیوں کی تعطیلات گزارنے گھر روانہ ہوئی تو انیس سے شادی کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ انیس اور میں ایک ہی طیارے پر سفر کر رہے تھے۔ ہمارے لیے ساتھ بیٹھنا یا باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اتنا بتا دیا کہ میں اس سلسلے میں امی سے بات کروں گی۔۔۔۔ جلد۔ ہوائی اڈے پر اتر کر میں نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ کنویئر بیلٹ نے میرا سوٹ کیس مجھ تک پہنچا دیا۔ اس میں انیس کے لکھے ہوئے پندرہ خط تھے۔ وہ روز مجھے خط لکھتا تھا۔

کراچی پہنچ کر مجھے امی سے زبانی بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ ان کو خط لکھ دیتی ہوں۔ خط لکھ کر میں نے ان کے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دعائیں مانگنے لگی۔ کوئی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ طوفان آنے والا ہے۔

امی بری طرح بپھری میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ غصے سے نیلی پیلی ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ انھیں ہر بات بتائی جائے۔ وہ تمام بیہودہ تفصیلات جاننا چاہتی تھیں۔ لیکن کچھ ہوا ہوتا تو تفصیلات بتانے کی نوبت بھی آتی۔ میرے پاس صرف خطوط تھے۔ انھوں نے کہا کہ خط دکھائے جائیں۔ میں نے خط ان کے حوالے کر دیے۔ وہ بیٹھ کر خط پڑھنے لگیں۔ میں شرم سے لال، سر جھکائے بیٹھی رہی۔ "اس نوجوان نے سمجھداری کی صرف ایک ہی بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ تمھیں کسی اور مرد سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے اور کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے زیادہ مردوں سے ملنا جلنا چاہیے"۔

امی کے خیال میں انیس لفنگا تھا۔ اسے ان کی بیٹی تک رسائی حاصل کرنے کی جرأت کیسے ہوئی، خصوصاً جب وہ رشتہ دینے سے انکار کر چکی تھیں۔ امی نے کہا کہ انیس سے میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مجھے دھمکی بھرے لہجے میں سنایا کہ وہ انیس اور اس کی ماں سے بات کریں گی۔ مجھے بڑی شرمندگی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ میرے خیال میں یہ ساری باتیں بالکل غیر ضروری تھیں۔ میں نے ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اپنی پسند ان پر واضح کر دی تھی۔ ہمارے درمیان معاہدے کی رو سے جو ذمہ داری امی پر عائد ہوتی تھی انھوں نے اسے پورا نہیں کیا تھا۔

میں سکول واپس چلی گئی۔ گھر میں جو ایک مہینہ گزارا اس کے دوران میری حالت بجنسہٖ کسی قیدی کی سی تھی۔ مجھے سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ ٹیلی فون کے قریب بھی نہ جاؤں اور کہیں باہر جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ مستزاد یہ کہ امی مجھ سے شاذ و نادر ہی بات کرتیں۔ ان کے رویے سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے میں ناپاک ہو چکی ہوں۔

چھٹیاں گزارنی دوبھر ہو گئیں۔

سکول لوٹ کر میں نے ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ میرا اولیول کا امتحان سر پر آ پہنچا تھا۔ میرے لیے تو بس وہی رومان باقی رہ گیا تھا جس کا ذکر میری انگریزی ادب کی درسی کتابوں میں ملتا تھا۔ انیس نے ہار نہ مانی۔ وہ اپنے رابطے کے ذریعے مجھے باقاعدگی سے خط لکھتا رہا۔ یہ خط مجھ تک پہنچتے رہے۔ امی مجھے سکول چھوڑنے خود مری آئی تھیں اور انھوں نے ننوں سے بات کی تھی۔ میری تمام ڈاک سنسر ہونے لگی۔ میری ہر حرکت، ہر بات پر نظر رکھی جانے لگی۔ امی نے ننوں کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ مجھے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔

انیس اپنی والدہ کو بار بار امی کے پاس بھیجتا رہا۔ انھیں ہر بار ایک سا جواب ملا۔ وہ پھر بھی باز نہ آئے۔

جاڑوں کی تعطیلات میں ہم ملک سے باہر گئے۔ ویانا اور روم کی سیر کی۔ مجھے اولیول کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اب امی نے مجھ سے اس طرح پیش آنا شروع کر دیا جیسے میں کوئی بالغ فرد ہوں۔ میرے ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں بن بیاہی عمر رسیدہ عورت بن چکی ہوں۔ آخر سترہ سال کی جو ہو چکی تھی۔ ادھر انیس تھا کہ ٹلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اس کی والدہ نے خوش خلقی کا ثبوت دیتے ہوئے امی کی بدتمیزی اور روکھے پن پر ناگواری ظاہر نہ کی۔ انیس ہمارے ہاں آنے لگا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اسے گھنٹوں انتظار کرایا جاتا۔ جب امی شاہانہ نوازش سے کام لے کر اس سے مل بھی لیتیں تو بھی انتہائی تکبر سے پیش آتیں۔

ان کی نظر میں انیس کوئی زیادہ اچھا رشتہ نہ تھا۔ وہ نہ تو دولت مند تھا نہ اس نے "صحیح" درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن میری رائے میں ان تمام باتوں کی مطلق اہمیت نہ تھی۔ انیس نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اس کی مدد سے مجھے فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں، وہ مجھے ایک کاز بھی فراہم کر رہا تھا۔ میں جلد ہی بغاوت کا علم بلند کرنے والی تھی۔ میں آزاد ہونا چاہتی تھی۔

اگر میرے مستقبل کی خاطر کوئی منصوبہ بندی کی گئی ہوتی تو شاید میں شادی کا خیال چھوڑ دیتی۔ لیکن اس قسم کی منصوبہ بندی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں نہ تو کبھی کسی طرح کا تبادلۂ خیال ہوا تھا، نہ کبھی کالج کا ذکر آیا تھا نہ یونیورسٹی کا۔ سرے سے کچھ بھی نہ تھا۔ صرف شادی کا نصاب میرے سامنے رکھا جا رہا تھا۔ یہاں بھی مجھے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ باقی خاندان سے میرا قافیہ نہ ملتا تھا۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھے بیاہ دینا ہی بہتر تھا۔ میرے ذہن پر انتشار کا غلبہ تھا۔

یقیناً میری زندگی کے کوئی معنی تو ہوں گے۔ آزادی فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھی۔ آزادی کا رشتہ شادی سے جوڑ دیا گیا تھا۔ گھر ہماری تربیت گاہ تھا جہاں ہمیں سکھایا جاتا تھا کہ شادی کے بعد اپنی آزادی سے کیا کام لینا ہے۔

انیس میرے لیے وہ دروازہ تھا جو آزادی کی طرف کھلتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے یونہی سے شناسا تھے۔ وہ اٹھائیس برس کا تھا۔ میں سترہ سال کی تھی۔ محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی تھے۔

میں نے امی سے کہہ دیا کہ میں انیس کے سوا کسی سے شادی نہ کروں گی۔ میں انھیں یہ نہ بتا سکی کہ میں انیس سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات ان کی سمجھ میں کبھی نہ آتی۔ میں نے انھیں بتایا کہ جتنے لوگ بھی مجھ سے شادی کرنے کے خواہاں ہیں ان سب میں انیس میرے لیے اچھے مستقبل کی بہترین ضمانت ہے۔ صرف وہی ایسا مرد ہے جس کے ساتھ میں زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ رفتہ رفتہ مجھے اس سے محبت ہو جائے گی اور اس کی مستقبل مزاجی نے میرا دل جیت لیا ہے۔ میں نے واضح کر دیا کہ میں ہرگز کسی اور سے شادی نہ کروں گی اور وہ مجھے کہیں اور شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ یہ محض خالی خولی دھمکی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ اگر کوشش کروں تو انیس کو بھلا سکتی ہوں لیکن میں اس تمام کشیدگی سے تنگ آ چکی تھی۔ امی کو تھوڑا سا ڈر لگا کہ کہیں کوئی سکینڈل نہ بن جائے۔ ان کے ذہن میں اچانک ناگفتہ بہ مناظر گردش کرنے لگے۔ آخرکار انھوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

امی کا رویہ یکایک بدل گیا۔ اب وہ ہونے والی دلہن کی ہنس مکھ ماں نظر آنے لگیں۔ وہ شادی کی رسومات میں مصروف ہو گئیں۔ دوستوں اور رشتے داروں کو مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھجوائی گئیں۔ امی نے اپنے نئے کردار کو مکمل خلوص کے ساتھ ادا کیا۔ یہ بھلا دیا کہ وہ اس رشتے کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔ ایس یو درانی کی صاحبزادی کی عروسی انتہائی دھوم دھام سے ہونی تھی۔ انھیں اس کی تیاری کرنی تھی۔ منگنی یادگار تقریب ثابت ہوئی۔ فریدہ خانم نے گانے سنائے اور آرائش کے ایک خصوصی ماہر کو لبنان سے بذریعہ طیارہ بلوایا گیا۔

ابھی چند سخت مقام آنے باقی تھے۔ امی کو پتہ چلا کہ جن دنوں وہ ملک سے باہر تھیں میں انیس کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ اس حقیقت کو کہ دو خالائیں اور دو کزن بھی ہمارے ساتھ تھے بڑی بے دردی سے نظرانداز کر دیا گیا۔ میں نے نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا۔ انیس نے ان کے احکام ٹھکرانے کی جرأت کی تھی۔ ان کے قہر کا نشانہ مجھ سے زیادہ انیس بنا۔ اسے درانی گھرانے کے قاعدے قانون سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔

ہمارے گھر میں امی کا کہا تقدس کا حامل تھا۔ ان کے کہے پر کان نہ دھرنے، ان کی مرضی کے خلاف چلنے کی ہر کوشش کو کچل دیا جائے گا۔

امی نے منگنی توڑ دی۔ ہماری یہ حالت ہوئی جیسے نسیان کے کسی عالم میں گم سم جیسے جا رہے ہوں۔ امی نے جو ثابت کرنا تھا، کر دیا۔ انیس نے بہت سے ایلچی بھیجے۔ آخر کار امی کا مزاج، جو ساتویں آسمان پر جا پہنچا تھا، اعتدال پر آ گیا اور انہوں نے میری شادی کی راہ میں سے یہ رکاوٹ دور کر دی۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ سب رکاوٹیں دور ہو چکیں۔ والد صاحب سٹیٹ بینک کے گورنر تھے۔ مشرقی پاکستان میں بحران سر اٹھا رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے والد صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ مشرقی پاکستان سے بینک کے اثاثے خفیہ طور پر نکال لیے جائیں۔ والد صاحب نے انکار کر دیا۔ اس بات کو بھٹو صاحب نے نہ تو کبھی بھلایا نہ معاف کیا۔

جنرلوں سے والد صاحب کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ان سے مل کر جب وہ گھر آتے تو مشرقی پاکستان کے واقعات کو ہمارے سامنے امید افزا رنگ میں پیش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جنگ جیت لیں گے۔ ہمیں اس المیے کی کوئی خبر نہ تھی جو سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ہماری بے خبری اتنی مکمل تھی کہ جس روز ہتھیار ڈالے گئے اسی دن سٹیٹ بینک ہاؤس کے لان میں امی نے سرکاری طور پر بنائی جانے والی سیمنٹ کی خندق کا افتتاح کیا۔ کیچڑ گارے سے لت پت خندق میں جا کر چھپنا ان کی برداشت سے باہر تھا۔

بھٹو نے بطور صدر اقتدار سنبھالنے کے بعد جو چند ابتدائی قدم اٹھائے ان میں سے ایک کا تعلق والد صاحب کی برطرفی سے تھا۔ انہیں گھر میں نظربند کر دیا گیا۔ ہم نے ٹی وی پر بھٹو کو بطور صدر پہلی بار تقریر کرتے سنا۔ یہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ یہ تھا وہ آدمی جس کے لیے ہم دعائیں مانگتے رہے تھے۔ یہی وہ آدمی تھا جو صاحبِ عصر کہلانے کا مستحق تھا۔ یہی وہ آدمی تھا جو ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھا کر جوڑ سکتا تھا۔ اور وہ ہمارے خاندان کے خلاف تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ردعمل ظاہر کریں۔ میرے خاندان کو شرمندگی اور اضطراب نے گھیر لیا۔

والد صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ہم نے بوریا بستر باندھ کر لاہور کی راہ لی۔ مجھے اپنے منگیتر سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ والد صاحب کو ایک گندی کوٹھری میں رکھا گیا جہاں تل چٹے اور دوسرے حشرات رینگتے رہتے تھے۔ امی چٹان بن کر ان کا ساتھ نباہتی رہیں۔ دونوں کو زندگی میں پہلی بار نیچا دیکھنا پڑا تھا۔ امی نے دیکھا کہ بھلے وقتوں میں دوست، جو مطلبی بندے تھے، ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ بعض دوسروں نے، مثلاً آغا حسن عابدی نے آزمائش کی اس گھڑی میں امی کا ساتھ دیا۔ بہت عرصے

بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ والد صاحب کی طرح کسی شہری کے جیل جانے کو شرمناک واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ اہل خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ سیاستدان جیل یاترا کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا، جو میری زندگی میں سب سے اہم ہیں جیل سے واسطہ پڑا۔ ایک خراب وخستہ ہو کر، کانوں کو ہاتھ لگاتا باہر آیا۔ دوسرا ہیرو بن کر جیل سے نکلا۔

چھ مہینے کی سخت ابتلا کے بعد میرے والدین کو دوبارہ یکجا ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے طے کیا کہ امریکہ چلے جائیں گے۔ اب انیس سے میری شادی کی سادہ اور خاموش تقریب ہونی باقی تھی۔ تاریخ طے پا گئی۔

والد صاحب صوبۂ سرحد جا کر اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ لاہور میں تھے۔ گورنر مصطفےٰ کھر نے انہیں پنجاب کی سرحد پار کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ والد صاحب کو اپنے پرانے دوست، ولی خاں، سے ملنے کا موقع نہ ملے۔ بھٹو صاحب ذرا سا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ اس موقع پر مصطفےٰ کھر نے جو کردار ادا کیا اسے والد صاحب کبھی نہ بھلا سکے۔ انہوں نے والد صاحب کو اپنے گھر والوں کو الوداع کہنے سے روک دیا تھا۔

شادی سے تین دن پہلے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ مجھے نہ تو انیس سے محبت ہے اور نہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں غلطی کر رہی ہوں لیکن اب غالباً اتنی دیر ہو چکی تھی کہ بچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ نانی نے میرے کمرے کے باہر منجی بچھا دی کہ رات بھر جاگ کر چوکسی کریں اور میرا خیال رکھیں۔ نانی چاہتی تھیں کہ میں کچھ کھا پی لوں۔ مجھے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ اس رد کا کوئی خیال جس نے یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ عورت کا دل جیتنا ہے تو پہلے اس کے کام و دہن کو راضی کرو۔

میں نے انیس سے بات کی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے غالباً اس سے محبت نہیں ہے، صرف محبت کے تصور سے محبت ہے۔ میں فرار ہونا چاہتی تھی۔ انیس پر جیسے بجلی گر گئی۔ اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ میں اپنا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم صرف نروس ہو رہی ہو۔" اگلے دن ہماری مہندی تھی۔

والد صاحب میرے پاس آئے۔ میں ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ انہوں نے میری بات کا غلط مطلب لیا۔ بیٹیاں

اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرتی آئی ہیں۔ انہیں میکا چھوڑ کر اجنبی ماحول میں جانا پڑتا ہے۔ شادیاں شام کے جھٹپٹے کے مانند ہوتی ہیں۔ دکھ اور سکھ کا سنگم ہوتی ہیں۔ والد صاحب بار بار کہتے رہے کہ ان کا ساتھ چھوٹنے کا جو دکھ مجھے ہے وہ اسے سمجھ سکتے ہیں لیکن میرے سامنے میرا مستقبل ہے۔ جب میں کہتی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تو کسی کو میری بات پر یقین نہ آتا۔ سب نے کہا کہ میں آخری لمحات کے اضطراب کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہوں۔

میں ناشاد دلہن تھی۔ حیران پریشان بیٹھی رہی۔ انیس اب اپنے خسر کی مہربانی سے نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کام کر رہا تھا۔ اب اس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔ وہ میرا شوہر بن گیا۔

جب میں شوخ رنگوں سے سجی کار میں بیٹھ کر گھر سے رخصت ہونے لگی تو عدیلہ نے پھر بیچ میں آ کر آفت برپا کر دی۔ اس نے میرا غرارہ دبوچ لیا اور چیخنے اور رونے لگی۔ وہ آٹھ سال کی تھی۔ وہ میرا غرارہ چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ جو کچھ بن پڑا، ہم نے سہہ کر کے دیکھ لیا۔ آخر ہم اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔ عدیلہ اور میری شادیوں کو گتھم گتھا جو ہونا تھا۔

انیس میرا وہ دروازہ تھا جو آزادی کی طرف کھلتا تھا۔ میرے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ میں انیس میں سے گزر کر پتہ چلاؤں کہ مجھے کس کی تلاش ہے۔

باب - ۶

مینڈا سائیں

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اس کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

انیس سے میری شادی جلد ہی یکسانیت کی نذر ہو گئی۔ نہ کوئی نشیب باقی رہا نہ فراز۔ سپاٹ سا رشتہ تھا ہمارا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ کسی چیز کی کمی ہے لیکن یہ بالکل پتہ نہ تھا کہ یہ کمی آخر ہے کیا۔ شاید اس کا تعلق میرے دل سے ہو جس نے زور زور سے دھڑکنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے کسی ایک کے پلے بندھ جانا ایسا ہی تھا جیسے آدمی یک رنگی کا پابند ہو کر رہ جائے۔ جس آزادی کے لیے میں کلپتی رہتی تھی وہ تو اب بہ افراط میسر تھی مگر مجھے یہ علم ہی نہ تھا کہ اس سے کیا کام لیا جانا چاہیے یا کیا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں بڑی تیزی سے سب کچھ سیکھنے والی تھی۔

اس ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل پیدا کرنے کا فریضہ میرے ایک ماموں نے انجام دیا۔ ہسپانیہ کے قومی دن کا جشن منانے کے لیے پنجاب کلب میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ماموں نے مجھے اور انیس کو استقبالیے میں شرکت کی دعوت دی۔ ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچے جہاں چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ وہ ان عام آدمیوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے جو بادہ و ساغر کو گردش میں رکھنے کے لیے کاک ٹیل کے جام اٹھائے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ وہاں میرا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ خود مجھے بھی کوئی نہ پہچانتا تھا اور یہ امر میرے لیے اور زیادہ بدمزگی کا باعث تھا۔ میں نے ہلکے سبز شفون کی ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی۔ میں بہت دبلی پتلی تھی اور گھر

پر جب قدآدم آئنے نے میرے حسن کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر دکھایا تھا تو میں بچ بچ شرما گئی تھی۔ میرے لمبے لمبے بال آبشار کی صورت میری کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس موقع کے لیے میں نے بالوں کو سمیٹ کر گوندھا تھا اور میری چٹیا گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ گلے میں ہیروں کی مالا تھی جو میرے الماسی بندوں سے لگا رکھی تھی۔ میں خوب بن سنور کر گھر سے چلی تھی۔ اپنی خواہشیں پوری کرنے کا شوق ابھی معصوم سا دل بہلا تھا۔ میرا شعور گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے اس طرح ادھر اُدھر نظر دوڑائی جیسے میری جان پر بنی ہوئی ہو۔ میں چاہتی تھی کہ کہیں تک جانا نصیب ہو جائے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کلب میں غلطی سے آ نکلی ہوں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہمیں یہاں آنے کا نااہل قرار دے دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے ایک خالی جگہ مل گئی۔ میں بساط بھر متانت بروئے کار لا کر وہاں جا بیٹھی۔ میں نے اس خاتون سے جو میرے ساتھ بیٹھی تھی جعلی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ سے بات چیت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ جلد ہی اس نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام ڈاکٹر شاہدہ امجد ہے اور وہ اس کھیل میں خوب طاق ہے کہ کون کیا ہے اور کس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ میں لاہور میں نووارد ہوں اور خود کو کھوئی کھوئی محسوس کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر شاہدہ بہت شائستہ تھی۔ کسی کی طرف انگلی سے اشارہ نہ کرتی۔ جب کسی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہوتا تو آنکھوں اور ابروؤں سے کام لیتی۔ اس کے بعد وہ مختصراً مختلف مہمانوں کا کچا چٹھا بیان کرتی۔ میں سنتی رہی۔ میری آنکھیں گردش کرتی رہیں۔

ہال میں ایک قدآور، سانولا اور چھریرا مرد جس نے کالا سوٹ پہن رکھا تھا، بہت نمایاں تھا۔ میں نے اس کی کلف لگی اجلی قمیض پر نظر ڈالی جس کی سفیدی کو گہرے اُودے رنگ کی ٹائی اور اسی رنگ کے رومال سے ابھارا گیا تھا۔ بظاہر عیاش طبع آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کچھ کچھ شیطنت ٹپکتی تھی لیکن اس طرح کی شیطنت جو ذرا بھلی لگتی ہے۔ میں نے اس کے اردگرد جمع لوگوں کے چہروں کی کیفیتوں پر نظر ڈالی۔ وہ سب خواتین تھیں۔ میں یہ نہ سن پائی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ ان کی گفتگو مستطیق سوسائٹی کے ہلکے ہلکے شور، برف کی چوکوریوں کی کھنک اور بہت شستہ قہقہوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی مخبر سے پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ "وہ؟ تمہارا مطلب ہے تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ کہ وہ کون ہے؟" خاموشی۔ مجھے واقعی پتہ نہ تھا۔ "یہ مصطفےٰ کھر ہے۔"

"اوہ۔"

اس کے سگار کے سرے پر جمع راکھ جھڑ کر قیمتی قالین پر گرنے ہی کو تھی۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگی کہ کیا سگار کی راکھ گرنے سے قالین کا کچھ بگڑتا نہیں۔ میں نے دوبارہ نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ باقی سب بدستور ہمہ تن گوش تھے۔ کھر بولتے بولتے رکا اور بہت آہستگی اور بڑے بانکپن سے سکاچ کے گلاس کو ہونٹوں تک لے گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ اس قسم کا مجلسی مے خوار ہے جو کبھی اپنے لب تر نہیں ہونے دیتا۔ میری نظر اس کی آنکھوں پر گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ دہک رہی ہوں۔ وہ ایسے کوبرے سے مشابہ تھا جو ڈسنے ہی والا ہو۔ اسے اپنے اردگرد جمع تمیزدار ٹولی کو مسحور کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ عین اسی لمحے ایک بہت ہی دلکش نوجوان خاتون، نارنجی شفون کی ساڑھی میں لپٹی، خراماں خراماں ہمارے آگے سے گزری۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے شاہدہ سے پوچھا یہ کون ہے۔ اس کا نازوانداز کہے دیتا تھا کہ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ "یہ شہرزاد ہے۔ شیری۔ کھر کی بیوی۔" "اوہ۔"

مصطفےٰ کے بارے میں مجھے اور بہت سی باتیں پتہ چلیں۔ ہیروڈ جیسے ماحول میں سوقیانہ گپ شپ۔ وہ پنجاب کا گورنر اور وزیراعلیٰ رہ چکا تھا۔ اس نے حال میں استعفیٰ دے کر بھٹو صاحب سے، جو اب تک اس کے پیرومرشد تھے، ٹکر لی تھی۔ کوئی بہت جرأت مند آدمی ہی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ بھٹو صاحب فکرمند تھے۔ مصطفےٰ کھر "شیرِ پنجاب" کہلاتا تھا۔ ادھر بھٹو صاحب کو ایسے شیر اچھے لگتے تھے جو پنجروں میں بند ہوں۔

ڈاکٹر شاہدہ نے جان لیا کہ میرے اعصاب کا تناؤ اب بڑی حد تک کم ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ میرا تجسس تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اب مجھے ان شخصیات سے براہ راست ملوانے کا وقت آ پہنچا تھا جن کی طرف اشارے کیے جا رہے تھے۔ "آئیں۔ میں آپ کو شیری سے ملواؤں۔ آپ کو وہ پسند آئے گی۔" ہم دھکا پیل کرتے ان لوگوں میں سے راستہ بناتے گزرے جو معاشرے کا "بالائی" حصہ کہلاتے ہیں۔ کیا ہی گھڑی کا رس اور تیار بالائی ہے، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ مجھے شیری سے متعارف کرایا گیا۔ ہم کھر صاحب کی باتیں کرنے لگے۔ شیری نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے شوہر سے ملنا پسند کروں گی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ مجھے کھر سے ملانے لے چلی۔ میں کچھ نیم دلانہ انداز میں ساتھ ہو لی۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ کھر کی شہرت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی بری شہرت ہمیشہ ہی اس سے دو قدم آگے رہتی ہے۔